مطالعہ افکارِ مغرب

دوسرا ایڈیشن

مغربی استعمار اور عالمِ اسلام

مابعد نو آبادیاتی مطالعہ

سعدیہ عمر شیخ

کتاب محل

دوسرا ایڈیشن

مغربی استعمار اور عالمِ اسلام

مابعد نو آبادیاتی مطالعہ

سعدیہ عمر شیخ

کتاب محل

نام کتاب : مغربی استعمار اور عالم اسلام

تصنیف : سعدیہ عمر شیخ

سن طباعت : ۲۰۱۸ء

قیمت : 700

0300-4827500, 0321-8836932
0348-4078844, 0311-7004893
دربار مارکیٹ لاہور

انتساب

تاریخِ اسلام کے اُن تمام جانبازوں کے نام جو استعمار کے ہر دور میں اور سامراجیت کی ہر قسم کے خلاف باطل قوتوں کی راہ میں چٹان بن کر کھڑے ہوئے، اُمت کے دفاع اور آزادی کی خاطر جان و مال کی قربانیاں دیں، قید و بند کی صعوبتیں اٹھائیں، نامساعد حالات کو کبھی خاطر میں نہ لائے، کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرے اور ''زمینی حقائق'' کا رونا رونے والے مصلحت پسندوں کے خلاف حجت قائم کر گئے۔

فہرست

باب اوّل:

﴿استعمار: تعریف اور تاریخ کے آئینے میں﴾

باب دوم:

﴿نو استعماری نظام: تعریف اور اہداف﴾

باب سوم:

﴿عالم اسلام کے خلاف نو استعماری حربے﴾

اظہارِ تشکر

تمام تعریفیں اللہ رب العزت کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے اور درود وسلام ہوں رحمۃ للعالمین اور نبی اُمی صلی اللہ علیہ وسلم پر جن کی لائی ہوئی ہدایت سے ہی تمام دینی ودنیاوی علوم کے چشمے پھوٹتے ہیں۔

خالقِ کائنات کے مجھ پر اَن گنت احسانات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اُس نے اس مقالے کی تیاری کے ہر ہر مرحلے پر میری مدد فرمائی اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانا اُس ذاتِ باری تعالیٰ کی عطا کردہ آسانیوں اور توفیق کی بدولت ہی ممکن ہوا ہے۔

میں اپنے تمام اساتذہ خصوصاً جناب ڈاکٹر ممتاز سالک کی بے انتہا شکر گزار ہوں جن کی ہدایات، تعاون اور شفقت کے بغیر اس تحقیقی کاوش کو انجام تک پہنچانا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔

میں مجلہ ''ایقاظ'' کے مدیر جناب حامد کمال الدین صاحب کا ذکر کرنا بھی ضروری سمجھتی ہوں جن کی تحریروں نے اس موضوع سے متعلق میری بہت سی ذہنی الجھنوں اور اشکال کو دور کیا۔ میں ناظم ''کتاب محل'' کے جناب محمد فہد صاحب کی بھی تہہ دل سے ممنون ہوں جن کی ذاتی دلچسپی اور حوصلہ افزائی کی بدولت میری یہ کاوش کتابی شکل میں سامنے آئی۔

میں دعا کرتی ہوں کہ خدائے بزرگ و برتر ان تمام لوگوں کے علم وعمل میں برکت عطا فرمائے جنھوں نے اس تحقیقی کام کے دوران کسی بھی درجے میں میری معاونت فرمائی اور انہیں اجرِ خیر اور اجرِ کثیر سے نوازے۔

(آمین)

مقدمہ و تعارف

''دین اسلام'' آج سے چودہ صدیاں قبل وادیٔ غیر ذی ذرع میں برپا ہونے والے ایک ایسے عظیم الشان انقلاب کا عنوان ہے جس کی مثال پیش کرنے سے تاریخ قاصر ہے۔ اس انقلاب نے صرف جزیرۃ العرب ہی نہیں بلکہ پورے کرۂ ارض کا منظر نامہ بدل کر رکھ دیا۔ مشیتِ الٰہی کے تحت امیّون میں سے ایک ایسی قوم اٹھائی گئی جس نے دنیا کی تاریخ اور جغرافیہ ہی نہیں بلکہ تقدیر بھی بدل ڈالی۔ اس قافلے نے دیکھتے ہی دیکھتے عروج کی بے شمار منازل طے کیں، جہانبانی کے نئے اصول قائم کیے، ایک پاکیزہ اور روشن تہذیب کی صورت گری کی اور کئی صدیاں اس وقت کی معلوم دنیا کے ایک بڑے حصے پر پوری شان و شوکت اور دبدبے کے ساتھ حکومت کی۔ لیکن کارخانہ قدرت میں کسی شے کو بھی ثبات نہیں۔

قرونِ وسطیٰ میں تاریخ کی ایک اور کروٹ کے ساتھ ہی دنیا کا منظر نامہ پھر تبدیل ہوا۔ یہ برِ اعظم یورپ کے سرد اور تاریک خطے سے اٹھنے والی سفید فام عیسائی اقوام کے عروج کا دور تھا۔ ان اقوام نے دیکھتے ہی دیکھتے تقریباً تمام اسلامی خطوں کو اپنی غلامی کی زنجیروں میں یوں جکڑا کہ امت کے عروج و اقبال کی داستانیں خواب محسوس ہونے لگیں۔ مسلمانوں کے جان، مال، عزت، آبرو، وسائل یہاں تک کہ ان کی تہذیب اور تمدن تک پر ان یورپی آقاؤں کا غلبہ اور تسلط قائم ہوگیا۔ یہ ''استعمار'' کا دور تھا۔ یہ ملتِ بیضاء کی ذلت، محکومی اور غلامی کا دور تھا اور بیسویں صدی میں بظاہر استعماری دور ختم ہونے اور مسلمان خطوں کو آزادی نصیب ہو جانے کے بعد بھی یہ ذلت، محکومی، غلامی اور پستی کسی نہ کسی شکل میں آج بھی قائم ہے۔ لیکن حالات کا یوں پلٹا کھا جانا اور طاقت کا توازن مسلمانوں کی بجائے یورپی اقوام کے حق میں ہو جانا کوئی محض گردشِ دوراں کا نتیجہ یا اتفاقی حادثہ نہ تھا۔ یہ شامتِ اعمال ہمارے اپنے ہی ہاتھوں کی کمائی تھی۔

میرا زیرِ نظر مقالہ مسلمانوں پر استعماری یلغار کی وجوہات، واقعات اور نتائج سے بحث کرتا ہے۔ اس میں میں نے یورپی استعماری دور کو دو عنوانات کے تحت تقسیم کیا ہے۔ ایک تو استعمار کا وہ دور تھا جب مسلمان خطے براہِ راست یورپی اقوام کے قبضے میں تھے۔ دوسرا مابعد نو آبادیاتی (Post-Colonial age) دور ہے۔ یہ حالیہ دور ہے جس میں بظاہر پچاس سے زائد آزاد اور خود مختار ریاستوں اور بے انتہا قدرتی وسائل کے مالک ہونے کے باوجود بھی مسلمان کسی نہ کسی صورت میں مغرب کے غلام ہیں۔

میری اس تحقیق کا مقصد یہی ہے کہ مسلمانوں کی ان کمزوریوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی کی جائے جن کی وجہ سے ایک شاندار اور پرشکوہ ماضی کی حامل یہ عظیم اُمت عصرِ حاضر میں ذلتوں اور پستیوں کا شکار ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ مغرب کے اُن حربوں اور ہتھکنڈوں کا جائزہ لیا جائے جن کے ذریعے انہوں نے اس مابعد نو آبادیاتی دور (Post-Colonial age) میں بھی مسلمان خطوں کو تا؛ یدہ زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔ عصرِ حاضر کے ان ہی استعماری حربوں کو Neo-Colonialism یا نو استعماریت کا نام دیا جاتا ہے اور یہ نو استعماری دور کہلاتا ہے۔

اس مقالے میں میں نے اپنی بساط کے مطابق ان تمام عوامل کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے جو اس نو استعماری دور (Neo-Colonial age) میں عالمِ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کارفرما ہیں۔ میں تسلیم کرتی ہوں کہ میں نے اس موضوع کا حق مکمل طور پر ادا نہیں کیا۔ اس کی وسعت اور اہمیت کا تقاضا تھا کہ اس سے کہیں زیادہ محنت اور تحقیق کے ساتھ اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا جاتا۔ بہر حال محدود مدت اور ناقص علم کے ذریعے میں نے حتی المقدور کوشش اور محنت کی ہے۔ اگر اس میں مجھے کوئی کامیابی حاصل ہوئی ہے تو وہ اللہ رب العزت کے فضل سے ہے اور اگر کوئی فروگذاشت، کوئی کمی، کوئی غلطی رہ گئی ہو تو وہ سراسر میری کم علمی کی وجہ سے ہے۔

باب اوّل:

استعمار: تعریف اور تاریخ کے آئینے میں

فصل اوّل:

استعمار کی تعریف اور مختصر تاریخ

کرۂ ارض پر انسانی زندگی کی تاریخ کتنی پرانی ہے اس کا کوئی حتمی جواب دینا شائید ممکن نہ ہو مگر یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ تمدنِ انسانی کے ارتقا کی داستان خیر و شر، ظالم و مظلوم اور شکاری و شکار کی باہمی کشاکش سے عبارت ہے۔ جنگ و جدل، ہوس اور ملک گیری تاریخ انسانی کے ہر دور کی کہانی ہے۔ قدیم زمانے کے طاقتور حکمران اپنی طاقت کے نشے میں چور ہو کر کمزور اقوام پر لشکر کشی کرتے تھے اور اپنے مفتوحہ علاقوں کے عوام کے جان، مال، عزت، آبرو اور وسائل پر اپنا قبضہ جماتے تھے تو اپنے اس فعل کیلئے انہیں کوئی توجیہہ یا جواز پیش کرنے کی ضرورت کبھی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ کیونکہ یہی زمانے کا چلن تھا۔ یہ بادشاہت اور ملوکیت کا دور تھا جب ''فاتح'' اپنے کسی بھی غیر انسانی عمل کے لیے کسی کے سامنے جوابدہ نہیں سمجھا جاتا تھا۔ سکندرِ اعظم نے دنیا فتح کی تو بڑے اعتماد کے ساتھ خود کو دیوتا کا درجہ دے دیا۔ چنگیز خان اور ہلاکو خان نے خون کی ندیاں بہائیں تو مقتولین کی کھوپڑیوں کے مینار تعمیر کیے تاکہ تاریخ میں ان کی بربریت کی ''سند'' رہے۔ پھر تاریخ کی ایک کروٹ کے ساتھ جب یورپ کی نشاۃِ ثانیہ شروع ہوئی تو اسے ''علم''، ''شعور'' اور ''تہذیب'' کا دور کہا گیا۔ اس دور میں فاتحین کی فطرت تو نہ بدلی مگر ملک گیری کے انداز ضرور بدل گئے۔ اس دور میں فاتحین کا طریقۂ کار یہ رہا کہ اپنے ظلم، بربریت، لوٹ کھسوٹ اور ناجائز تسلط کی توجیہہ ضرور پیش کر دی گئی۔ اپنے ہر ظالمانہ عمل اور فعل کی ''ضرورت'' سے دنیا کو آگاہ ضرور کر دیا گیا۔ کمزور، نہتے اور پرامن انسانوں پر قبضے اور

ملک گیری کا جو انداز "renaissance" کی طاقتوں نے اختیار کیا اُسے آج کے عمرانی وسیاسی ماہرین اور مؤرخین "استعمار" کا عنوان دیتے ہیں۔

"استعمار" عربی زبان کا لفظ ہے جس کا مادہ "ع۔م۔ر" ہے۔ عَمَرَ، عَمْراً سے مراد ہے۔"آباد ہونا۔"① اسی سے باب "استفعال" کے وزن پر "استعمار" ہے جس کے لغوی معنی ہیں: "کسی جگہ پر آباد ہونے کی خواہش کرنا یا کوشش کرنا"۔ مثال کے طور پر اگر کہا جائے "استعمَرَة فی المکان" تو اس کے لغوی معنی ہوں گے: "آباد کرنا" اور اگر کہا جائے "استعمَرَاللہ عبادۃ فی الارض" تو اس کا ترجمہ ہوگا "اللہ نے اپنے بندوں کو زمین میں آباد کرنا چاہا"۔②

اردو لغت (تاریخی اصول پر) میں "استعمار" کے معنی یوں بیان کیے گئے ہیں:

"کسی کو کسی مقام میں بسانا، ہجرت کر کے کسی جگہ جانا اور اسے وطن بنانا (مراداً) دوسرے ملک کو نو آبادی بنا کر اس سے تمتع حاصل کرنا"۔③

اصطلاح میں لفظ "استعمار" کا اطلاق ایک ایسے عمل پر ہوتا ہے جس کے ذریعے ایک طاقتور قوم کسی کمزور قوم پر غلبہ پا کر اس کے وسائل پر تصرف کو اپنا حق سمجھتی ہے۔

"استعمار" کے لئے انگریزی لفظ "Colonialism" مستعمل ہے۔ اس کی تعریف یوں کی گئی ہے۔

"The practice by which a powerful country controls other country or other countries".④

---

① ابوالفضل، مولانا عبدالحفیظ بلیاتوی، "مصباح اللغات"؛ مکتبہ قدوسیہ لاہور؛ جولائی 1999؛ ص:551

② ایضاً

③ "اردو لغت (تاریخی اصول پر)"؛ ترقی اردو بورڈ کراچی؛1977؛ ج:1؛ ص:454

④ "Oxford Dictionary"; Oxford University Press, Oxford; 7th edition, 2005; Pg:293

(ایسا عمل جس کے ذریعے ایک طاقتور ملک دوسرے ملک یا ممالک کو قبضے میں لے لیتا ہے۔)

استعماری عمل میں ایک طاقتور قوم کسی کمزور قوم پر سیاسی بالادستی حاصل کر کے اسے کمتر درجے کے انسان باور کرتی ہے۔ انسائیکلو پیڈیا آف سوشیالوجی کے مطابق:

"It (colonialism) also signified political control by one 'race' over another 'race' where the later is deemed inferior to the former."[1]

(استعماریت ایک نسل/قوم کا کسی دوسری نسل/قوم پر ایک ایسے قبضے کا نام ہے جس میں مؤخر الذکر قوم کو حقیر تصور کیا جاتا ہے۔)

گویا "استعمار" ایک طاقتور غیر ملکی قوم کا کسی مقامی قوم کے ساتھ قائم ہونے والے ایک ایسے سیاسی تعلق کا نام ہے جو کسی سطح پر بھی "برابری" کی بنیاد پر قائم نہیں ہوتا۔ استعمار کے شکنجے میں پھنس جانے والی قوم کے قدرتی وسائل، داخلی، خارجی، عسکری اور سیاسی معاملات یہاں تک کہ تہذیبی اور ثقافتی ورثہ بھی استعماری طاقت کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔

Ania Loomba استعمار کی تعریف یوں کرتی ہیں:

"the takeover of territory,appropriation of meterial resources, exploitation of labour and interference with political and cultural structures of another territory or nation."[2]

(کسی دوسری قوم کے خطوں کو ہتھیا لینا اُن کے وسائل پر تصرف کرنا، ان کی محنت کا

[1] "The Concise Encyclopedia of Sociology";Wiley-Blackwell, West Sussex,UK;2001:pg;71

[2] Ania Loomba; "Colonialism/Post Colonialism;" Routledge, London and New York; 2nd edition, 2005; Pg:11

استحصال کرنا، ان کے سیاسی اور ثقافتی ڈھانچے میں دخل اندازی کرنا....)

یہی مصنفہ ایک اور جگہ "استعمار" کی سادہ اور مختصر تعریف کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"So colonialism can be defined as the conquest and control of other people's land and goods".①

(استعماریت سے مراد ہے لوگوں کی زمین اور اموال کو فتح کرنا اور اس پر کنٹرول کرنا۔)

استعماری طاقت کا شکار ہونے والے خطوں کے لئے انگریزی میں "Colonies" (واحد:colony) جبکہ اردو میں "نوآبادیات" (واحد: نوآبادی) کی اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں۔②

اسی لیے "استعمار" کیلئے "نوآبادیاتی نظام" کی اصطلاح بھی استعمال کی جاتی ہے۔

استعمار (Colonialism) اور سامراجیت (Imperialism) میں فرق:

استعمار (colonialism) کو بسا اوقات سامراجیت (Imperialism) کے مترادف سمجھا جاتا ہے لیکن یہ دونوں ہم معنی اصطلاحات نہیں ہیں۔ ایک سلطنت کو قائم کرنا اور طاقت کے ذریعے اردگرد کے علاقے فتح کر کے انہیں اپنی سلطنت کا حصہ بنالینا امپریل ازم ہے جبکہ استعمار کی اصطلاح اس عمل پر منطبق ہوتی ہے جس میں ایک طاقتور قوم کسی کمزور قوم کی سیاست اور معیشت پر قابض ہو کر ان کے وسائل سے استفادہ کرتی ہے۔

تھامس میگنڈ کی کتاب "Understanding Politics" کے مطابق:

"Imperialism (is) a policy of territorial expansion (empire building) often by means of military

①Ania Loomba; "Colonialism/Post Colonialism;"Pg:8

② "اردو انسائیکلو پیڈیا"؛ فیروز سنز لاہور؛ تیسرا ایڈیشن جنوری 1984؛ ص:1002

conquests derived from the word empire. (while) colonialism is the policy of seeking to dominate the economic or political affairs of underdeveloped areas or weaker countries."(1)

(امپریل ازم 'ایمپائر' سے نکلا ہے جس سے مراد ہے فوجی فتوحات کے ذریعے اپنی سلطنت کی حدود کو وسیع کرنا۔ جبکہ استعماریت ایک ایسی پالیسی ہے جس کے ذریعے کسی غیر ترقی یافتہ علاقے یا کمزور ملک کے معاشی اور سیاسی معاملات کو اپنے ہاتھ میں لے لیا جاتا ہے۔)

امپریل ازم ایک نسبتاً وسیع اصطلاح ہے جبکہ استعماریت امپریل ازم کی ایک قسم ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ ہر طرح کا استعماری عمل در پردہ امپریل ازم کے مقاصد کی ہی تکمیل کرتا ہے اور سامراجیت کی شاخوں میں سے ایک شاخ ہے۔

"Imperialisn is the highest stage of colonialism".(2)

(امپریل ازم استعماریت کی بلند ترین سطح ہے۔)

Imperialism کی تاریخ بہت قدیم ہے جبکہ استعماریت کا باقاعدہ اور منظم آغاز پندرھویں صدی سے تصور کیا جاتا ہے۔ امپریل ازم کی تاریخ پر نظر دوڑائی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ عمومی طور پر یہ ایک عسکری اور فوجی کاروائی ہے جس کے ذریعے اپنے ملک کی سرحدوں سے متصل ممالک پر حملے کر کے انہیں میدانِ جنگ میں شکست دینے کے بعد ان کو اپنی حدود میں شامل کر لیا جاتا تھا، جبکہ استعماری عمل کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ استعماری طاقتوں اور ان کا شکار بننے والی نوآبادیوں کے درمیان ہزاروں میل کا فاصلہ بھی ممکن ہے اور اس عمل کے لیے عسکری فتح بھی لازم نہیں بلکہ سیاسی جوڑ توڑ، ریشہ دوانیاں، دھونس دھاندلی،

---

(1) Magstadt Thomas M.;"Understanding Politics, Ideas, Institutions and Issues"; Wadsworth Cengage Learning, USA; pg:218

(2) Ania Loomba; "Colonialism / Post Colonialism"; pg:11

مقامی آبادی میں پھوٹ ڈلوانا، رشوت اور نفسیاتی حربے بھی ہمیشہ استعماری طاقتوں کے اہم ہتھیار رہے ہیں۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ''امپریل ازم'' ایک نظریہ ہے جبکہ استعمار اس نظریئے کو عملی جامہ پہنانے کا نام ہے۔

"colonialism is only one form of practice one modality of control which results from the ideology of imperialism."①

(استعماریت کسی غلبے کی محض ایک شکل ہے جسے درحقیقت امپریل ازم کے نظریئے نے ہی جنم دیا ہے۔)

قدیم اور جدید استعمار کی تاریخ:

عمومی طور پر استعمار کا نکتہ آغاز پندرھویں اور سولھویں صدی عیسوی سے تصور کیا جاتا ہے۔② جب یورپی جہاز ران نئے تجارتی راستوں اور نئی دنیاؤں کی دریافت کی غرض سے عازمِ سفر ہوئے اور مختلف یورپی اقوام نے چند صدیوں کے اندر اندر دنیا کے ایک بڑے خطے کو اپنی نو آبادیات بنا ڈالا۔ لیکن اگر ہم دنیا کی قدیم تاریخ پر نظر دوڑائیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ استعماری عمل کی داستان بہت پرانی ہے اور کسی نہ کسی شکل میں نو آبادیاتی نظام ہمیں دنیا کی معلوم تاریخ کے ہر دور میں نظر آتا ہے۔ Ania Loomba لکھتی ہیں:

"....it (colonialism) has been a recurrent and wide

---

①John Mcleod; "Beginning Post Colonialism"; Manchester University Press, Manchester and New York; 2nd edition,2012; pg: 9

②"Encyclopedia Britanica" The University of Chicago, U.S.A; 15th edition 1986; vol:3; pg:464

spread feature of human history."①

(نوآبادیاتی نظام انسانی تاریخ میں بار بار اور وسیع پیمانے پر روبہ عمل ہوتا رہا ہے۔)

اس کی اولین مثال ہمیں فونیشیا (Phoenicia) کی تاریخ میں ملتی ہے۔ یہ بحیرۂ روم کے ساحلی علاقوں میں پھیلی ہوئی ایک طاقتور مملکت تھی جس کا شمار دنیا کی اولین تہذیبوں میں ہوتا ہے۔ اس کے عروج کا دور گیارہویں صدی ق م سے آٹھویں صدی ق م کے دوران کا ہے ② اس نے تجارتی مقاصد کے لیے نوآبادیات قائم کیں ان کی تفصیل History of the World میں یوں بتائی گئی ہے:

"They (Phoenicians) set up many colonies, The most important being Carthage (now in Tunsia). Other colonies were Marseille (France), Cadiz (Spain) and Malta, Sicily and Cyprus".③

(فونیشیا کے لوگوں نے کئی نوآبادیاں قائم کیں ان میں سے سب سے اہم Carthage کی نوآبادی تھی جو اب تونس کا ایک علاقہ ہے اس کی دیگر کالونیوں میں Marseille (فرانس) Cacliz (سپین) مالٹا، سسلی اور سائپرس کے علاقے شامل ہیں۔)

دوسری بڑی تہذیب جس نے نوآبادیات قائم کیں وہ یونانی تہذیب تھی یہ قوم بحیرۂ روم کے چھوٹے چھوٹے جزیروں میں آباد تھی۔ پتھریلی چٹانوں پر مشتمل یہ جزیرے اور ان کے وسائل جب بڑھتی ہوئی آبادی کی ضروریات پوری کرنے میں ناکام رہے تو

---

① Ania Loomba; "Colonialism / Post Colonialism";pg:8

② "The Kingfisher Illustrated History of the World"; Kingfisher Books, London; 1972; pg:57

③ "The Kingfisher Illustrated History of the World"; Kingfisher Books, London; 1972; pg:57

یونانیوں نے بحیرۂ روم پار کر کے (آٹھویں صدی ق م سے پانچویں صدی ق م) آس پاس کے علاقوں میں اپنی نوآبادیاں قائم کیں۔[1]

انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا کے مطابق:

"Spurred by population growth on the Greek mainland, colonists established new cities from Asia minor and the Black sea to France,Spain and North Africa in the great colonizing movement."[2]

(یونان کی سرزمین پر آبادی زیادہ ہو جانے کی وجہ سے نوآبادیات بنانے کی ایک تحریک شروع ہوئی اور ایشیائے کوچک، فرانس، سپین اور شمالی افریقہ کے کئی خطوں کو نوآبادیات بنایا گیا۔)

اگر ہم ان نوآبادیات کے قیام کے محرکات کا جائزہ لیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ فونیشیا کی نوآبادیات زیادہ تر تجارتی مقاصد کے تحت قائم کی گئی تھیں۔[3] جبکہ یونانیوں نے اپنی بڑھتی ہوئی آبادیوں کے لیے نئے خطوں کی ضرورت محسوس کی تو سمندر پار کر کے اپنے لیے نئے شہر بسائے۔ یونانیوں کا ایک مقصد اپنی تہذیب کو دنیا میں پھیلانا بھی تھا اس عمل کو تاریخ میں (Hellenization) کا نام دیا جاتا ہے۔[4] یہ نوآبادیاں ابتدا میں تو اپنی مادرِ وطن (metropolis) سے اپنا سیاسی، تہذیبی اور مذہبی رشتہ قائم رکھتی تھیں۔ لیکن وقت کے

---

[1] "Encyclopedia Britanica"; vol:8; pg:330-331

[2] // // //; vol:20; pg:375

[3] "Comptons Encyclopedia"; F.E.Compton Company; U.S.A; 1983; vol:5; pg:442

[4] "Oxford Dictionary of World History" (3rd edition) Oxford University Press, Oxford; 2015; pg:288

ساتھ ساتھ یہ عسکری اور سیاسی طور پر خود مختار شہروں کا درجہ اختیار کر لیتی تھیں۔① لیکن باقاعدہ استعماری عمل کا آغاز یعنی طاقتور اقوام کا کمزور اقوام کے وسائل پر ہاتھ صاف کرنے کی تاریخ کا آغاز درحقیقت "سلطنتِ روما" کے عروج سے ہوتا ہے۔

مدیر "ایقاظ" حامد کمال الدین لکھتے ہیں:

"تاریخ سے باخبر لوگوں کے لیے 'روم' دنیا کی ایک ایسی قدیم داستان کا نام ہے جس کو دنیا اب جا کر 'استعمار' کے لفظ سے تعبیر کرنے لگی ہے۔ دوسری قوموں کو اپنے زیرِ نگین لا کر رکھنا اور ان کو ہرگز نہ اٹھنے دینا۔ ان کے وسائل، ان کی افواج، ان کے جوان گھبرو، انکے کھیت کھلیان، ان کے حکمران اور ان کے لیڈر سب کو اپنے یہاں گروی رکھنا، ان کو اپنے تاج و تخت کا وفادار خدمتگار رکھنا، بلکہ اس عمل کو ایک منظم ادارے کی صورت دے رکھنا.... یہ سب دنیا کے اندر 'روم' ہی کی متعارف کردہ سوغات ہے"۔②

"Discourse on Colonialism" کی مصنفہ لکھتی ہیں:

"The colonial enterprise is to the modern world what Roman imperialism was to the ancient world: the prelude to disaster and the fore runner of catastrophe.."③

(عصر حاضر کی دنیا میں 'استعمار' سے وہی مراد لی جاتی ہے جو قدیم دنیا میں روم کے سامراجی نظام سے لی جاتی تھی [یعنی] تباہی اور بربادی کا پیش خیمہ۔)

---

①"Comptons Encyclopedia"; vol:5; pg 442

② حامد کمال الدین، "روبہ زوال امریکن ایمپائر"؛ مطبوعاتِ ایقاظ؛ لاہور؛ اکتوبر ۲۰۱۱ء؛ ص:39

③Aima Cesaire ; "Discourse on Colonialism" ; (Translated by Joan Pinkham,); Monthly Review Press, New York; Pg:74. (originally published as " Discourse Surle Colonialisme", 1955)

روم یونانیوں کے بعد آنے والی ایک طاقتور یورپین تہذیب تھی۔ اس کا عروج تیسری صدی ق م میں اٹلی سے شروع ہوا اور کئی صدیوں پر محیط رہنے کے بعد آخر اسلام کی قوت سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا۔

ظہور اسلام کے وقت دنیا میں دو سلطنتیں ایسی تھیں جو گویا تمام قابل ذکر دنیا پر چھائی ہوئی تھیں۔ ایک روم کی سلطنت جس نے چوتھی صدی عیسوی میں عیسائیت قبول کر لی تھی اور دوسری ایران کی مجوسی سلطنت۔ یہ دونوں عرب کی ہمسایہ قوتیں تھیں جو کمزور کا استحصال کرنے اور ظلم واستبداد کی نئی نئی داستانیں رقم کرنے کے لیے ایک دوسرے کی مسابقت میں کوشاں رہتی تھیں۔ آس پاس کے علاقوں کو بزورِ شمشیر فتح کرنا اور پھر مفتوحہ علاقوں کے عوام کی جان، مال، عزت، آبرو اور وسائل پر ہر طرح کے تصرف کا اختیار سمجھتے ہوئے انہیں پامال کرنا۔۔۔ یہ بڑی طاقتوں اور فاتحین کا جائز اور قانونی حق سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اسلام کے عروج کے ساتھ ہی فاتحین اور مفتوحین کے تعلق کی صدیوں پرانی روایتی تاریخ بدل گئی۔ دنیا نے ''خلافت'' کے عنوان سے حکمرانی و جہانبانی کے نئے انداز دیکھے اور تاریخ میں ایسا پہلی بار ہوا کہ فتوحات کا مقصد بندوں کو فاتحین کا نہیں بلکہ خالقِ کائنات کا غلام بنانا ٹھہرا۔ پہلی صدی ہجری کے اندر اندر ہی دنیا کا ایک قابلِ ذکر حصہ استعماری واستحصالی نظام کی زنجیروں سے آزاد ہو کر نظامِ توحید کے گوشۂ عافیت میں آ گیا۔ اس کے بعد کئی صدیوں تک مسلمان عروج کی منازل طے کرتے رہے۔ دنیا پر ان کی مذہبی، تہذیبی سیاسی، علمی اور عسکری برتری قائم ہوئی تا آنکہ پندرھویں صدی عیسوی کے بعد عالم اسلام کے بہت سے خطوں میں ضعف کے آثار نمایاں ہونے شروع ہو گئے اور یہی وہ وقت تھا جب براعظم یورپ پوری دنیا کو استعماری شکنجے میں کسنے کے لیے پنجے تیز کرنے لگا۔

یورپ ایک چھوٹا سا براعظم ہے۔ آٹھویں صدی عیسوی سے گیارھویں صدی عیسوی کا وہ عرصہ جو مسلمانوں کے عروج کا دور تھا اور ساری دنیا میں مسلمانوں کی علمی و تہذیبی برتری اور عدل وانصاف کے ڈنکے بج رہے تھے یہ اسلامی تاریخ کا سنہری دور سمجھا جاتا ہے اور

یہی وہ زمانہ ہے جو یورپ کی تاریخ میں عہد ہائے تاریک (Dark Ages) کے عنوان سے جانا جاتا ہے۔ لیکن پندرھویں صدی میں یورپ اپنے قرونِ وسطیٰ کے تاریک دور سے نکل آیا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب مسلمانوں نے توحید، علم دوستی، محنت، اجتہاد اور جہاد سے اپنا تعلق توڑنا شروع کیا جبکہ مسلمانوں کے ہی زیرِ اثر یورپ میں علم کا چرچا ہوا اور ان کی نشاۃِ ثانیہ کا آغاز ہوا۔

نئی دنیاؤں کی تلاش:

یورپ ایک چھوٹا، زیادہ تر برف سے ڈھکا ہوا سرد اور تاریک برِ اعظم ہے جہاں سکونت دشوار ہے۔ یہ سرد اور تاریک براعظم بہت صدیاں پہلے وہاں بسنے والی اقوام کے لئے تنگ پڑ گیا تھا۔ طبعی بات تھی کہ یہ گوری اقوام اپنے مسکن کے لیے نئے خطوں کی تلاش میں نکل کھڑی ہوتیں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ یورپ سے نکل کر وہ کہاں جاتیں؟ ان کے پیچھے یعنی شمال میں قطب شمالی ہے جہاں حیات منجمد ہے۔ مشرق میں سائبیریا کے برف زار، مغرب میں بحرِ اوقیانوس جس پر اس وقت کے لوگوں کے خیال میں دنیا ختم ہو جاتی تھی۔ صرف ایک ہی سمت رہ جاتی تھی کہ وہ بحرِ ابیض (mediterrananian) کا حوض پار کریں اور ادھر ایشیا اور افریقہ کے سرسبز و شاداب علاقوں پر قبضہ جمالیں۔ یہ قبضے وہ اسلام سے پہلے کی تاریخ میں جماتی بھی رہی تھیں۔ لیکن اب یہ خطے "عالم اسلام" تھے اور خلافت موجود تھی۔ یورپ کا یہ چھوٹا سا براعظم مسلسل ان اقوام کے لیے تنگ پڑتا گیا۔ دو طرف بے آب و گیاہ برف زار، تیسری طرف تاحدِ نگاہ سمندر اور چوتھی طرف عالمِ اسلام کی قدرتی وسائل سے بھرپور زمین۔ اس وقت یورپی توسیع پسندوں سے عالمِ اسلام کی واحد دفاعی فصیل خلافت تھی۔ تمام آباد خطوں تک یورپ کی رسائی یا تو بحر ابیض کے ذریعے ہو سکتی تھی جو خلافت کے قبضے میں تھا یا پھر ایشیائے کوچک کی خشکی (موجودہ ترکی) جس پر عثمانیوں کی اپنی حکومت قائم تھی اور مشرق میں بحرِ قزوین (Caspian Sea) تک جاتی

تھی۔

انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا کے مطابق:

".....The growing power of the Ottoman Turks, who were hostile to Christians blocked yet more firmly the outlets to the Mediterranean of the ancient sea routes from the East. "(1)

(عثمانی ترکوں کی بڑھتی ہوئی عیسائی مخالف طاقت نے بحیرۂ روم کے قدیم مشرقی راستوں میں شدید/مضبوط رکاوٹیں کھڑی کر رکھی تھیں۔)

تیسرا راستہ بحرِ اوقیانوس کا ہوسکتا تھا جس میں جہاز رانی کرتے ہوئے پورے براعظم افریقہ کے اوپر سے ہزاروں میل کا ایک طویل چکر کاٹنا پڑتا۔ پندرھویں صدی عیسوی کے اواخر میں ہسپانیہ پر آٹھ سو سالہ مسلم اقتدار کا سورج غروب ہوا اور متعصب عیسائیوں کی حکومت آئی تو وہاں کے یہودیوں کے لیے بھی اپنے لیے کسی اور جائے پناہ کی تلاش ضروری ہوگئی۔ ان سب عوامل نے مغربی اقوام کو نئے راستوں اور نئی دنیاؤں کی دریافت کی طرف راغب کیا اور وہ ایسی کئی نئی دنیاؤں کی دریافت میں کامیاب ہو بھی گئے جو اس وقت تک انسانی معلومات کے دائرے سے باہر تھیں۔ براعظم شمالی امریکہ، براعظم جنوبی امریکہ، براعظم آسٹریلیا، جزائر نیوزی لینڈ جیسے خطے جو آج گوری اقوام کا مسکن ہیں درحقیقت یورپ کی نشاۃِ ثانیہ کے ساتھ ہی پیدا ہونے والے ان کی توسیع پسندانہ استعماری عزائم کی یادگاریں ہیں۔ یہ یورپی نو آبادکار ''تہذیب'' کے وہ دعویدار اور علمبردار تھے جنہوں نے اپنی دریافت کردہ ''نئی دنیاؤں'' کے پرانے اور مقامی باشندوں کو انسانی تاریخ کے بدترین مظالم اور وحشیانہ نسل کشی کا شکار اس لیے بنایا تا کہ ان کی زمین کے جملہ حقوق اپنے نام لکھ سکیں۔

(1) Encyclopedia Britanica ; vol : 18 ; pg : 860

نوم چومسکی کہتا ہے۔

"...The offshoots of England:the United States, Canada, Australia These are unusual imperial societies in that they (the colonists) didnt just rule the natives, they eliminated them. They took over their land and settlements and virtually exterminated them in most cases." (1)

(برطانیہ کی شاخیں (جیسے) ریاستہائے متحدہ امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا۔۔۔اس لحاظ سے غیر معمولی سامراجی معاشرے ہیں کہ یہاں پر سامراجی طاقتوں نے مقامی آبادیوں پر حکومت نہیں کی (بلکہ) انہیں صفحۂ ہستی سے ہی مٹا دیا۔ انہوں (سامراجیوں) نے مقامی آبادی کی زمینوں اور علاقوں پر قبضہ جمایا اور ان آبادیوں کا قلع قمع کر دیا۔)

غرض یہ کہ پندرھویں صدی کے اواخر سے نئے راستوں اور نئی دنیاؤں کی دریافت کے ساتھ ہی یورپی استعمار کا دور شروع ہوتا ہے۔

انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا کے مطابق:

" The age of modern colonialism began about 1500, following the European discoveries of a sea route around Africa's Southern coast (1488) and of America (1492). With these events sea power shifted from the Mediterranean to the Atlantic and to the emerging nation states of Protugal, Spain, the Dutch

---

(1) Noam Chomsky and Andre Vltchek; "On Western Terrorism from Hiroshima to Drone Warfere"; Pluto Press, London; 2013 ; Pg:4

republic, France and England . By discovery, conquest and settlement these nations expanded and colonized throughout the world, spreading European institutions and culture."①

(1488ء میں یورپیوں نے افریقہ کے جنوبی ساحل کا بحری راستہ اور 1492 میں براعظم امریکہ دریافت کیا تو اس کے ساتھ ہی جدید نوآبادیاتی دور کا آغاز ہوا۔ پرتگال، سپین، ہالینڈ، فرانس اور برطانیہ کی ابھرتی ہوئی اقوام نے بحیرۂ روم کی بجائے بحر اوقیانوس میں اپنی بحری بالادستی قائم کی ان اقوام نے نئے خطے دریافت کیے انہیں فتح کیا اور وہاں اپنی رہائش قائم کی اس طرح اپنی طاقت کو بڑھایا اور دنیا میں اپنی نوآبادیات بنائیں۔ اس کے نتیجے میں یورپی نظام اور ثقافت دنیا میں پھیلی۔)

دوسری جنگِ عظیم تک دنیا کا ایک بڑا حصہ یورپ کے استعماری شکنجے میں جکڑا جا چکا تھا۔

"Before world war II two fifth of the world's land area and a third of its population were in colonies, dependencies or dominions."②

(جنگ عظیم دوم سے قبل دنیا کی زمین کا 5/2 حصہ اور دنیا کی آبادی کا تیسرا حصہ یا تو نوآبادیات کی شکل اختیار کر چکا تھا یا کسی دوسری شکل میں اپنی خود مختاری سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔)

① Encyclopedia Britanica ; vol : 18 ; pg : 866

② Magstadt, Thomas M.; "Understanding Politics....." ; pg:218

فصل دوم:

عالمِ اسلام پر استعماری یلغار اور تسلط

قدرت نے اقوام کے عروج اور زوال کے کچھ اصول و قوانین مقرر کر رکھے ہیں۔ اسی قانون کے تحت جب تک مسلمانوں نے اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھا، دنیا کے ایک بڑے خطے پر ان کی عسکری، سیاسی اور تہذیبی سیادت قائم رہی لیکن یہ گرفت جہاں جہاں اور جب جب ڈھیلی پڑتی رہی اللہ کے عذاب کے کوڑے بھی برستے رہے۔ بیت المقدس کا مسلمانوں کے ہاتھوں سے چھن جانا (1099ء)، مرکزِ خلافت کا تاتاریوں کے ہاتھوں عبرتناک انجام سے دوچار ہونا (1258)، سپین میں مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ عظیم الشان سلطنت وسطوت کا حسرت ناک انداز میں خاتمہ ہونا (1492ء) یہ سب ذلتیں مسلمانوں کے اپنے ہی ہاتھوں کی کمائی تھی۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝ (1)

"بے شک اللہ تعالیٰ تو لوگوں پر کچھ بھی ظلم نہیں کرتا بلکہ لوگ خود ہی اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں"۔

لیکن ایسی ہر شکست اور ذلت کے بعد مسلمانوں میں کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی صورت میں ایسی تحریکیں اٹھتی رہیں اور ایسے بطل جلیل پیدا ہوتے رہے جنھوں نے عالمِ اسلام کی ٹوٹتی اور گرتی ہوئی دیواروں کو سہارا دے کر اُسے پھر سے مضبوط بنیادوں پر کھڑا کر دیا۔ صلاح الدین ایوبی کے فاتحانہ معرکے، تاتاریوں کا قبولِ اسلام، عثمانی ترکوں کا عروج اور قسطنطنیہ کی عظیم الشان فتح، یہ سب اسی حقیقت کی تاریخی شہادتیں ہیں۔

---

(1) یونس 10:44

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے، اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے، اِدھر نکلے ①

اپنے گئے گزرے، اور برے سے برے ادوار میں بھی مسلم سلاطین، حکمران اور خلفاء اپنی سرزمین پر کسی توسیع پسند قوم کے جارحانہ اقدامات کا منہ توڑ جواب دینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب یورپ کی استعماری طاقتوں نے دنیا کے وسائل پر اپنے استبدادی پنجے گاڑنے کا عمل شروع کیا تو ان کے اولین شکار وہی خطے تھے جن کا اسلامی خلافت یا اسلام کے ساتھ دور کا واسطہ بھی نہیں تھا، (مثلاً امریکہ، آسٹریلیا وغیرہ) لیکن عالمِ اسلام کے قدرتی وسائل، دیومالائی داستانوں کے مراکز اسلامی شہر، سونے کی چڑیا کے طور پر مشہور ہندوستان، ان سب سے صرفِ نظر کر لینا ان یورپی 'جہازرانوں' اور 'تاجروں' کے لیے اب زیادہ دیر تک ممکن نہیں تھا لہٰذا جوں ہی مسلمان سلطنتوں میں ضعف کے آثار پیدا ہوئے اور تفرقہ بازی، خودغرضی، اقتدار کی ہوس اور عیش و آرام کی طلب نے ان کی مضبوط سلطنتوں کی بنیادوں کو ہلانا شروع کیا تو کب سے تاک میں بیٹھی ہوئی استعماری طاقتوں کی ریشہ دوانیاں اور سازشیں بھی تیز ہو گئیں۔ سترھویں صدی مسلمانوں کے عروج کی آخری صدی تھی پھر وہ قوم جس کے اسلاف کسی غیر مسلم مظلوم کی مدد کے لیے بھی لبیک کہتے ہوئے حاضر ہو جایا کرتے تھے اب خاموش اور بے بس تماشائیوں کی طرح اپنی سرزمین پر غیروں کا تسلط ہوتے دیکھ رہی تھی۔

"چار پانچ سو سال تک مسلمان اپنے بزرگوں کے بچھائے ہوئے بستر پر آرام سے سوتے رہے اور مغربی قومیں اپنے کام میں مشغول رہیں۔ اس کے بعد دفعتاً مغربی اقتدار کا سیلاب اٹھا اور ایک صدی کے اندر اندر تمام روئے زمین پر چھا گیا نیند کے ماتے آنکھیں ملتے ہوئے اٹھے تو دیکھا کہ مسیحی یورپ قلم اور تلوار دونوں

---

① علامہ اقبال: نظم "طلوعِ اسلام": کتاب: "بانگِ درا" (کلیاتِ اقبال): اقبال اکادمی، 1990ء: ص: 340

سے مسلح ہے اور دونوں طاقتوں سے دنیا پر حکومت کر رہا ہے"۔ ①

دنیا کے مختلف مسلم خطوں میں سترھویں صدی عیسوی سے استعماری حملوں کا آغاز ہوا۔ گو ان تمام خطوں میں غیور اور حریت پسند مسلم راہنماؤں اور عوام نے مزاحمتی تحریکیں چلائیں اور مقدور بھر کوشش کی کہ یورپ کے استعماری مقاصد کے آگے دیواریں کھڑی کر دیں لیکن تعداد اور وسائل میں کمی، نیز اپنوں کی بے عملی اور غداری کی وجہ سے یہ تحریکیں اس سیلاب کے آگے بند باندھنے میں ناکام رہیں۔ یوں دیکھتے ہی دیکھتے تقریباً تمام قابل ذکر مسلم خطے یورپی کالونیوں اور نوآبادیوں کی حیثیت اختیار کر گئے۔ پہلی جنگِ عظیم میں ترکی کی شکست کے بعد عثمانیہ خلافت کے زیر انتظام رہے سہے مسلم علاقے بھی یورپ کے قبضے میں چلے گئے۔ ہنگٹن لکھتا ہے:

"By 1920 only four Muslim countries, Turkey, Saudi Arabia, Iran and Afghanistan remained independent of some form of non Muslim rule."②

(1920 تک صرف چار مسلمان ممالک ترکی، سعودی عرب، ایران اور افغانستان تھے جو کسی قسم کے غیر مسلم تسلط سے آزاد رہے)۔

ڈاکٹر اسرار احمد اسلامی دنیا پر یورپی اور عیسائی تسلط کی منظر کشی ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"تیرھویں، چودھویں اور پندرھویں صدی کے دوران عیسائیوں نے تدریجاً ہسپانیہ میں اسلام اور مسلمانوں کو ختم کیا تا آنکہ، سولھویں صدی کے اوائل میں پورے جزیرہ نمائے آئی بیریا سے اسلام اور مسلمانوں کا نام ونشان تک مٹ گیا

---

① مودودی؛ ابوالاعلیٰ سید؛ "تنقیحات"؛ اسلامک پبلی کیشنز؛ لاہور؛ ستمبر 2014، ص: 10

② Huntington, Samuel P. ;"The Clash of Civilizations and the Remaking of World Order" ; Simon & Schuster, UK, 2002; pg:210

اور یورپ کے جنوب مغربی علاقے سے نسلی صفائی (Ethnic cleansing) کا کام پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا (جواب پانچ سو برس بعد یورپ کے جنوب مشرق کنارے یعنی بلقان کے علاقے میں ہورہا ہے) بعد ازاں یورپ کی عیسائی اقوام کا سیلاب واسکوڈی گاما کے دریافت کردہ بحری راستے کے ذریعے مشرق اقصیٰ کے مسلمان ممالک پر ٹوٹ پڑا اور سترھویں، اٹھارویں اور انیسویں صدی کے دوران جاوا، ملایا سماٹرا اور ہندوستان سے مسلمان حکومتوں کو ختم کرتے ہوئے بالآخر یہ سیلاب بیسویں صدی کے اوائل میں عظیم سلطنت عثمانیہ کو بھی بہا کر لے گیا اور پورا مشرق اوسط اور شمالی افریقہ بھی عیسائی اقوام کے زیرِ نگیں آ گیا۔ بقول علامہ اقبال:

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیلؑ
خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز"[1]

مسلم خطوں پر یورپی قبضے کی مختصر روداد درجِ ذیل ہے:

برِّ اعظم افریقہ

افریقہ جسے یورپ میں تاریک برِ اعظم کے نام سے جانا جاتا تھا۔[2] ہر طرح کے قدرتی وسائل سے مالا مال برِ اعظم ہے۔ پندرھویں صدی میں یورپی اقوام نے افریقہ کا مغربی ساحل دریافت کرلیا تھا۔ پھر یورپی استعمار نے صرف یہاں کے زرعی، معدنی اور جنگلی وسائل پر ہی ہاتھ صاف نہیں کیا بلکہ یہاں کے سیاہ فام باشندوں کو بھی ایک

---

[1] ڈاکٹر اسرار احمد؛ "سابقہ اور موجودہ مسلمان امتوں کا ماضی حال اور مستقبل اور مسلمانانِ پاکستان کی خصوصی ذمہ داری"؛ مکتبہ خدام القرآن لاہور: اکتوبر 1993ء، ص 57

[2] The Kingfisher [illegible] History of the World"; pg:596

Commodity کا درجہ دیتے ہوئے ظلم و بربریت کی لرزہ خیز تاریخ رقم کی ۔ثروت صولت لکھتے ہیں:

"....ان یورپی قوموں کو شروع میں صرف سونے اور ہاتھی دانت سے دلچسپی تھی ،اس کے بعد ان قوموں نے افریقی غلاموں کی تجارت شروع کر دی۔ یورپی قوموں کی طرف سے غلاموں کی یہ تجارت جو ۱۵۰۰ء سے ۱۸۰۰ء تک پورے تین سو سال جاری رہی انسانی تاریخ کا انتہائی بھیانک اور دردناک باب ہے.... اس کام میں یورپ کی تقریباً تمام قوموں نے دل کھول کر حصہ لیا۔ افریقہ کے سارے ساحل پر خصوصاً مغربی افریقہ کے ساحلوں پر ان قوموں نے جن میں پرتگالی ،ہسپانوی ،فرانسیسی، انگریز ، جرمن اور اہل ڈنمارک اور اہل سوئیڈن شامل تھے، جگہ جگہ قلعے اور چوکیاں تعمیر کر لیں جہاں سے ان قوموں کے بندوق بند سپاہی اندرونِ ملک سیاہ فام باشندوں کی پرامن بستیوں پر چھاپے مارا کرتے تھے اور مردوں اور عورتوں کو پکڑ کر لاتے تھے پھر ان بے بس لوگوں کو جانوروں کی طرح سے جہازوں میں ٹھونس کر امریکہ پہنچا دیتے تھے۔ راستے میں بے شمار افریقی بھوک اور تشدد کا شکار ہو کر ختم ہو جاتے تھے۔"(۱)

۱۸۰۰ء میں غلاموں کی تجارت بند ہونے کے بعد ان استعماری اقوام نے افریقہ کو لوٹنے کا دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ افریقہ کے جن ممالک کا موسم اور آب و ہوا یورپی باشندوں کی آبادکاری کے لیے موزوں تھی وہاں یورپی باشندوں کو آباد کیا گیا اور باقی افریقہ پر قبضہ کر کے اس کو یورپی نوآبادی میں تبدیل کر دیا گیا۔ براعظم افریقہ پر یورپ کے اس استعماری اور استبدادی حملوں کو تاریخ میں Scramble for Africa کا نام دیا گیا ہے۔(۲)

---

(۱) ثروت صولت ،"ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ"؛ اسلامک پبلی کیشنز لاہور؛ مارچ 1998؛ ج: دوم؛ ص:501

(۲) "The Kingfisher Illustrated History of the World"; pg:598

افریقہ کے مسلم خطوں پر جس وقت یورپ کے استعماری حملوں کا آغاز ہوا تو اس وقت یہ علاقے عثمانی خلافت کا حصہ تھے عثمانیوں کی کمزوریوں نے ہی یورپ کی استعماری طاقتوں کو ان خطوں پر قابض ہونے کا موقع فراہم کیا۔

انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا کے مطابق:

".....Ottoman Power was perceptibly waning. The military balance had tipped decisevely in favour of the European nations and Turkey was becoming increasingly dependent on loans from European centers of capital. In the late 1870's Turkey needed half of its government income just to service its foreign debt."①

(عثمانی ترکوں کی طاقت واضح طور پر کم ہو رہی تھی۔ عسکری توازن کا پلڑا فیصلہ کن حد تک یورپی اقوام کے حق میں بھاری ہو چکا تھا اور یورپی قرضوں پر ترکی کا انحصار بڑھتا جا رہا تھا۔ 1870 کے اواخر میں ترکی اپنی حکومت کی آدھی آمدنی بیرونی قرضوں کی ادائیگی میں مد میں خرچ کرنے پر مجبور ہو چکا تھا۔)

گویا ایک طویل عرصے کے مضبوط اقتدار کے بعد عثمانی حکمرانوں کی سادگی، جفاکشی اور جذبہ جہاد کی جگہ اب عیش وعشرت اور لذت پرستی نے لے لی تھی۔

براعظم افریقہ کے جو اہم خطے یورپی استعمار کا شکار بنے ان کا مختصر جائزہ مندرجہ ذیل ہے:

الجزائر:

الجزائر شمالی افریقہ کا ایک عرب خطہ ہے ساتویں صدی عیسوی میں عقبہ بن نافع کی

---

①"Ecnyclopedia Britancica"; vol:18; Pg:885

فتوحات کے نتیجے میں اسلامی سلطنت کا حصہ بنا۔ ۱۵۵۳ء میں مشہور ترک امیرالبحر خیرالدین باربروسہ نے الجزائر کو فتح کر کے سلطنت عثمانیہ کا حصہ بنایا۔(۱)

انیسویں صدی میں جب محمود ثانی کے دور میں عثمانی سلطنت اندرونی خلفشار اور بیرونی حملوں کی وجہ سے کمزور ہوگئی تو فرانس کو یہاں مداخلت کا موقع مل گیا۔ اپریل ۱۸۲۷ء میں فرانس کو گیہوں کی فراہمی کے مسئلے پر الجزائر اور فرانس میں اختلاف ہوگیا۔ مصالحت کی گفتگو ہورہی تھی کہ الجزائر کے حکمران دائی حسین نے فرانسیسی قونصل کو ایک چھڑی ماردی۔ فرانس نے اس بات کو بہانہ بنا کر الجزائر کے خلاف کارروائی شروع کردی۔ فرانسیسی بیڑے نے تین سال تک الجزائر کی بندرگاہ کی ناکہ بندی جاری رکھی اور جب ناکہ بندی سے مقصد حاصل نہ ہوا تو ۱۴ جون ۱۸۳۰ء کو فرانس نے ۳۷ ہزار فوج الجزائر کے ساحل پر اتاردی اور الجزائر شہر کے علاوہ کئی دیگر شہروں پر قبضہ کرلیا۔(۲)

الجزائر کو فرانس کے تسلط سے بچانے کے لیے جس راہنما نے نمایاں اور قابل قدر کوششیں کیں وہ عبدالقادر الجزائری تھے۔ انہوں نے الجزائر کے مختلف قبائل کے اختلافات ختم کروا کر انہیں فرانس کے خلاف متحد کیا اور فرانسیسیوں کے خلاف اعلان جہاد کیا لیکن فرانسیسی فوجوں کی کثرت اور جدید اسلحہ کی وجہ سے عبدالقادر ۲۱ دسمبر ۱۸۴۷ء کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوگئے۔ عبدالقادر الجزائری کے ہتھیار ڈالنے کے بعد ایک سال کے اندر اندر پورے الجزائر پر فرانس کا قبضہ ہوگیا اور فرانس نے الجزائر کو اپنے ملک کا ایک صوبہ قرار دیدیا۔(۳)

---

(۱) ثروت صولت: ''ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ''؛ ج:4؛ ص:198

(۲) ایضاً؛ ج: 2؛ ص:480

(۳) ایضاً؛ ج: 2؛ ص: 481 تا 483

تونس:

تونس ۱۵۷۴ء میں سلطنت عثمانیہ کا حصہ بنا۔ ۱۶۴۰ء سے عثمانیوں کی حکومت برائے نام رہ گئی اور تونس اپنے اندرونی معاملات میں بڑی حد تک خود مختار ہو گیا۔[1] ۱۸۵۹ء تا ۱۸۸۲ء تونس کی حکومت نے مختلف منصوبوں کے لئے بیرونی سرمایہ اس کثرت سے حاصل کیا کہ ملک یورپی ملکوں کا مقروض ہو گیا۔[2] ان یورپی ممالک کے درپردہ عزائم یہی تھے کہ اس خطے کو اپنا اس قدر زیر بار کر دیا جائے کہ ترکی کے ساتھ اس کے تعلقات ختم ہو جائیں۔

انسائیکلوپیڈیا بریٹینیکا کے مطابق:

"Italy, as well as France and England, had loaned large sums to the ruling beys (title of Tunisian rulers) of Tunisia to help loosen that country's ties with Turkey."[3]

(ترکی، فرانس اور برطانیہ نے تونس کے حکمرانوں کو بڑے بڑے قرضے فراہم کیے تاکہ ترکی کے ساتھ ان کے تعلق کو کمزور کیا جا سکے۔)

لہٰذا ان ممالک کو تونس کے اندرونی معاملات میں مداخلت کا موقع مل گیا۔ ۱۸۶۹ء میں تونس کے دیوالیہ ہو جانے پر برطانیہ، فرانس اور اٹلی نے تونس کے مالی امور پر کنٹرول قائم کر دیا۔[4] تونس کے حکمران صادق بے نے ۱۸۷۳ء میں خیر الدین پاشا کو ملک کا وزیر

---

[1] ثروت صولت؛ ''ملتِ اسلامیہ کی مختصر تاریخ''؛ ج:4؛ص:188

[2] ایضاً؛ ج:2؛ص: 484

[3] "Encyclopedia Britanica" ; vol : 18;Pg:885

[4] ثروت صولت؛ ''ملتِ اسلامیہ کی مختصر تاریخ''؛ ج:2؛ص:484

اعظم مقرر کیا۔ خیر الدین نے ایسی اصلاحات کیں کہ ملک کی سیاسی اور مالی حالت مستحکم ہو نے لگی۔ نیز انہوں نے یورپی ملکوں خصوصاً فرانس کے استعماری عزائم کو بھانپتے ہوئے ان کا مقابلہ کرنے کے لیے سلطنت عثمانیہ سے قریبی تعلقات پیدا کرنا چاہا لیکن حکمران صادق بے نے اس شک میں کہ کہیں خیر الدین تونس کو پھر سلطنت عثمانیہ میں شامل نہ کر دیں انہیں ۱۸۷۷ء میں وزارت اعظمیٰ کے عہدے سے برطرف کر دیا۔

خیر الدین پاشا کے چلے جانے کے بعد تونس کے حالات مزید ابتر ہو گئے۔ قرضوں کی ادائیگی کے لئے جب بہت زیادہ ٹیکس لگائے گئے تو ملک میں حکومت کے خلاف بے چینی پھیل گئی۔ اس عوامی بے چینی کا بہانہ بنا کر اٹلی تونس پر قبضے کے لئے پر تول ہی رہا تھا کہ فرانس نے اٹلی کے عزائم کو بھانپتے ہوئے فوری قدم اٹھایا اور تونس میں فوجی مداخلت کر کے ۱۲ مئی ۱۸۸۱ء کو صادق بے کو قصر السعید کا معاہدہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس معاہدے کے تحت تونس پر بے کی محض نمائشی حکومت برقرار رکھی گئی۔ اصل اختیارات تونس میں مقیم فرانسیسی ریذیڈنٹ جنرل کے ہاتھ میں دے دیئے گئے اور تونس کو فرانس کا ''زیر حفاظت علاقہ'' قرار دے دیا گیا۔[1]

مصر:

مصر خلافت راشدہ کے اولین دور میں اسلامی سلطنت کا حصہ بنا اور ۱۵۱۷ء میں مصر پر عثمانی ترکوں کا قبضہ ہوا۔[2]

۱۸۶۳ء میں اسمٰعیل پاشا مصر کا حکمران بنا تو اس کی فضول خرچیوں اور غلط پالیسیوں کی بدولت ملک دیوالیہ ہو گیا اور یورپی ممالک کا مقروض بن گیا۔[3] مصر پر قبضہ کے لئے

---

(1) ثروت صولت؛ ''ملتِ اسلامیہ کی مختصر تاریخ''؛ ج:2؛ ص:484 تا 487

(2) ایضاً؛ ص:488

(3) ایضاً؛ ص:492

فرانس اور برطانیہ دونوں تاک میں تھے۔ برطانیہ کے لئے یہ خطہ اس لیے بھی اہم تھا کیونکہ مصر کی سویز کینال برطانیہ کے تجارتی مقاصد اور دیگر نوآبادیات کو ملانے کے لئے اہم جغرافیائی حیثیت رکھتی تھی۔ (۱) فرانس اس دور میں تونس پر قبضے کی کوششوں میں مصروف ہونے کی وجہ سے اس محاذ پر توجہ نہیں دے سکا لہٰذا برطانیہ نے مصر پر تسلط جمانے کی کوششیں تیز کردیں اور برطانوی بحری بیڑے نے جولائی ۱۸۸۲ء کو اسکندریہ پر گولہ باری شروع کردی۔

برطانوی تسلط کے خلاف احمد اعرابی پاشا کی راہنمائی میں مزاحمتی تحریک شروع ہوئی جس کو کچلنے کے لئے برطانیہ نے اسمعیلیہ میں اپنی فوجیں اتار دیں۔ ۱۳ ستمبر ۱۸۸۲ کو تل الکبیر کے مقام پر اعرابی پاشا کو شکست دے کر برطانوی فوجیں قاہرہ میں داخل ہوگئیں اور مصر پر برطانوی تسلط کے دور کا آغاز ہوا۔ (۲)

سینی گال:

یہ مغربی افریقہ کا خطہ ہے۔ مغربی افریقہ کے نیگرو علاقوں میں سب سے پہلے اسلام قبول کرنے والے باشندے، سینی گال کے تھے۔ (۳) یورپ کی قوموں میں ۱۴۴۴ء میں پرتگالی سینے گال پہنچے تو انہوں نے مقامی باشندوں کو عیسائی بنانے کی کوشش کی اور غلاموں کی خرید و فروخت کو وسیع پیمانے پر فروغ دیا۔ (۴) ۱۶۴۵ء میں فرانسیسی آئے اور دریائے سینی گال کے دہانے پر قابض ہوگئے اور انہوں نے گنی اور آئیوری کوسٹ تک ساحلی علاقوں میں جگہ جگہ اپنی چوکیاں قائم کرلیں۔ آہستہ آہستہ انہوں نے تجارت کی آڑ میں سینے گال کے

(۱) "Encyclopedia Britanica"; vol:18; pg:886

(۲) ثروت صولت؛ ''ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ''؛ ج:2؛ ص: 493

(۳) ایضاً؛ ص: 237

(۴) ایضاً

داخلی معاملات میں مداخلت شروع کر دی اور اندرون ملک قدم بڑھانے شروع کر دیے۔ (۱)

سینے گال میں جن لوگوں نے فرانسیسی استعمار کا راستہ روکنے کی کوشش کی ان میں حاجی عمر تجانی ۱۷۹۷ء تا ۱۸۶۴ء کا نام سب سے نمایاں ہے۔ انہوں نے فرنسیسیوں کے خلاف افریقی باشندوں کو منظم کیا اور سینی گال کے اندرونی علاقوں میں ایک مضبوط حکومت قائم کر کے فرانسیسیوں کے خلاف برسرپیکار ہو گئے۔ عمر تجانی کا مقابلہ کرنے کے لئے ۱۸۵۴ء میں فرانسیسی گورنر جنرل Faid Harbe سینی گال آیا۔ اس کو فرانسیسی نو آبادیوں کا نپولین کہا جاتا ہے۔ طویل جنگ کے بعد ۱۸۶۴ء میں عمر تجانی کی شہادت ہوئی اور فرانس پورے سینے گال پر قابض ہو گیا اور اس خطے کو مغربی افریقہ کے فرانسیسی گورنر جنرل کی حکومت کے تحت فرانس کا ایک علاقہ یا صوبہ بنا دیا گیا۔ (۲)

برلن کانفرنس: ۱۸۸۴۔۸۵

افریقی خطوں کو اپنی نو آبادیاں بنانے کی دوڑ میں یورپ کے تقریباً تمام ممالک شریک تھے، گو برطانیہ اور فرانس اس میں سرفہرست تھے۔ اس مقابلے میں یورپی اقوام کے مابین دشمنی اور رقابت کی آگ بھڑک اٹھی لہٰذا ان ممالک نے فیصلہ کیا کہ آپس میں لڑنے کی بجائے اس خطے کی تقسیم کا کوئی فارمولا طے کر لیا جائے۔ اس سلسلے میں ۱۸۸۴۔۸۵ میں برلن میں یورپی استعماری طاقتوں کی کانفرنس منعقد ہوئی اور ان ممالک نے براعظم افریقہ کے مختلف خطوں کی خیالی سرحدیں بنا کر انہیں آپس میں تقسیم کر لیا۔ (۳)

تقسیم کے اس فارمولے کو طے کرتے ہوئے افریقی عوام کی مذہبی ثقافتی یا جغرافیائی تاریخ یا جذبات کو قطعاً پیش نظر نہیں رکھا گیا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ:

---

(۱) ثروت صولت: ''ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ''؛ ج:4؛ ص:238

(۲) ایضاً

(۳) John Mcleod; "Beginning Post Colonialism"; pg: 91

"The rival European countries cut up Africa like a cake."(1)

(یورپ کی حریف اقوام نے افریقہ کو کیک کی طرح کاٹ کر بانٹ لیا۔)

اس کانفرنس کے بعد یورپی اقوام شکاری جانوروں کی طرح اپنے اپنے حصے میں آئے شکار پر جھپٹ پڑیں اور پندرہ سال کے اندر اندر تمام براعظم افریقہ کو اپنی غلامی میں جکڑ لیا۔ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی یہ پیشگوئی حرف بہ حرف پوری ہوتی نظر آئی کہ عنقریب مسلمانوں پر دوسری اقوام یوں چڑھ آئیں گی جیسے لوگ دسترخوان پر آتے ہیں۔(2)

گنی اور مالی:

تقسیم افریقہ کے منصوبے کے تحت مغربی افریقہ فرانس کے حصے میں آیا تھا لہٰذا فرانس نے اپنے زیر قبضہ علاقے سینی گال سے گنی اور مالی کی طرف پیش قدمی شروع کی۔(3) مالی کے علاقے میں حاجی عمر تجانی کے بیٹے احمدو نے اور گنی کے علاقے میں امام صمد نے فرانسیسیوں کا قدم قدم پر مقابلہ کیا۔ ثروت صولت لکھتے ہیں:

"امام صمد نے فرانسیسی استعمار کا جیسا سخت مقابلہ کیا ویسا مغربی افریقہ میں کسی دوسرے نے نہیں کیا"۔(4)

ان مجاہدین کی سرتوڑ کوششوں کے باوجود جدید اسلحہ اور جدید فوجی تنظیم نہ ہونے کی وجہ سے حملہ آوروں کو روکنے میں ناکامی ہوئی اور ۱۸۹۳ء میں فرانسیسیوں کا قبضہ مالی پر

(1) "The Kingfisher Illustrated History of the world"; pg : 599

(2) ابوداؤد، سلیمان بن اشعث سجستانی، امام؛ "سنن ابوداؤد"؛ کتاب الملاحم؛ باب فی تداعی الامم علی الاسلام

(3) ثروت صولت؛ "ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ"؛ ج:2؛ ص: 502

(4) ایضاً؛ ج:4؛ ص:252

ہو گیا۔① پھر ۱۸۹۸ء فرانسیسیوں کے ہاتھوں امام صمد کی گرفتاری کے ساتھ ہی فرانسیسی استعمار کے خلاف آخری مسلح مزاحمت کا نہ صرف گئی بلکہ پورے مغربی افریقہ میں خاتمہ ہو گیا۔②

نائیجر:

موجودہ نائیجر کا خطہ انیسویں صدی میں مختلف حکومتوں اور سلطنتوں میں منقسم تھا۔ انیسویں صدی کی آخری دہائی میں فرانسیسیوں نے مالی پر قبضے کے بعد موجودہ نائیجر کی طرف قدم بڑھائے اور بیسویں صدی کے آغاز میں اس کو اپنی نو آبادی بنا لیا۔③

صومالیہ:

صومالیہ مشرقی افریقہ کا ساحلی خطہ ہے انیسویں صدی کے آخر میں اس خطے پر یورپی اقوام کے استعماری حملوں کا آغاز ہوا۔ ۱۸۸۵ء میں اس کے ایک حصے پر برطانیہ نے اور دوسرے پر فرانس نے قبضہ کیا اور ۱۸۸۹ء میں تیسرے حصے پر اٹلی کا قبضہ ہوا۔ اسی مناسبت سے ان تینوں خطوں کے نام برطانوی صومالی لینڈ، فرانسیسی صومالی لینڈ اور اطالوی صومالی لینڈ رکھے گئے۔④

صومالیہ میں یورپی استعماری قبضہ کاروں کے خلاف مزاحمت کرنے والوں میں محمد بن عبداللہ حسن کا نام بہت نمایاں ہے۔ انہوں نے ۱۹۰۱ء سے ۱۹۲۰ء تک برطانیہ اور اٹلی کا بڑی بہادری سے مقابلہ کیا لیکن ان یورپی طاقتوں نے صومالی قبائل کو رشوت دے کر

---

① ثروت صولت؛ ''ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ''؛ ج:2؛ ص:246

② ایضاً؛ ص: 253

③ ایضاً؛ ص: 264

④ ایضاً؛ ص:157

اپنے ساتھ ملا لیا۔ جس کی وجہ سے محمد بن عبداللہ کو ناکامی ہوئی۔ ①

سوڈان:

سوڈان آٹھویں صدی عیسوی میں حلقۂ اسلام میں داخل ہوا۔ ۱۸۱۰ء میں مصر نے سوڈان کو فتح کر کے اپنی مملکت کا حصہ بنایا لیکن مصری حکومت کے نامناسب رویے کے نتیجے میں سوڈانیوں نے مہدی سوڈانی (محمد احمد) کی سرکردگی میں علم بغاوت بلند کیا (۱۸۸۳ء)۔ مصر اس وقت برطانیہ کے زیر تسلط آچکا تھا لہٰذا ایک انگریز فوجی جرنل گورڈن کو مہدی سوڈانی کی بغاوت کچلنے کیلئے نامزد کیا گیا لیکن گورڈن مارا گیا اور جنوری ۱۸۸۵ء کو خرطوم پر مہدی سوڈانی کا قبضہ ہو گیا۔ مہدی سوڈانی اب مصر پر حملے کی تیاریاں کر رہے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کا جانشین حکومت کی ذمہ داریاں سنبھالنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ لہٰذا مصری فوج نے اپنے نئے انگریز سردار لارڈ کچز کی قیادت میں ۱۸۹۸ء میں سوڈان پر حملہ کر دیا۔ درویشوں (مہدی سوڈانی کے پیروؤں) نے اگرچہ بے مثال شجاعت کا مظاہرہ کیا لیکن وہ جدید اسلحے سے لیس فوج کا مقابلہ نہ کر سکے اور سوڈان پر مصری اور برطانوی تسلط قائم ہو گیا۔ ②

مراکش:

مراکش شمالی افریقہ میں اسلامی تہذیب و تمدن کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ یہ مسلم خطہ ایک طویل عرصہ تک مسلم ہسپانیہ کے تحت رہا۔ ③

جب فرانس نے الجزائر پر قبضہ کیا تو الجزائر کی تحریک آزادی کے ایک اہم راہنما امیر

---

① ثروت صولت: ''ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ''؛ ج:2؛ ص: 519

② ایضاً: ج:4؛ ص: 136 تا 138

③ ایضاً: ص: 210

عبدالقادر الجزائری فرانس سے جنگ کے دوران مراکش میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے لہٰذا فرانس نے مراکش کو دھمکانے کے لئے مراکش کی بندرگاہوں پر بمباری کی۔ اس جھڑپ نے مراکش کی فوجی کمزوری سب پر ظاہر کردی لہٰذا فرانس اور سپین مراکش پر قبضے کی کوششیں کرنے لگے۔ ۱۹۰۲ء میں فرانس اور سپین نے ایک خفیہ معاہدے کے ذریعے مراکش کو تقسیم کرلیا اور ۱۹۱۲ء میں اسپین نے شمالی مراکش پر جوریف کہلاتا ہے اور فرانس نے باقی ملک پر قبضہ کرلیا۔ اس پر پورے ملک میں بغاوت ہوگئی لیکن استعماری افواج نے اس بغاوت کو سختی سے کچل دیا۔ ①

لیبیا:

بیسویں صدی سے قبل موجودہ لیبیا کا نصف حصہ مصر جبکہ بقیہ نصف تونس کے ماتحت ہوتا تھا۔ ۱۸۳۵ء میں یہ خطہ براہِ راست مرکزی عثمانی حکومت کے تحت آ گیا۔ ②
انیسویں صدی میں لیبیا کے جنوبی صحرائی علاقے میں سید محمد ابن علی سنوسی (۱۷۸۷ء تا ۱۸۵۹ء) نے سنوسی تحریک کا آغاز کیا جس کا مقصد کتاب و سنت کی بنیاد پر عالمِ اسلام کا دینی احیا تھا۔ سنوسی مبلغوں کی دینی کوششوں سے دنیا کے اس سب سے بڑے صحرائی علاقے میں جرائم کا خاتمہ ہوا اور اسلام پھیلا۔ ③

انیسویں صدی کے آخر میں فرانس نے مغربی افریقہ پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تو سنوسیوں نے مزاحمت کی۔ فرانس سے جنگ جاری تھی کہ اٹلی نے شمالی سمت سے حملہ کردیا۔ اطالوی باشندے کچھ عرصہ سے ساحلی علاقوں میں آباد ہونا شروع ہو گئے تھے اور انہوں نے کاروباری دنیا پر غلبہ حاصل کرلیا تھا۔ اٹلی نے اپنے سیاسی و استعماری عزائم کو پورا کرنے کے

---

① ثروت صولت؛ ''ملتِ اسلامیہ کی مختصر تاریخ''؛ ج:2؛ ص: 497 تا 498

② ایضاً؛ ج:4؛ ص:173

③ ایضاً؛ ص:174

لئے ان ہی اطالوی باشندوں کی جان و مال کی حفاظت کرنے کے بہانے سے لیبیا میں مداخلت شروع کردی۔

لیبیا انتظامی لحاظ سے عثمانی سلطنت کا حصہ تھا لیکن ترکوں کے لئے اپنی اندرونی مشکلات کی بدولت جنگ جاری رکھنا مشکل تھا اس لیے انہوں نے اکتوبر ۱۹۱۲ء میں اٹلی سے صلح کرلی اور ۱۹۱۴ء تک اپنی بیشتر فوج لیبیا سے واپس بلالی۔ لہٰذا سنوسیوں نے سید احمد شریف کی سرکردگی میں اپنے طور پر ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۸ء تک جنگ کی۔ بعد میں سنوسی حریت پسندوں کی قیادت عمر مختار کے ہاتھ میں آئی۔ ۱۹۳۳ء تک سنوسیوں نے اٹلی کی استعماری یلغار کا بھرپور مقابلہ کیا لیکن ستمبر ۱۹۳۴ء میں عمر مختار کی گرفتاری اور شہادت کے بعد ان کی مسلح مزاحمت ختم ہوگئی اور لیبیا اٹلی کی نوآبادی بن گیا۔ (۱)

نائیجیریا:

موجودہ نائیجیریا کے علاقے میں انگریز انیسویں صدی میں سمندر کے راستے پہنچے۔ اس وقت یہ خطہ مختلف قبائلی ریاستوں کے مابین منقسم تھا۔ انگریزوں نے ۱۸۶۱ء میں بندرگاہ لاگوس پر قبضہ کیا اور جنوبی نائیجیریا کی غیر مسلم قوموں کو اپنا محکوم بنانے کے بعد دریائے نائیجر اور دریائے بینو کو پار کر کے شمال کی مسلم ریاستوں پر حملہ کردیا۔ ۱۹۰۳ء تک اس سارے علاقے پر برطانیہ کی بالادستی قائم ہوگئی جسے آج کل نائیجیریا کہا جاتا ہے۔ (۲)

موریطانیہ:

موریطانیہ دنیائے عرب کی مغربی حدود کا آخری خطہ ہے۔ انیسویں صدی کے آخر میں فرانس نے موریطانیہ پر قبضہ کیا اور ۱۹۰۳ء میں موریطانیہ کو فرانسیسی محروسہ مملکت قرار

---

(۱) ثروت صولت؛ "ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ"؛ ج:4؛ ص: 175 تا 177

(۲) ایضاً؛ ج:2؛ ص:510

دیا۔ ۱۹۲۰ء میں فرانس نے موریطانیہ کو نوآبادی کا درجہ دے دیا۔ ①

جزائر قمر:

یہ جزیروں کا ایک مجموعہ ہے جو مالاگاسی (مڈغاسکر) کے شمال مغربی ساحل اور تنزانیہ کے جنوب مشرقی ساحل کے درمیان آبنائے موزمبیق میں واقع ہے۔ ان جزائر کو ۹۷۵ء میں جنوبی ایران سے آنے والے کچھ آباد کاروں نے آباد کیا تھا جو شیرازی کہلاتے تھے اور انہوں نے ان علاقوں میں سلطنت زنج (۹۷۵ء سے ۱۴۹۸ء) قائم کی تھی، اسی دور میں یہاں اسلام پھیلا۔ ②

سولہویں صدی کے آغاز میں ان جزائر پر سب سے پہلے پرتگالیوں نے اپنی استعماری سرگرمیاں شروع کیں۔ جلد ہی انہوں نے یہاں کی ریاست قوفالا پر براہ راست قبضہ جمالیا اور دیگر ریاستوں اور علاقوں کو باجگذار بنانے کی کوشش کرتے رہے۔ سترھویں صدی میں عمان کے بحری بیڑے نے پرتگالیوں سے کامیاب جنگیں کر کے انہیں بڑی حد تک مشرقی افریقہ کے ساحلوں سے بے دخل کر دیا۔ ③

انیسویں صدی کے آخر تک فرانس مالاگاسی کے جزیروں پر قابض ہو چکا تھا وہیں سے جزائر قمر پر بھی فرانس نے اپنی بالادستی قائم کی اور ۱۹۴۶ء میں فرانس نے جزائر قمر کو سمندر پار کے فرانسیسی علاقے کی حیثیت دے دی۔ ④

---

① ثروت صولت: ''ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ''؛ ج:4؛ ص: 288

② ایضا؛ ج:2؛ ص: 132

③ ایضا

④ ایضا؛ ج:4؛ ص:299

برِّ اعظم ایشیا

براعظم ایشیا میں یورپی استعمار نے جن مسلم خطوں پر قبضہ کیا انہیں ہم چار عنوانات کے تحت تقسیم کر سکتے ہیں:

1۔ عرب خطے

2۔ جزائر مالدیپ

3۔ مشرق بعید (انڈونیشیا، ملائشیا، برونائی)

4۔ برِصغیر

1۔ عرب خطے:

ایشیا کے عرب علاقوں میں اہم ترین جزیرہ نمائے عرب ہے پھر اس کے شمال میں موجود علاقے شام، عراق، لبنان، اردن اور فلسطین ہیں۔ یہ پورا علاقہ پہلی جنگ عظیم سے قبل خلافت عثمانیہ کا حصہ تھا لیکن جنگ کے زمانے میں جب عرب قوم پرستی کے جذبات کو ہوا دی گئی تو عربوں نے خلافت عثمانیہ کے خلاف انگریزوں کی مدد کی۔ ترکی کی شکست کے بعد یہ تمام علاقے کسی نہ کسی صورت یورپی استعمار کے شکنجے میں پھنس گئے۔ کچھ خطوں کو mendates کی شکل میں یورپی ممالک کے حوالے کر دیا گیا:

"In the Arab crescent political intervention took the form of mendates, with the British established in Palestine and al Iraq and the French in Syria and Lebanon subsequent to the first wold war".[1]

---

[1] Hitti, Philip K.; "History of the Arabs"; Palgrave Macmillan, New York, 1970 (10th edition); pg : 751

(عرب ہلال میں سیاسی دخل اندازی mendates کی شکل میں کی گئی جب پہلی جنگ عظیم کے بعد برطانیہ کو فلسطین اور عراق جبکہ فرانس کو شام اور لبنان کے خطے عطا ہوئے۔)

جبکہ کچھ مزید عرب علاقے ان یورپی ممالک کے "Protectorates" کی حیثیت سے پہلے ہی یورپیوں کے "زیر حفاظت" علاقے قرار پا چکے تھے:

"British were establishing protectorates in the Persian Gulf: Muscat (Later Oman) in 1798, The Trucial states (Later the United Arab Emirates) and Bahrain in 1820, Aden in 1839, Kuwait in 1899 and finally Saudi Arabia itself."[1]

(برطانیہ خلیج فارس میں اپنے Protectorates قائم کر رہا تھا۔ 1798 میں مسقط (عمان)، 1820 بحرین اور موجودہ عرب امارات کی ریاستیں، 1839 میں عدن، 1899 میں کویت اور پھر خود سعودی عرب بھی برطانیہ کے زیر نگرانی علاقے قرار پائے۔)

حجاز کا علاقہ گوکہ یورپی استعمار سے آزاد رہا لیکن شریف حسین جو عرب قوم پرستی کو ہوا دے کر خلافت عثمانیہ سے غداری کا مرتکب ہوا تھا اور حجاز میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا تھا (۲۹ اکتوبر ۱۹۱۴) وہ مکمل طور پر انگریزوں کے زیر اثر تھا۔[2]

جزیرہ نمائے عرب کے برطانوی "Protectorates"

جزیرہ نمائے عرب کے ممالک میں سعودی عرب، یمن، کویت، متحدہ عرب امارات، بحرین، قطر اور عمان شامل ہیں یہ تمام عرب خطے کسی نہ کسی صورت برطانیہ کے زیر اثر تھے:

---

[1] "Ecyclopedia Britanica"; vol:1; pg:508

[2] ثروت صولت: "ملت اسلامی کی مختصر تاریخ"؛ ج:4؛ ص: 12

"...The (Arabian) peninsula, prior to 1960 consisted politically of the Aden colony and Aden Protectorate, the sultanate of Masqat and Oman, the trucial Shaykhdoms, and the autonomous Shaykhdoms of Qatar and al Bahrayn, all dependent in varying degrees on Great Britain and under her Protection."①

(1960 سے پہلے جزیرہ نما عرب سیاسی طور پر جن ریاستوں پر مشتمل تھا وہ عدن کی کالونی اور عدن Protectorate مسقط اور عمان کی سلطنت، موجودہ عرب امارات، قطر اور بحرین کے علاقے تھے۔ یہ سب ریاستیں کسی نہ کسی درجے میں برطانیہ پر انحصار کرتی تھیں اور اس کی زیر حفاظت/ زیر نگرانی تھیں۔)

یمن:

انیسویں صدی میں یمن پر برطانوی تسلط سے قبل یہاں کے مختلف علاقوں میں کئی خود مختار حکومتیں قائم تھیں لیکن عدن کی اہم بندرگاہ پر عثمانیوں کا قبضہ تھا۔② برطانیہ نے ۱۸۳۹ء میں عدن پر قبضہ کر لیا۔ عدن کو بحیرۂ عرب کے علاقے میں برطانوی فوج کے مرکز کی حیثیت دی گئی اور اسے برطانوی کالونی کی حیثیت حاصل رہی جبکہ یمن کے دیگر کئی خطے برطانیہ کے زیر نگرانی ''ممالک محروسہ'' قرار دیئے گئے۔③

بحرین:

بحرین پر سب سے پہلا استعماری حملہ پرتگال نے ۱۵۲۱ء میں کیا پھر ۱۶۰۲ء میں

①Hitti, Philip K. ; "History of the Arabs"; pg:739

② ثروت صولت؛ ''ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ''؛ ج:4؛ ص:42

③ ایضاً؛ ص:51

ایران نے بحرین کو پرتگال سے چھین کر صفوی حکومت کا حصہ بنایا۔ ۱۷۸۳ء میں قطر کے الخلیفہ قبیلے سے احمد بن محمد بن خلیفہ نے بحرین پر قبضہ کیا۔ ۱۸۲۰ء میں بحرین کی عرب حکومت نے برطانیہ کے ساتھ پہلا معاہدہ کیا۔① پھر ۱۸۸۰ء اور ۱۸۹۲ء میں ہونے والے معاہدوں کی رو سے بحرین پر برطانیہ کا اثر و نفوذ قائم ہو گیا اور بحرین کے خارجہ امور برطانیہ کے ہاتھ میں دے دیئے گئے۔ خلیج فارس کے علاقے کا برطانوی ریذیڈنٹ بحرین میں رہتا تھا اور تمام معاملات کی نگرانی کرتا تھا۔②

کویت:

پہلی جنگ عظیم تک کویت پر سلطنت عثمانیہ کی بالادستی قائم تھی اور بصرہ کا عثمانی گورنر کویت کے معاملات کا نگران ہوتا تھا۔ انیسویں صدی کے آخر میں انگریزوں نے کویت کے معاملات میں مداخلت شروع کر دی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ برطانیہ خلیج فارس میں اپنے تجارتی معاملات کو مضبوط کرنا چاہتا تھا،③ اور دوسرا یہ کہ جرمنی بھی اس خطے پر اپنا اثر و نفوذ قائم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کویت نے جرمنوں اور عثمانیوں کے اثر و نفوذ کا راستہ روکنے کے لئے خود کو برطانیہ کی ''حفاظت'' میں دے دیا اور ۱۸۹۹ء میں ایک معاہدے کے تحت برطانیہ نے کویت کے تمام خارجہ امور اپنے ہاتھ لے لیے۔④

قطر:

قطر ایک طویل عرصے تک ایرانی حکومت کے تحت رہا اور انیسویں صدی میں اس

---

① "Encyclopedia Britanica";vol:1;pg:803

② ثروت صولت: ''ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ''؛ ج:4؛ ص:67

③ ایضاً؛ ص:70

④ "Encyclopedia Britanica"; vol : 13; pg : 884

نے ایران سے آزادی حاصل کی۔ ہمسایہ عرب ریاستوں کے ساتھ قطر کی مسلسل جنگوں اور بحری قزاقوں کا کا بہانہ بنا کر برطانیہ نے دخل اندازی کی اور الثانی خاندان کو قطر کی حکومت سونپی۔ ۱۸۶۸ء میں قطر نے برطانیہ کے ساتھ ایک معاہدے پر دستخط کیے جس کی رو سے قطر اس بات کا پابند تھا کہ تمام ہمسایہ ریاستوں کے ساتھ اس کے تعلقات اور جھگڑے برطانیہ طے کرے گا۔ ۱۸۷۱ء میں عثمانیوں نے قطر پر قبضے کی کوشش کی جو ناکام رہی۔ نومبر ۱۹۱۶ء میں قطر نے برطانیہ کے ساتھ ایک اور معاہدے پر دستخط کیے جس کی رُو سے قطر برطانیہ کا ''زیرِ حفاظت'' علاقہ قرار پایا۔ (۱)

متحدہ عرب امارات:

یہ سات عرب ریاستیں بھی انیسویں صدی میں اس وقت برطانیہ کے زیر اثر آئیں جب برطانیہ خلیج فارس کے علاقے میں اپنا اقتدار مستحکم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ان ریاستوں میں بحیرہ، راس الخیمہ، عمان، شارجہ، ام القوین، دوبئی اور ابوظہبی شامل ہیں۔ ۱۸۲۰ء سے ۱۸۹۲ء کے درمیان برطانیہ نے ان کے ساتھ خصوصی معاہدے کیے تھے جن کے تحت دفاع اور امورِ خارجہ کے معاملات برطانیہ کے ہاتھ میں چلے گئے۔ ابوظہبی میں مقیم برطانیہ کا پولیٹکل ایجنٹ ان معاملات کو کنٹرول کرتا تھا۔ (۲)

عمان:

یورپی ممالک میں سے پرتگال نے سب سے پہلے ۱۵۰۸ء میں عمان کے شہر مسقط پر قبضہ کیا اور اس شہر کو جلا کر خاک کر دیا۔ ۱۶۵۰ء میں مقامی عربوں نے پرتگالیوں کو نکال باہر کیا۔ (۳) اٹھارویں صدی کے آخر میں خطے میں فرانس کے بڑھتے ہوئے اثر و نفوذ کے

---

(۱) "Encyclopedia Britanica"; vol:9;pg:834

(۲) // // // // ;vol:12; pg :139

(۳) ثروت صولت؛ ''ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ''؛ ج:4؛ص:57

ردعمل کے طور پر عمان اور برطانیہ میں مختلف معاہدات طے پائے جن کی رُو سے عمان برطانیہ کا ''Protectorate'' قرار پایا۔(۱)

یورپی انتدابی خطے:

عراق:

عراق ۱۵۳۴ء میں عثمانی سلطنت کا حصہ بنا۔ ۱۹۱۶ء میں جب عربوں کی بغاوت شروع ہوئی تو ترک فوج کے عراقی افسر اس میں پیش پیش تھے۔ انگریزی فوجوں نے ترکوں کو بتدریج شکست دیتے ہوئے ۲۴ نومبر ۱۹۱۴ء کو بصرہ پر، ۱۱ مارچ ۱۹۱۷ء کو بغداد پر اور ۴ نومبر ۱۹۱۸ء کو موصل پر قبضہ کر لیا اور یوں انگریز پورے عراق پر قابض ہو گئے۔ عراقی راہنماؤں نے شریف حسین کے بیٹے عبداللہ کو عراق کا حکمران منتخب کر لیا لیکن برطانیہ نے اس انتخاب کو تسلیم نہیں کیا اور عربوں سے وعدہ خلافی کرتے ہوئے عراق کو براہِ راست اپنے انتظام میں لے لیا۔ یوں اس خطے پر برطانیہ نے اپنی عملداری قائم کر لی۔(۲)

شام:

جنگِ عظیم کے دوران ترکوں کے خلاف عربوں کی بغاوت اور عرب قوم پرستی کا سب سے بڑا مرکز شام ہی تھا۔ ترکوں کی شکست کے بعد اتحادی فوجیں شام میں داخل ہو گئیں۔ شام کی طرف سے اپنی آزادی اور شریف حسین کے بیٹے شاہ فیصل کی بادشاہت کا اعلان تسلیم کرنے سے اتحادیوں نے انکار کر دیا۔ برطانیہ اور فرانس اپنے طور پر عرب ملکوں کا آپس میں بٹوارا کر چکے تھے اور اس تقسیم کے مطابق عراق اور فلسطین انگریزوں کو اور شام فرانس کو دیا جا چکا تھا۔ فلسطین میں یہودیوں کو بسانے کا فیصلہ بھی ہو چکا تھا۔ عرب

---

(۱) "Encyclopedia Britanica"; vol:1; pg : 508

(۲) ثروت صولت: ''ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ''؛ ج:3؛ ص:348 تا 349

میں ان فیصلوں کے خلاف غم وغصے اور بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی۔ اس دوران فرانس نے شام کی نئی عرب حکومت سے فرانسیسی انتداب mendate قبول کرنے کا مطالبہ کیا اور اسی ہزار فرانسیسی فوج نے ۱۵ جون ۱۹۴۰ء کو دمشق پر حملہ کر دیا۔ شاہ فیصل فرانسیسی مطالبات منظور کرنے کو تیار تھا لیکن نئی فوجی حکومت کے وزیر جنگ یوسف بک العظم نے اس بے غیرتی اور غلامی کو گوارا نہ کیا۔ اس نے دو ہزار نیم مسلح نوجوانوں کے ساتھ فرانسیسی فوج سے ٹکر لے لی۔ ایک ایک کر کے یہ سب شہید ہو گئے۔ امیر فیصل فرار ہو گیا اور دمشق پر فرانس کا قبضہ ہو گیا۔ (۱)

لبنان:

موجودہ لبنان عثمانی دور میں شام کا حصہ تھا۔ یہاں عیسائی بھی بڑی تعداد میں آباد تھے۔ ان عیسائیوں کو ہمیشہ مغربی ممالک خصوصاً فرانس کی پشت پناہی حاصل رہی۔ ۱۸۶۴ء سے ۱۹۱۴ء تک کا دور لبنان میں مسیحی اداروں کی تبلیغی سرگرمیوں اور فری میسن افکار کے فروغ کا دور ہے۔ لبنانی مسیحی راہنماؤں نے عرب قوم پرستی کے افکار کو ہوا دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ نتیجتاً لبنان کے نوجوان طبقے نے جنگ عظیم چھڑنے کے بعد ترکوں کے خلاف بغاوت کا آغاز کیا۔ جنگ کے خاتمے پر شام پر فرانس کا قبضہ ہوا تو اس نے ۱۹۱۹ء میں شامی مسلمانوں کے سخت احتجاج کے باوجود اس خطے کو شام سے علیحدہ کر کے جمہوریہ لبنان کا نام دے دیا۔ فرانس نے شروع سے ہی لبنانی عیسائیوں کو مسلمانوں کے خلاف ابھارنے کی پالیسی اپنائی۔ (۲)

ثروت صولت اپنی کتاب میں حکومت فرانس کی جانب سے لبنان کے عیسائیوں میں تقسیم کیے جانے والے ہدایت نامے کو نقل کرتے ہیں:

---

(۱) ثروت صولت؛ ''ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ''؛ ج:3؛ ص:370

(۲) ایضاً؛ ص:402 تا 403

"اے یسوع مسیح کے بیٹو! یہ وطن آپ ہی کے لیے وجود میں آیا ہے۔۔۔آپ کو یقین کرنا چاہیئے کہ عیسائی کے معنی لبنانی کے ہیں اور صحرا سے آنے والے عربوں کو صحرا میں واپس جانا چاہیئے۔۔۔تفریح گاہوں اور سیاسی انتظامات پر قبضہ کرنے کی کوشش کیجئے اور جب آپ اکثریت میں ہو جائیں تو عربوں کو ان کی بستیوں سے نکال دیجیے۔۔۔"(۱)

اردن:

اردن بھی پہلی جنگِ عظیم تک عثمانی سلطنت میں شامل تھا اور انتظامی لحاظ سے فلسطین کا حصہ تھا۔ برطانیہ نے شریف حسین کے بیٹے عبداللہ کو اردن کا امیر تسلیم کیا لیکن اردن کو مکمل آزادی نہیں دی۔ شاہ عبداللہ سارا انتظام برطانوی مشیروں کی مدد سے انجام دیتا رہا۔(۲)

2۔ جزائر مالدیپ:

جزائر مالدیپ، سری لنکا کے جنوب مغرب میں چار سو میل کے فاصلے پر بحرِ ہند میں واقع ہیں۔ بارھویں صدی عیسوی میں یہاں کے باشندوں نے اسلام قبول کیا۔ جزائر مالدیپ پر یورپی استعماری حملوں کا آغاز پرتگال نے ۱۵۵۸ء میں کیا لیکن پندرہ سالوں کے اندر اندر ہی عوام نے پرتگالیوں سے آزادی حاصل کر لی اور ۱۵۷۳ء میں پرتگال اس خطے سے نکل گیا۔ سترھویں صدی میں ولندیزیوں نے سری لنکا پر قبضہ کیا تو وہیں سے مالدیپ کی سلطنت پر بھی اپنا اثر و نفوذ اور اقتدار قائم کیا۔ اس کے بعد جب سری لنکا پر انگریزوں کا تسلط ہوا تو مالدیپ کا انتظام بھی برطانوی حکومت کے زیر تسلط آ گیا۔ ۱۸۸۱ء میں ایک معاہدے کے تحت مالدیپ نے برطانیہ کے "Protectorate" کی حیثیت اختیار کر لی۔(۳)

---

(۱) ثروت صولت: "ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ"؛ ج:3؛ ص:405

(۲) ایضاً؛ ص:415 تا 416

(۳) "Encyclopedia Britanica"; vol: 7; pg:732

3۔ مشرق بعید:

مشرقِ بعید میں مسلمانوں کے اہم خطے ملائشیا، انڈونیشیا اور برونائی ہیں۔ تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی میں یہاں اسلام پھیلا اور یہ خطے عالمِ اسلام کا حصہ بنے۔ (۱) یہ خطہ چھوٹے بڑے ہزاروں جزیروں پر مشتمل ہے اور اسے جزیرہ نما ملایا بھی کہا جاتا ہے۔ حلقہ بگوشِ اسلام ہونے کے بعد اس خطے کی مختلف ریاستیں مختلف سلاطین کے زیرِ حکومت رہیں۔

۱۵۹۵ء میں ولندیزیوں نے موجودہ انڈونیشیا کے ایک مقام بانتن پر پہلی مرتبہ حملہ کیا لیکن شکست کھائی۔ اس وقت وہاں کا حکمران سلطان محمد ایک مضبوط اور طاقتور حکمران تھا۔ اس کی وفات کے بعد باہمی خانہ جنگی اور امراء کی نااہلی سے فائدہ اٹھا کر ولندیزیوں نے پھر بانتن کے معاملات میں دخل اندازی شروع کر دی اور ۱۶۸۲ء میں بانتن پر مکمل طور پر قابض ہو گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ دیگر ریاستوں میں ولندیزی گرم مصالحے کی تجارت کی اجارہ داری حاصل کرنے اور عیسائی مذہب کی تبلیغ واشاعت کی اجازت حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہو گئے۔ رفتہ رفتہ خطے کی ریاستوں کے سلاطین کی کمزوریوں اور خانہ جنگیوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ولندیزی اپنے اقتدار کو مضبوط کرتے چلے گئے۔ (۲)

اٹھارویں صدی میں اس خطے میں برطانیہ کا اثر ونفوذ بھی شروع ہوا اور موجودہ ملائشیا کی ریاستوں پر برطانیہ کا قبضہ ہو گیا۔ (۳)

جبکہ ۱۹۱۴ء تک ولندیزی اس تمام خطے کے اہم جزیروں پر قابض ہو چکے تھے جو موجودہ دور کا انڈونیشیا ہے۔

"By 1914 the Dutch controlled the islands of

---

(۱) ثروت صولت؛ ''ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ''؛ ج:2؛ ص:135

(۲) ایضاً؛ ص:342 تا 344

(۳) ایضاً؛ ج:3؛ ص:53

Sumatra, Bali, Java, Celebes and portions of New Guinea and Burneo"①

(1914 تک سماترا، بالی، جاوا اور Celebes کے جزائر نیز نیوگنی اور برنیو کے کچھ علاقے ولندیزیوں کے قبضے میں جاچکے تھے۔)

برونائی سولہویں صدی میں ایک طاقتور سلطنت تھی۔ سولہویں صدی کے آخر میں اس سلطنت کا زوال شروع ہوا اور انیسویں صدی میں کئی حصوں پر برطانیہ اور ہمسایہ ریاست ساراواک کے راجہ کا قبضہ ہو گیا۔ اور یہ مملکت ایک مختصر سے علاقے میں محدود ہو کر رہ گئی۔ ۱۸۸۸ء میں برونائی کی ریاست کو برطانیہ نے اپنے زیر انتظام لے کر برطانوی مملکت محروسہ قرار دیدیا۔②

4۔ برِصغیر:

برصغیر میں اسلام کی اشاعت کا آغاز پہلی صدی ہجری سے عرب تاجروں کے ذریعے ہو چکا تھا۔ اس کے بعد آٹھویں صدی عیسوی میں محمد بن قاسم کی فتح سندھ اور گیارھویں اور بارھویں صدی عیسوی میں محمود غزنوی اور شہاب الدین غوری کی فتوحات نے برصغیر میں اسلام کے عروج کا راستہ کھول دیا۔ گو ہندوستان مسلم اکثریت کا خطہ کبھی نہ بن سکا لیکن تقریباً ہزار سال تک یہ مسلمانوں کے زیر اقتدار رہا۔ جب دنیا میں یورپی استعمار کے دور کا آغاز ہوا تو برصغیر پر لودھی خاندان کی حکومت تھی۔ اسی کے دور میں پہلا یورپی بحری مہم جو واسکوڈے گاما ہندوستان پہنچا۔ اس کا تعلق پرتگال سے تھا۔ اس کے بعد ولندیزی، انگریز اور فرانسیسی بھی قسمت آزمائی کے لئے برصغیر میں آنا شروع ہو گئے۔ لودھی خاندان کے بعد مغلوں کا دور

---

①"Brasseys Encyclopedia of Military History and Biography"; Brasseys, Washington, London, 1994;pg: 218

② ثروت صولت؛ "ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ"؛ ج:3؛ ص:65

شروع ہوا۔ اس دور میں ہندوستان معاشی اور تہذیبی اعتبار سے ایسی بلندی کو پہنچ گیا کہ اسے دنیا میں "سونے کی چڑیا" کے نام سے جانا جانے لگا۔ کئی یورپی طاقتوں نے تجارت کی آڑ میں برصغیر کی سرزمین پر قدم جمانے کی کوشش کی لیکن برطانیہ کو یہاں سبقت حاصل رہی۔ برطانیہ کی ایسٹ انڈیا کمپنی نے مغل حکومت سے تجارت کی اجازت لے کر مختلف علاقوں میں اپنی تجارتی کوٹھیاں قائم کیں۔ آہستہ آہستہ ان کوٹھیوں کو قلعوں میں تبدیل کر دیا گیا۔ ①

اورنگزیب عالمگیر کے بعد جب مغل سلطنت کا زوال شروع ہوا تو حکمرانوں اور امراء کی خانہ جنگیوں اور نااہلیوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انگریز آہستہ آہستہ برصغیر کے مختلف علاقوں پر قابض ہوتے چلے گئے۔ کہیں انہوں نے مقامی امراء کی آپس کی لڑائیوں میں انہیں مالی اور عسکری امداد فراہم کر کے اپنے زیر اطاعت کیا اور کہیں براہِ راست عسکری کارروائیاں کر کے فتوحات حاصل کیں۔

انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کے خلاف برصغیر میں کئی مزاحمتی تحریکیں اٹھیں۔ ۱۷۵۷ء میں پلاسی کے مقام پر بنگال کے حکمران نواب سراج الدولہ نے انگریزوں کے خلاف جنگ کی جس میں بنگال کی فوج کو شکست ہوئی۔ اس کے بعد ہندوستان میں انگریز اقتدار کی بنیادیں مضبوط ہو گئیں۔ ②

جنوبی ہند کی ریاست میسور انگریزی اقتدار کے خلاف آخری دیوار ثابت ہوئی۔ میسور کے حکمران حیدر علی (۱۷۶۱ء تا ۱۷۸۲ء) نے اور پھر اس کے بیٹے ٹیپو سلطان (۱۷۸۳ء تا ۱۷۹۹) نے انگریزوں کا راستہ روکنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن ۱۷۹۹ء میں انگریزوں کے خلاف جنگ کرتے ہوئے ٹیپو سلطان کی شہادت ہوئی تو اس کے بعد انگریزی اقتدار کا راستہ روکنے والا کوئی نہ تھا۔ ③

---

① ثروت صولت: "ملتِ اسلامیہ کی مختصر تاریخ"؛ ج:2؛ ص:371

② ایضاً؛ ص:377

③ ایضاً؛ ص:385

۱۸۵۷ء میں برطانوی فوج کے مقامی ہندوستانی سپاہیوں نے انگریزوں کے خلاف بغاوت شروع کی جو رفتہ رفتہ ملک کے کئی علاقوں میں پھیل گئی لیکن باہمی نااتفاقی، نظم وضبط کی کمی اور کسی اہل راہنما کے نہ ہونے کی وجہ سے یہ بغاوت ناکام ہوئی۔ دہلی میں موجود آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے بیٹوں کے قتل اور خود بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری اور جلاوطنی کے بعد پورے برصغیر پر انگریزوں کی باقاعدہ حکومت قائم ہوئی اور یہ خطہ برطانوی نو آبادی بن گیا۔ ①

اشتراکی سامراجیت کا شکار: مسلم ترکستان

ترکستان کا خطہ پہلی صدی ہجری میں عرب کے نامور سالار قتیبہ بن مسلم کے ہاتھوں فتح ہونے کے بعد دائرہ اسلام میں داخل ہوا تھا۔ ② آج یہ خطہ مشرقی اور مغربی ترکستان میں منقسم ہے۔

مغربی ترکستان میں روس کی جارحانہ کارروائیوں کا آغاز سولہویں صدی عیسوی سے شروع ہوا۔ ترکستان میں روسیوں کی آخری فوجی کاروائی ۱۸۸۴ء میں مرو پر قبضے کے ساتھ ختم ہوئی۔ ③

ثروت صولت مغربی ترکستان پر روسی حملوں کے متعلق لکھتے ہیں:

"ان فوجی کارروائیوں کے دوران روسی ترکمانوں کے ساتھ جس وحشت اور بربریت کے ساتھ پیش آئے اور انہوں نے ترکمان عورتوں اور بچوں کا جس طرح قتل عام کیا اس کو خود مغربی مؤرخوں نے جدید تاریخ کے عظیم ترین جرائم

---

① سید حسن ریاض: "پاکستان ناگزیر تھا"؛ شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ، کراچی یونیورسٹی، کراچی، 1992؛ ص:29

② ڈاکٹر نذیر احمد پراچہ، "مسلمان مجاہدین" احمد پبلی کیشنز، لاہور، فروری 2007ء، 337 تا 340

③ ثروت صولت: "ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ"؛ ج:2 ص:430 تا 439

میں شمار کیا ہے"۔①

۱۹۹۰ء کی دہائی میں سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد یہاں کی مسلم ریاستوں کو آزادی نصیب ہوئی۔

مشرقی ترکستان پر چین نے ۱۸۶۰ء میں یلغار کر کے قبضہ کیا۔ ۱۸۶۵ء میں عظیم ترک راہنما یعقوب بیگ نے چین کو شکست دے کر مشرقی ترکستان کی آزاد حکومت قائم کی لیکن یعقوب بیگ کے انتقال کے بعد یہ خطہ پھر چین کے قبضے میں آ گیا۔ چین نے مشرقی ترکستان کو براہِ راست اپنی سلطنت میں ضم کر لیا جو اب چین کے صوبہ سنکیانگ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ آزادی کی متعدد کوششوں کے باوجود مشرقی ترکستان آج بھی چین کی غلامی میں ہے۔②

یوں بیسویں صدی کے شروعات میں حجاز، افغانستان، ایران اور ترکی کو چھوڑ کر دنیا بھر کے مسلمان کفار کی غلامی کے شکنجے میں کسے جا چکے تھے۔

ہنٹنگٹن کے مطابق:

According to one count some ninety -two acquisitions of Muslim territory by non-Muslim governments occured between 1757 and 1919.③

(ایک اندازے کے مطابق 1757 سے 1919 کے درمیانی عرصے میں مسلمان خطوں پر جو غیر مسلم قبضہ جات ہوئے اُن کی تعداد تقریباً بانوے [92] تھی۔)

---

① ثروت صولت: "ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ"؛ ج:2؛ ص:439

② ایضاً؛ ص:428 تا 430

③ Huntingtion; " The Clash of Civilizations....;" pg : 210

فصل سوم:

عالم اسلام پر استعماری تسلط کی وجوہات

سترھویں صدی عیسوی مسلم عروج کی آخری صدی تھی۔ اس سے قبل ایسا ہوتا رہا تھا کہ دنیا کے کسی ایک خطے میں اسلامی سطوت زوال کا شکار ہوتی تو کسی دوسرے خطے میں کوئی اور قوم کلمۂ توحید پڑھ کر آگے بڑھتی اور گرتے ہوئے علم کو تھام کر بلند کر دیتی مگر سترھویں صدی سے تو ساری امت مسلمہ کا ایسا زوال شروع ہوا کہ

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے[1]

لیکن مسلمانوں کا یہ زوال محض گردش دوراں کا نتیجہ یا محض اتفاق نہیں تھا۔ یہ سب خدائی قانون کی گرفت تھی جو ہماری اپنی بداعمالیوں کے سبب ہمارا مقدر ٹھہری تھی۔ ڈاکٹر اسرار احمد اپنی کتاب "سابقہ اور موجودہ مسلمان امتوں کا ماضی، حال اور مستقبل" میں مسلمانوں کے اس زوال پر بحث کرتے ہوئے اس بات پر زور دیتے ہیں کہ جس طرح بنی اسرائیل پر ان کے گناہوں کے سبب زوال کے دوادوار آئے بعینہ امت محمدیہؐ پر بھی زوال کے دوادوار آئے۔ اس میں پہلا دور تو صلیبی جنگوں اور پھر تاتاریوں کے ہاتھوں بغداد کی تباہی پر مشتمل تھا۔ جبکہ دوسرے دور کا آغاز ہسپانیہ کی مسلم حکومت کے خاتمے اور اسلامی دنیا پر استعماری قبضوں کا دور ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

---

[1] الطاف حسین حالی: "مسدسِ حالی"؛ تاج کمپنی لمیٹڈ، لاہور، س ن؛ ص: 9

”.....اُدھر یورپی استعمار کے سیلاب کی صورت میں امت مسلمہ پر عذاب الٰہی کے دوسرے اور نہایت طویل دور کا آغاز ہو گیا“۔ (۱)

صدیوں پر مشتمل اس غلامی کے اسباب اور وجوہات کا جائزہ لیں تو ہم انہیں دو عوامل کے ابواب کے تحت تقسیم کر سکتے ہیں:

1۔ اندرونی عوامل: یعنی امت کے اندر پیدا ہونے والی کمزوریاں اور نااہلیاں

2۔ بیرونی عوامل: یعنی یورپی استعماری طاقتوں کا لائحہ عمل، سازشیں اور تدابیر

اندرونی عوامل

حقیقت یہ ہے کہ کسی قوم کو زیر کرنا اس وقت تک ممکن ہی نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس قوم میں خود ہی ضعف، نااہلی اور ناعاقبت اندیشی پیدا نہ ہو جائے۔ اس لیے ہماری گردنوں میں غلامی کا ذلت آمیز طوق ڈالنے کے لیے دشمن کو موردِ الزام ٹھہرانے سے پہلے ہمیں خود اپنے گریبانوں میں جھانکنا پڑے گا۔ کیونکہ بیرونی قبضہ کار اس وقت تک کسی قوم کو غلام نہیں بنا سکتے جب تک کہ اس قوم کا جذبہ حریت اور ملی غیرت خود ہی سرد نہ پڑ جائے۔

بقول اقبال:

یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تو
مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے (۲)

مسلم عوام وخواص کی کمزوریاں جن کی بدولت مغرب انہیں اپنے استعماری شکنجے میں جکڑنے میں کامیاب ہوا ان کا مختصر جائزہ درج ذیل ہے۔

---

(۱) ڈاکٹر اسرار احمد؛ ”سابقہ اور موجودہ مسلمان.....“؛ ص: 37

(۲) علامہ اقبال؛ نظم: ”گلہ“؛ کتاب: ”ضرب کلیم“ (کلیاتِ اقبال)؛ ص: 664

1) کاہلی و بے عملی:

قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی زندگیوں کا مقصد غلبۂ اسلام تھا۔ وہ اللہ کے کلمے کو بلند کرنے کے لیے جہاد فی سبیل اللہ میں مشغول رہتے تھے۔ ان کے سامنے ایک اعلیٰ نصب العین تھا۔ اسی لیے وہ متحرک، محنتی اور جفاکش تھے لیکن دنیا کے ایک بڑے حصے پر مسلمانوں کا قبضہ ہو جانے اور دنیاوی مال و متاع کی فراوانی ہونے کے باعث اب مسلمانوں میں کاہلی و بے عملی رواج پا چکی تھی۔ اسی خدشے کا اظہار نبی کریم صلی اللہ علی وآلہ وسلم نے اپنی زندگی میں کیا تھا:

> "اللہ کی قسم مجھے تمہارے افلاس کا خوف نہیں ہے بلکہ خوف اس بات کا ہے کہ گذشتہ قوموں کی طرح تم کو بھی وسعتِ دنیا حاصل ہو جائے گی پھر جس طرح دنیا نے ان کو تباہ کر دیا تم کو بھی تباہ کر دے گی"۔ [1]

لہٰذا سترھویں صدی عیسوی تک یہ حال ہو چکا تھا کہ اسلام ایک رسمی مذہب بن چکا تھا۔ مسلمان حکمران شراب، موسیقی اور دنیاوی شان و شوکت کے دلدادہ ہو چکے تھے۔ قومی وسائل اور خزانے کا بڑا حصہ حکمرانوں کے عیش و عشرت کی نذر ہو جاتا تھا۔ قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں میں اب وہ اعلیٰ نصب العین، سادگی، جفاکشی اور جذبۂ جہاد متروک ہو چکا تھا۔

2) دنیا پرستی:

قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں میں آخرت کمانے کی فکر کی بجائے دنیا پرستی رواج پا چکی تھی۔ عزت اور ذلت کے معیار بدل چکے تھے۔ تاریخ گواہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب روم و ایران کی طاقتوں کو فتح کرنے نکلے تو ان کے سادہ لباس اور بوسیدہ میانوں میں پڑی

---

[1] بخاری، ابو عبداللہ، محمد بن اسماعیل الجعفی؛ "الجامع الصحیح"؛ کتاب الجزیہ والموادعۃ، باب: الجزیۃ والموادعۃ مع اھل الذمۃ الحرب

تلواریں دیکھ کر دشمن ان کا مذاق اڑاتے تھے۔ ① لیکن پھر بھی وہ درویش صفت، سادہ مزاج، فاقہ مست جانباز تھے جن کے ہاتھوں سے اسلام کو عروج اور اقبال نصیب ہوا تھا۔ اس کے برعکس قرونِ وسطیٰ کے مسلمان حکمرانوں کا کیا حال تھا اس کا اندازہ ہمیں تاریخ کے اس باب سے ہو جاتا ہے جس میں ہسپانیہ سے مسلمانوں کی دستبرداری اور ذلت آمیز شکست کا منظر بیان کیا گیا ہے:

> ''۲ جنوری ۱۴۹۲ء کو ایک طرف عیسائی فوجیں غرناطہ میں داخل ہوئیں تو دوسری جانب اسپین میں آخری مسلمان حکمران 'ابوعبداللہ محمد' اور اس کے اہل خاندان اور ساتھی، زرق برق ریشمی کپڑوں میں ملبوس اور ہیرے جواہرات سے لدے پھندے قصرِ الحمراء سے برآمد ہوئے''۔ ②

جس قوم کے حکمرانوں کی ذہنی پستی اور دنیا پرستی کا یہ عالم ہو کہ امت کے ماتھے پر ذلت آمیز شکست کا داغ لگاتے ہوئے وہ خود کو جواہرات سے مرصع کرلیں اس قوم کو پستی میں گرنے سے کون روک سکتا ہے؟

3) باہمی چپقلش:

پندرھویں صدی میں مسلمانوں کی سلطنت معلوم دنیا کے طول و عرض میں پھیل چکی تھی اور دنیا ان کی علمی، تہذیبی اور عسکری طاقت کا لوہا مانتی تھی لیکن بدقسمتی سے اس دور کے کچھ مسلم حکمرانوں کے نزدیک اسلام کی سربلندی سے زیادہ اہم مقصد ایک دوسرے کو نیچا دکھانا تھا۔ پندرھویں صدی کے آغاز میں دو مسلم حکمرانوں کی فتوحات کے ڈنکے بج رہے تھے۔ مشرق کی جانب امیر تیمور جو وسطی ایشیا کو اپنی سلطنت میں شامل کر کے ہندوستان پر

---

① اکبر شاہ خان نجیب آبادی؛ ''تاریخِ اسلام''؛ دارالاندلس، لاہور، س ن؛ ج ا:؛ ص:405

② خرم مراد؛ ''مغرب اور عالمِ اسلام''؛ ص:97

حملہ آور ہو چکا تھا۔① وہ چاہتا تو مشرق کی طرف بڑھ کر پورے چین کو اسلامی مملکت میں شامل کر کے کوریا، جاپان، تائیوان، فلپائن اور سارے مشرق بعید کو اپنی سلطنت میں شامل کر سکتا تھا۔ اور مغرب کی جانب عثمانی سلطان بایزید یلدرم جس کی تہلکہ خیز اور سریع یلغار کی وجہ سے اسے ''یلدرم'' یعنی آسمانی بجلی کا خطاب دیا گیا تھا۔ وہ یورپ میں نکوپولس کے میدان میں یورپ کی عظیم الشان متحدہ افواج کو عبرتناک شکست دیکر خود یورپ کے شہزادوں، امراء وحکام کے سامنے اس عزم کا اظہار کر چکا تھا کہ وہ ہنگری، آسٹریا، فرانس، جرمنی اور اٹلی کو فتح کر کے اٹلی کے شہر روما میں سینٹ پیٹر کی قربان گاہ میں اپنے گھوڑے کو دانہ کھلائے گا۔②

یہ دونوں فاتحین امیر تیمور اور بایزید یلدرم اگر اپنے اپنے محاذوں پر ڈٹے رہتے تو باآسانی اس وقت کی ساری معلوم دنیا پر اسلام کا پرچم لہرایا جا سکتا تھا۔ لیکن مسلمانوں کی شامتِ اعمال کہ یہ دونوں عظیم سپہ سالار آپس میں ٹکرا گئے۔ قیصر قسطنطنیہ نے جب یہ دیکھا کہ وہ عثمانیوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو قسطنطنیہ کی دیواروں تک پہنچنے سے نہیں روک سکتا تو اس نے امیر تیمور کو خط لکھ کر اسے بایزید کے متعلق یوں بھڑکایا کہ تیمور ہندوستان کے نو مفتوحہ ملک کو چھوڑ کر بایزید یلدرم کے خلاف محاذ آراء ہو گیا۔③

جولائی ۱۴۰۲ء (ذی الحجہ ۸۰۴ھ) یہ دونوں مسلمان افواج انگورہ کے مقام پر ایک دوسرے سے ٹکرا گئیں۔ اس جنگ میں بظاہر تیمور کو فتح اور بایزید کو شکست ہوئی لیکن نتائج کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ مسلمانوں کی شکست اور یورپ کی فتح تھی۔ اکبر نجیب آبادی اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

① نجیب آبادی: ''تاریخِ اسلام''؛ ج:2؛ ص:870

② ایضاً؛ ص:869

③ ایضاً؛ ص:871

''اس لڑائی کے نتائج عالم اسلام کے لیے بے حد ضرر رساں ثابت ہوئے اور یورپ جو اسلامی براعظم بننے والا تھا عیسائی بڑ اعظم بن گیا، انا للہ وانا الیہ راجعون''۔①

مفتی ابولبابہ شاہ منصور لکھتے ہیں کہ اگر یہ دونوں فاتحین مشرق اور مغرب میں اپنے اپنے محاذوں پر جمے رہتے تو مسلمان ''بعد کی صدیوں میں یورپی استعمار کے ہاتھوں محکومیت کی اس ذلت سے محفوظ رہ سکتے تھے۔ جس کے اثرات آج تک باقی ہیں''۔②

یہاں بے اختیار وہ واقعہ یاد آتا ہے جب سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی باہمی چپقلش کو دیکھتے ہوئے اس وقت کے قیصر نے مسلمانوں کے ان اختلافات کا فائدہ اٹھانے کا ارادہ کیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ پر حملے کیلئے لشکر تیار کیا۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو قیصر کی تیاریوں کا علم ہوا تو انہوں نے اسے خط لکھا کہ ہماری آپس کی لڑائی تمہیں کسی دھوکے میں نہ ڈال دے۔ اگر تم علی رضی اللہ عنہ پر حملہ آور ہوئے تو تمہاری سرکوبی کیلئے جو پہلا سردار آئے گا وہ معاویہ رضی اللہ عنہ ہوگا۔ قیصر یہ دھمکی سن کر ڈر گیا اور حملے سے باز رہا۔③ یہ تاریخ اسلامی کا ایک ایسا خوبصورت واقعہ ہے جو تمام مسلمان امراء اور حکمرانوں کو یہ درس دیتا ہے کہ آپس کے اختلافات کتنے ہی گہرے کیوں نہ ہوں، اسلام کے دشمنوں کو ان سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں دیا جانا چاہیے۔

4) غدارِ ملت:

ہماری امت کی ایک بہت بڑی بدقسمتی یہ بھی رہی کہ دشمنوں کو ہماری اپنی صفوں میں سے ہی اپنے کام کے بندے بھی ملتے رہے ہیں۔ وقتی مفاد اور مراعات کی خاطر خود

---

① نجیب آبادی: ''تاریخ اسلام''؛ ج:2؛ ص:877

② مفتی ابولبابہ شاہ منصور: ''ہسپانیہ سے امریکہ تک''؛ السعید کراچی، 2012؛ ص:25

③ نجیب آبادی: ''تاریخ اسلام''؛ ج:1؛ ص:660

مسلمانوں میں سے کئی بے ضمیر لوگوں نے اپنی قوم کی آزادی کو دشمن کے ہاتھ بیچ دیا۔ برصغیر میں انگریزوں کے خلاف مزاحمت کرنے والے بنگال کے نواب سراج الدولہ کو میر جعفر نے دھوکہ دیا اور در پردہ انگریزوں کے ساتھ مل گیا۔① اسی طرح شیر میسور سلطان ٹیپو کی صفوں میں میر صادق جیسے غدار پائے گئے جنہوں نے انگریز کی فتح میں اہم کردار ادا کیا۔②

5) دوست دشمن کی پہچان نہ ہونا:

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں واضح طور پر فرمادیا ہے کہ مسلمان یہود و نصاریٰ سے دوستی نہ رکھیں۔③

استعماری طاقتوں کا یہ ایک اہم حربہ رہا کہ وہ دوستوں، تاجروں، خیر خواہوں اور نجات دہندگان کا روپ دھار کر آئے اور مسلمان ان کے دھوکے میں آ گئے۔ جہاں جہاں مسلمان امراء آپس کی چپقلش کا شکار ہوئے وہ ایک دوسرے کے خلاف اپنی مدد کے لیے انہی یورپیوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے جو ان کی زمینوں اور ملکیتوں پر قبضہ کرنے آئے تھے۔ اندلس کے مسلم امراء مراکش کے مسلمان بادشاہ یوسف بن تاشفین کا اپنے ملک میں داخل ہو کر عیسائیوں کے خلاف جہاد کرنے میں تو بے عزتی محسوس کرتے تھے جبکہ عیسائیوں کو خراج دیتے انہیں کوئی شرم نہیں آتی تھی۔④

برصغیر میں بھی امراء و نواب اپنے حریفوں کو نیچا دکھانے کے لیے ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' کی ذلت آمیز شرائط مانتے رہے۔ مسلمان حکمرانوں اور امراء نے آپس کی جنگوں اور

---

① ثروت صولت: ''ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ''؛ ج: 2؛ ص: 377

② ایضاً: ص: 385

③ المائدہ: 5: 51

④ نجیب آبادی: ''تاریخ اسلام''؛ ج: 2؛ ص: 610

لڑائیوں میں وقتی فتح کی خاطر اپنی زمینیں اور جاگیریں خود استعماری حملہ آوروں کے سپرد کر دیں۔ ہمارے حکمران ان یورپی تاجروں کی نیت بھانپنے میں ناکام رہے جو تجارت کی آڑ میں ہمارے ملکوں کی زمینوں پر غلامی کے جال بچھاتے رہے۔ پھر بیسویں صدی کے آغاز میں کئی عرب ریاستوں نے خلافت عثمانیہ کا حصہ بننے کی بجائے خود کو برطانیہ کے ''زیر حفاظت'' دے دینا پسند کیا۔

5) حکومتی معاملات میں عورتوں کی دخل اندازی:

عورتوں کا سلطنت کے معاملات میں دخل دینا اور اہم فیصلوں پر اثر انداز ہونا بھی مسلم حکومتوں میں ایک عام بات ہو چکی تھی۔ ایک طرف تو عثمانی سلاطین کے حرم میں باقاعدہ یورپی سازش کے تحت عیسائی عورتیں داخل کی گئیں جنہوں نے ان سلاطین کو ام الخبائث کی لت ڈالی۔ پہلا عثمانی سلطان جو شراب کی لت کا شکار ہوا وہ بایزید یلدرم تھا اور یہ لت اس کی ایک عیسائی بیوی نے اسے ڈالی تھی۔ (1)

مغل بادشاہ جہانگیر کی ملکہ نور جہاں بھی پوری طرح سلطنت کے معاملات میں دخیل تھی چونکہ بادشاہوں کے حرم میں کئی عورتیں ہوتی تھیں تو اپنے بیٹوں کو ولی عہد بنوانے کے لیے سازشیں اور جوڑ توڑ بھی معمول کی بات بن چکی تھی۔ مغل بادشاہ اکبر کی بیویوں میں ہندو رانیاں شامل تھیں۔ جن کی بدولت اکبر پر ہندو اثر و رسوخ بہت زیادہ تھا۔ جزیرہ نما ملایا میں ''آچیہ'' کی ریاست پر تقریباً ساٹھ سال مسلسل عورتوں کی حکومت رہی۔ (2)

ثروت صولت لکھتے ہیں:

''عورتیں سلطنت کے معاملات کو گھروں کے معاملوں کی طرح سمجھ کر ہر بات میں دخل دیتی تھیں۔'' (3)

---

(1) ثروت صولت: ''ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ''، ج:2، ص:204

(2) ایضاً، ص:346

(3) ایضاً، ص:353

جبکہ نبی ﷺ کا واضح فرمان ہے کہ عورت کو حکمران بنانے والی قوم کبھی فلاح نہیں پاسکتی۔(1)

6) اخلاقی اور علمی زوال:

مسلمانوں کا اخلاقی اور علمی زوال تو اگرچہ تباہی بغداد کے بعد سے ہی شروع ہو گیا تھا لیکن سترھویں صدی میں تو وہ انتہائی پستی میں پہنچ گئے تھے۔ وقتی طور پر کوئی دیندار اور علم دوست حکمران آجاتے تو معاملات تھوڑے سنبھل جاتے لیکن اُن کے بعد پھر وہی حالت ہو جاتی۔ مسلمانوں میں موسیقی، شعروشاعری اور اعلیٰ تعمیرات کا ذوق تو خوب رہا لیکن اخلاقی زوال کا عالم یہ تھا کہ رشوت، امراء کا باہمی حسد، سازشیں اور بددیانتی عام تھی۔ عہدے یا تخت وتاج کے لیے ہر حد سے گزرنا جائز سمجھا جاتا تھا۔ طویل فتوحات، امن وامان اور دنیاوی فراوانی نے امرا، فوج اور رعایا سب کو آرام طلب اور عیش پسند بنا دیا تھا۔

مسلمانوں کے دورعروج میں علمی ترقی کا یہ حال تھا کہ ایک ہی عالم بیک وقت کئی علوم کا ماہر ہوتا تھا لیکن اب مسلمانوں پر علمی جمود طاری ہو چکا تھا۔ اور یہ وہ دور تھا جب یورپ مسلمانوں کے علوم اور سائنسی تجربات سے فائدہ اٹھا کر اس میں مزید پیش رفت کر رہا تھا اور سائنسی وعلمی میدان میں بہت آگے پہنچ چکا تھا۔ جبکہ مسلمانوں کا حال یہ تھا کہ اجتہاد اور غور وفکر کی بجائے تقلید اور ذہنی جمود ان کے کردار کا حصہ بن چکے تھے۔

7) عسکری زوال:

اخلاقی اور علمی زوال کے ساتھ عسکری زوال لازم ہے۔ مغرب اپنی محنت، نظم وضبط اور ریسرچ کے ذریعے اسلحہ سازی، جہاز رانی، سیاحت، علم طب غرض ہر میدان میں مسلمانوں کو پیچھے چھوڑ چکا تھا اور مسلمانوں کی صلاحیتیں محض شعروشاعری اور فن تعمیرات تک

---

(1) بخاری: "الجامع الصحیح"؛ کتاب المغازی، باب: کتاب النبیؐ الی کسریٰ وقیصر

محدود ہو کر رہ گئی تھیں۔

اس سلسلے میں اکثر علماء کا کردار بھی بہت منفی رہا اور وہ جدید دور کی سائنسی تحقیقات اور ایجادات سے فائدہ اٹھا کر اپنے دفاع کو مضبوط بنانے کی بجائے ان کے خلاف کفر کے فتوے دیتے رہے۔ مولانا مودودی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ انیسویں صدی کے آغاز میں عثمانی بادشاہ سلطان سلیم نے جدید سائنسی خطوط پر سلطنت اور عسکری تنظیم کرنی چاہی تو علماء نے شدید مخالفت کی:

> ''جاہل صوفیوں اور تنگ نظر علماء نے مذہب کے نام پر اصلاحات کی مخالفت کی۔۔۔ سنگین تک کے استعمال کی اس لیے مخالفت کی گئی کہ کافروں کے اسلحے استعمال کرنا ان کے نزدیک گناہ تھا۔''[1]

8) اسلامی دنیا کی تقسیم:

اسلامی دنیا مختلف وحدتوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ ثروت صولت لکھتے ہیں کہ ایران میں ایل خانی حکومت کے مظالم اور صفوی حکومت کے شیعت میں غلو کی وجہ سے نہ صرف ایران بلکہ ترکستان اور اسلامی ہند بھی باقی اسلامی دنیا سے کٹ گئے۔[2] لہٰذا اسلامی دنیا دو ایسے حصوں میں تقسیم ہو گئی جن کے درمیان صرف سمندر کے راستے ربط قائم ہو سکتا تھا اور ایک حصے کے افکار، خیالات، تاریخ، مسائل اور علوم دوسرے حصے تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ مسلمانوں کے درمیان ''جسد واحد'' کا تصور کم ہوتا جا رہا تھا۔ اپنے اپنے مقامی مسائل اور معاملات میں الجھے ہوئے مسلمان حکمران، امراء اور عوام کسی دوسرے خطے کے مسلمانوں پر ٹوٹنے والی افتاد کو ''عالم اسلام'' پر ٹوٹنے والی مصیبت تصور نہیں کرتے تھے۔

---

[1] مودودی؛ ''تنقیحات''؛ ص:83

[2] ثروت صولت؛ ''ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ''؛ ج:2؛ ص:359

9) عربی زبان کی اہمیت میں کمی:

عربی زبان تمام دنیا کے مسلمانوں کی زبان بننے کی بجائے صرف دینی علوم کی زبان بن کر رہ گئی تھی۔ ترکی اور فارسی کو سرکاری اور دفاتر کی زبان قرار دیا گیا یوں عربی زبان کے فروغ کی وجہ سے امت میں وحدت کا جو تصور پیدا ہو سکتا تھا وہ نہیں ہوا۔ نیز اگر کہیں تھوڑا بہت علمی کام ہوا بھی تو اس سے صرف مقامی لوگوں کو فائدہ ہوا اور علوم ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل نہ ہو سکے۔ عربی زبان کی اہمیت میں کمی کا ایک اور بڑا نقصان یہ بھی ہوا کہ قرآن کا مقصد صرف تلاوت اور برکت ہی رہ گیا۔ قرآن کو سمجھ کر خود کو اس کے مطابق ڈھال لینے کا تصور متروک ہو گیا۔

بیرونی عوامل

وہ عوامل جن کی بدولت یورپی اقوام پندرھویں اور سولھویں صدی عیسوی میں اپنے براعظم سے نکل کر ساری دنیا پر چھا گئیں ان کا مختصر جائزہ درج ذیل ہے۔

1) یورپی نشاۃِ ثانیہ:

قرنِ اول کا دور یورپ کی تاریخ کا ''سیاہ دور'' (Dark Ages) سمجھا جاتا ہے۔ یہ کم علمی، جہالت، تنگ نظری اور توہمات کا دور تھا۔ سفری سہولیات کی کمیابی اور جاہلی توہمات کی بدولت لوگ لمبے سفر سے گھبراتے تھے۔ لیکن یورپ کی نشاۃِ ثانیہ کے ساتھ ہی یورپی اقوام میں علم، سائنس اور تحقیق کا مزاج پیدا ہوا، علم جغرافیہ، اسلحہ سازی اور جہاز رانی میں ترقی ہوئی خوف اور توہمات کی جگہ تجسس اور ایڈونچر پسندی نے لے لی۔ مارکو پولو کے سفرنامے نے بھی یورپ کے لوگوں میں سفر کا شوق اور نئی نئی دنیائیں دیکھنے کا جذبہ پیدا کیا۔ پھر نئے نئے تجربات اور تحقیقات کے نتیجے میں یورپی اقوام نے عملی اور علمی جمود کی شکار مسلم اقوام پر واضح برتری حاصل کر لی۔

2) یورپی حکمرانوں کی ذاتی دلچسپی:

کئی یورپی حکمرانوں نے اس ضمن میں ذاتی دلچسپی لے کر اپنے جہاز رانوں کی حوصلہ افزائی کی۔ ان میں پرتگال کا شہزادہ ہنری سرفہرست ہے جسے جہاز رانی اور علم جغرافیہ میں حد درجے دلچسپی کی وجہ سے Henry the Navigator کہا جاتا ہے۔ اس کی ذاتی کوششوں اور حوصلہ افزائی کی بدولت واسکوڈے گاما نے نئے بحری راستوں کی دریافت میں کامیابی حاصل کی۔ (۱) نیز کولمبس کا تاریخی سفر جس میں اس نے براعظم امریکہ دریافت کیا اس کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ یہ سپین کی ملکہ ازابیلا کی ذاتی دلچسپی اور مدد کی بدولت ممکن ہوا۔ (۲) حکمرانوں کے علاوہ کئی مخیر حضرات بھی اس کام کے لئے جہاز رانوں کو دل کھول کر امداد فراہم کرتے تھے۔

3) نئے راستوں کی تلاش:

اس دور میں خشکی اور سمندر کے معلوم تجارتی راستوں پر مسلمانوں کی اجارہ داری تھی۔ لہٰذا نئے تجارتی راستوں کی تلاش یورپ کی ایک اہم ضرورت تھی۔ اسی جدوجہد کے نتیجے میں وہ دور دراز کے مسلم خطوں تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔

4) مذہبی عوامل:

یورپی اقوام کا دیگر خطوں اور قوموں کی طرف عازم سفر ہونے کے پیچھے مشنری اور صلیبی عناصر بھی کارفرما تھے۔ انسائیکلو پیڈیا بریٹینیکا میں پرتگال کے شہزادہ ہنری (The Navigator) کے سفری شوق اور دلچسپی کے جو محرکات بتائے گئے ہیں ان میں سے ایک

---

(۱) "Encyclopedia Britanica";vol:15; pg:860

(۲) ''اردو انسائیکلو پیڈیا''؛ فیروز سنز؛ ص:74

یہ بھی تھا کہ ایک صلیبی جنگجو ہونے کی حیثیت سے وہ شمالی افریقہ کے عرب خطوں پر حملے کے لیے بھی راستہ تلاش کرنے کا خواہشمند تھا۔ (۱)

عیسائیت کی ترویج و تبلیغ استعمار کا ایک اہم محرک رہی ہے۔

خود ایک مغربی مصنفہ کا کہنا ہے کہ:

"As colonialism advanced missionery activties expanded." (۲)

(جیسے جیسے استعماری نظام ترقی کرتا گیا عیسائیوں کی تبلیغی سرگرمیاں بھی بڑھتی گئیں۔)

ممتاز کالم نگار اوریا مقبول جان اپنے ایک کالم میں لکھتے ہیں:

''انگریز، فرانسیسی اور ولندیزی قومیں پوری دنیا کو صرف تجارتی مقاصد اور توسیع سلطنت کے لیے فتح کرنے نہیں نکلی تھیں بلکہ ساتھ ساتھ عیسائی مشنریوں کی منظم کوشش بھی تھی کہ مسلم دنیا کو کیسے عیسائی بنایا جا سکتا ہے.... انہوں نے پوری دنیا میں چھ علاقوں کو منتخب کیا جہاں مسلمانوں کے مقابلے میں عیسائیت کی ترویج کی جا سکتی تھی۔ (1) ہندوستان، (2) انڈونیشیا اور ملائشیا وغیرہ (3) مشرق وسطی، (4) شمالی افریقہ یعنی مصر، سوڈان، مراکش وغیرہ۔ (5) افریقہ یعنی ایتھوپیا، کینیا، تنزانیہ وغیرہ، (6) چین۔ بارھویں صدی سے انیسویں صدی تک حکومت خواہ کسی کی بھی ہوتی ان تینوں ملکوں کی عیسائی مشنریاں اپنے مشن میں ایک ساتھ مل کر کام کرتیں۔'' (۳)

5) صنعتی انقلاب:

اٹھارویں صدی میں یورپ میں صنعتی انقلاب آیا تو اپنی صنعتوں کے لیے سستے خام

---

(۱) "Encyclopedia Britanica";vol:18;pg:860

(۲) Ania Loomba; "Colonialism / Post colonialism";pg:100

(۳) اوریا مقبول جان؛ کالم: ''افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی''؛ کتاب: ''حرف راز۔1''؛ سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، 2011؛ ص:40

مال کی فراہمی اور اپنی مصنوعات کے لیے منڈیوں کی تلاش نو آبادیاتی نظام کو فروغ دینے کا بہت بڑا محرک بنی۔ افریقہ اور ایشیا کی زرخیز زمینوں کی زرعی پیداوار کو خام مال اور خوراک کے طور پر یورپ کی فیکٹریوں میں پہنچا دیا جاتا اور اسی خام مال سے تیار شدہ مصنوعات کو نو آبادیاتی خطوں کے بازاروں اور منڈیوں میں من چاہی قیمتوں پر بیچا جاتا۔ جبکہ اکثر افرادی قوت کی کمی کو بھی ان ہی نو آبادیات کے غریب اور بے بس عوام کے ذریعے پورا کیا جاتا تھا۔ لہٰذا ان کالونیوں کے وسائل مکمل طور پر ان کے یورپی آقاؤں کی دسترس میں تھے اور یورپی عوام کی فلاح و بہبود اور ضروریات کے لیے ہی استعمال ہوتے تھے۔

"As producers of raw materials they (colonies) served their owners by freeing them from dependence on European supplies .... conversely, colonies provided uniquely favorable markets for European exporters...."[1]

(ان نو آبادیات نے اپنے آقاؤں کو خام مال کی فراہمی کے معاملے میں بے فکر کر رکھا تھا۔ دوسری طرف یہی نو آبادیات یورپی ممالک کی مصنوعات کے لیے اہم منڈیاں بھی ثابت ہوتی تھیں۔)

یہی وجہ تھی کہ استعماری طاقتوں نے اپنے زیر قبضہ نو آبادیات میں جتنی بھی زرعی اصلاحات کیں ان کا مقصد مقامی لوگوں کو فائدہ پہنچانے کی بجائے اپنی صنعتوں کے لیے خام مال اور اپنے عوام کے لیے خوراک کی فراہمی ہی تھا۔ انسائیکلو پیڈیا بریٹینیکا کے مطابق:

[1] "International Encyclopedia of the Social Sciences"; The Macmillon Company and The Free Press, New York, Collier-Macmillon Publishers, London, 1972;vol:3; pg:7

"Not only did the new industrialism generate a voracious appetite for raw meterials but food for the swelling urban population was also sought in the far corners of the world."(1)

(صنعتی ترقی کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ خام مال کے حصول کا لالچ خوفناک حد تک بڑھ گیا بلکہ بڑھتی ہوئی شہری آبادی کی خوراک کا انتظام بھی ان دور دراز کے علاقوں سے کیا جانے لگا۔)

6) سرمایہ دارانہ نظام:

یورپ کی صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ وہاں سرمایہ دارانہ نظام نے جنم لیا۔ اس سرمایہ دارانہ نظام کی آبیاری بھی انہیں نوآبادیات کے وسائل سے کی گئی۔ جان میک لیڈ لکھتے ہیں:

"Colonialism and capitalism share a mutually supportive relationship with each other."(2)

(استعمار اور سرمایہ دارانہ نظام ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔)

اشتراکی نظام کے علمبردار تو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ نوآبادیاتی نظام درحقیقت سرمایہ دارانہ نظام کی ہی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔(3)

اینیالومبا لکھتی ہیں:

"European colonialism involved a variety of techniques and patterns of domination.... all of them

---

(1)"Encyclopedia Britanica";vol:18; pg:880

(2)John Mcleod; "Beginning Post Colonialism"; pg:9

(3)"The Fontana Dictionary of Modern Thought"; Fontana Press, London,1988; pg:410

produced the economic imbalance that was necessary for the growth of European capitalism and industry. Thus we could say that colonialism was the midwife that assisted at the birth of European capitalism or that without colonial expension the transition to capitalismn could not have taken place in Europe."①

(یورپی استعمار نے اپنا غلبہ قائم کرنے کے لیے کئی طریقے اور راستے اپنائے۔ ان سب اقدامات کی وجہ سے معاشی ناہمواریاں پیدا ہوئیں جو یورپ کے سرمایہ دارانہ اور صنعتی نظام کے لیے ضروری تھیں لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ نوآبادیاتی نظام نے درحقیقت ایک ایسی دائی کا کردار ادا کیا جس نے یورپ کے سرمایہ دارانہ نظام کو جنم دینے میں مدد کی اور نوآبادیاتی توسیع کے بغیر یورپ میں سرمایہ دارانہ نظام کبھی رو پذیر نہیں ہو سکتا تھا۔)

یہی وجہ تھی کہ یورپ میں سرمایہ دارانہ نظام جتنی ترقی کرتا گیا مزید نوآبادیات کی تلاش اور ان کے وسائل کے استحصال کا عمل بھی تیز ہوتا گیا۔

Compton's Encyclopedia نے یورپ کے استعماری اقدامات کی آٹھ وجوہات بیان کی ہیں:

(1) To get control of trade already existing between a territory and the rest of the world (2) to increase the conquering nations food supply, (3) to get possession of precious metals, gems or raw meterials, (4) to get a market in the colony (5) to provide an out let in the colony for a surplus population (6) to take

---

① Ania Loomba;"Colonialism /Post Colonialism";pg:9

advantage of the cheap labour of native peoples, (7) to establish naval and military basis and (8) to recruit natives for the army.[1]

(☆ زیر تسلط علاقوں کی دیگر دنیا کے کے ساتھ پہلے سے جاری تجارت پر قبضہ
☆ فاتح اقوام کے لیے خوراک کی فراہمی
☆ قیمتی دھاتوں، پتھروں اور خام مال کا حصول
☆ اپنی کالونیوں میں اپنی مصنوعات کی مارکیٹ
☆ اپنی بڑھتی آبادیوں کے لیے جگہ کا حصول
☆ نوآبادیات کی مقامی آبادی سے سستے مزدوروں کی فراہمی
☆ بحری اور عسکری اڈوں کا قیام
☆ مقامی افراد سے فوجی خدمات کا حصول)

[1] "Compton's Encyclopedia";pg:442

فصل چہارم:

استعماری حربے اور طریقے

استعماری حربوں اور طریقوں کے جائزے کے لیے ہم انہیں دو عنوانات کے تحت تقسیم کر سکتے ہیں:

1)۔ کسی خطے کو اپنی نوآبادی بنانے کے طریقے اور حربے۔

2)۔ اپنے قبضے کو برقرار رکھنے کے طریقے اور حربے۔

استعماری طاقتوں نے اپنے اہداف ممالک کے حالات، کمزوریاں، خوبیاں اور خامیاں سامنے رکھتے ہوئے مختلف ممالک کو اپنی غلامی میں جکڑنے کے لیے مختلف طریقے اپنائے ہیں۔ جان مک لیڈ اپنی کتاب Beginning Post Colonialism میں رابرٹ ینگ کا قول نقل کرتے ہیں:

"Colonialism involved an extraordinary range of different forms and practices carried out with respect to radically different cultures over many different centuries."(1)

(نوآبادیاتی نظام میں بے شمار مختلف طریقے اور حربے کارفرما رہے مختلف معاشروں اور مختلف ادوار کے حالات کے مطابق اِن کا تعین ہوتا رہا۔)

نوآبادی بنانے کے استعماری طریقے اور حربے

استعماری قوتوں نے مختلف ممالک کو اپنی نوآبادی بنانے کے لیے جن مختلف حربوں کو استعمال کیا ان کا مختصر جائزہ حسب ذیل ہے:

---

(1) John Mcleod: "Beginning Post Colonialism";pg:9

1۔ تجارت:

کئی یورپی نو آبادیاں ایسی ہیں جہاں یورپی اقوام ابتدائی طور پر تو تجارت کی غرض سے مقیم ہوئیں لیکن مقامی حکومتوں کی کمزوریاں بھانپ کر تجارت کی آڑ میں ملک پر قبضہ جمانے کی کوشش شروع کر دیں۔ مثلاً برطانیہ کی ایسٹ انڈیا کمپنی نے برصغیر میں تجارتی مقاصد کے لیے کوٹھیاں بنائیں پھر ان کوٹھیوں کو رفتہ رفتہ قلعوں میں تبدیل کر دیا اور بظاہر تجارتی سرگرمیوں کے در پردہ اپنے اثر و رسوخ اور قوت کو بڑھاتے رہے۔ اسی طرح لیبیا میں تجارت کی غرض سے آباد اطالوی باشندوں کی حفاظت کے بہانے سے اٹلی نے لیبیا میں دراندازی شروع کی۔

2۔ مقامی گروہوں اور امراء کی چپقلش کا فائدہ:

مقامی آبادی کے امراء و حکمران وغیرہ کی باہمی چپقلش اور جھگڑوں کا فائدہ یوں اٹھایا کہ دونوں اطراف کے فریقین کو اسلحہ، قرضہ اور فوجی امداد مہیا کر کے بدلے میں ان کے کسی علاقے کو اپنی تحویل میں لے لیا جاتا یا کسی ایک امیر، سردار یا حکمران کی مدد کر کے اُسے دوسرے پر فتح دلوائی تو فتح پانے والا شخص حکمران بننے کے باوجود اپنے مددگاروں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن کر رہا۔ یہ طریقہ خصوصاً برصغیر میں بہت بڑے پیمانے پر اختیار کیا گیا۔ کئی حکمران، نواب اور امراء اسی طرح ایک ایک کر کے اپنی جاگیروں اور علاقوں سے محروم ہوتے چلے گئے کیونکہ انہوں نے انگریزوں کی من مانی شرائط پر ایک دوسرے کے خلاف انگریزوں کی مدد لی تھی۔

3۔ قرضوں کی فراہمی:

کئی حکمرانوں نے اپنے ذاتی تعیش کی خاطر یا ''ملک و قوم کے مفاد کے لیے ترقیاتی منصوبوں'' کی مد میں یورپی حکومتوں سے قرضے لے رکھے تھے۔ ان قرضوں کی

بروقت ادائیگی نہ کرنے پر یورپی اقوام کو ایسے ملک میں دخل اندازی کا موقع مل جاتا تھا۔ مثال کے طور پر تونس میں یورپی ممالک کی مداخلت اسی بدولت شروع ہوئی تھی۔

4۔ رشوت اور لالچ:

جہاں کہیں یورپ کے استعماری عزائم کے خلاف کوئی مقامی عہدیدار یا حکمران ڈٹ جاتا اور اسے میدان میں شکست دینا مشکل ہو جاتا وہاں یہ ''مہذب'' یورپی اقوام ایسے جانبازوں کی صفوں میں موجود اہم افراد کو رشوت یا حکومت کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیتیں۔ مثال کے طور پر برصغیر میں جب میسور کے نواب ٹیپو سلطان نے انگریزی عزائم کی شدید مزاحمت کی اور ان کے سامنے جھکنے پر راضی نہ ہوئے تو انگریزوں نے سلطان کے ایک اہم کارندے میر صادق کے ساتھ درپردہ ساز باز کر کے اسے اپنے ساتھ ملا لیا اور اسے سلطان کے ساتھ غداری پر راضی کر لیا۔

5۔ عسکری کارروائیاں:

کئی مزاحمتی تحریکوں کو عسکری کارروائیاں کر کے کچلا گیا۔ چونکہ یورپی حملہ آور عسکری صلاحیتوں کے اعتبار سے بہت آگے تھے لہٰذا مزاحمت کاروں کے لیے ان کا مقابلہ بہت مشکل تھا۔ برصغیر میں جنگ پلاسی اور میسور کی جنگیں، لیبیا میں سنوسی حریت پسندوں کے خلاف اٹلی کی کارروائیاں یورپی عسکری اقدامات کی اہم مثالیں ہیں۔

6۔ انتدابی (Mendates) اور زیر حفاظت علاقے (Protectorates)

پہلی جنگ عظیم کے بعد کئی مسلم خطوں کو mendates کے نام پر یورپی طاقتوں کے سپرد کر دیا گیا مثلاً عراق، برطانیہ اور شام فرانس کے قبضے میں آ گیا۔ اس کے علاوہ کئی عرب خطے ایسے تھے جو انیسویں صدی میں یورپ کے ''زیر حفاظت'' آ گئے۔ یہ mandates اور protectorates بھی ''استعمار'' کی ہی مختلف شکلیں تھیں کیونکہ ان ممالک کے تمام

معاملات درحقیقت انہی یورپی طاقتوں کے ہاتھوں میں ہوتے تھے۔حکومت بظاہر تو وہاں کے مقامی عربوں کے ہاتھ میں ہوتی تھی مگر تمام اختیارات حقیقتاً یورپی آقاؤں کے پاس ہوتے تھے۔پہلی جنگ عظیم کے بعد عراق پر انگریزوں کے قبضے پر تبصرہ کرتے ہوئے نوم چومسکی لکھتا ہے۔

"Britain's rule should be 'veiled' behind such constitutional fictions as a protectorate, a sphere of influence, a buffer state, and so on... The idea is to have independent states, but with weak government that must rely on the imperial power for their survival..."(1)

(برطانیہ کو کسی پردے کے پیچھے رہ کر اقتدار کی ڈوریاں ہلانی ہیں مثال کے طور پر کوئی آئینی شق کا ڈرامہ یا زیر نگرانی علاقہ وغیرہ۔۔۔یعنی بظاہر تو ایک ریاست آزاد نظر آئے لیکن اس کی حکومت اتنی کمزور ہو کہ اپنی بقا کے لیے سامراجی قوتوں پر انحصار کرے۔)

7۔ پھوٹ ڈالنا:

مقامی آبادی کے نسلی،لسانی اور مذہبی گروہوں میں پھوٹ ڈلوا کر "divide and rule" کا فارمولا بھی استعماری طاقتوں کا اہم ہتھکنڈہ رہا ہے۔خصوصاً ان خطوں میں یہ ہتھکنڈہ بہت کامیاب رہا جہاں پہلے ہی مختلف نسلوں یا عقائد کے لوگ بستے تھے۔

دی آکسفورڈ ہسٹری آف اسلام کے مطابق:

"Colonial administrations also enconraged rivalry

(1)Noam Chomsky;"Conversations with Noam Chomsky on the Post 9/11 World"; interviews with David Barsamivan, Hamish Hamilton (an imprint of) Panguin Books London, 2005; pg:45

among diverse ethnice, linguistic and religious communities. Such rivalries preoccupied the various communinties, diverting their attention from the question of colonialism."①

(استعماری حکومتوں نے اپنی نو آبادیات میں متنوع نسلی ،لسانی اور مذہبی رقابتوں کو ہوا دی۔ ان ہی باہمی رقابتوں میں الجھ کر مقامی آبادیوں کا دھیان استعماری طاقتوں کے عزائم سے ہٹ گیا۔)

قبضے کو برقرار رکھنے کے طریقے اور حربے

ایک بار کسی خطے پر استعماری قبضہ قائم ہو جاتا تو اسے برقرار رکھنے کے لئے کئی طریقے اختیار کیے جاتے۔

1۔ ظلم و ستم:

مقامی آبادیوں پر ظلم کے پہاڑ توڑنا اور مزاحمت اور بغاوت کرنے والوں کو عبرت ناک سزائیں دینا، انہیں تشدد کا نشانہ بنانا، استعماری طاقتوں کا وطیرہ رہا۔

روبن کیلی Discourse on Colonialism کے تعارف میں لکھتے ہیں:

" The instruments of colonial power rely on barbaric, brutal violence and intimidation."②

(استعماری طاقتوں کے حربے وحشیانہ، ظالمانہ اور دھونس دھاندلی پر مشتمل ہوتے ہیں۔)

---

①"The Oxford History of Islam"; Oxford University Press, Oxford,1999;pg:581

②Robin Kally: (Introduction of "Discourse on Colonialism" by Aim'e Cesaire);pg:9

ان ''مہذب اقوام'' نے احساسِ برتری کے نشے میں چور ہوکر اپنی نوآبادیات کے نہتے اور بے بس عوام پر جو انسانیت سوز تشدد روا رکھا وہ یورپی تاریخ کا ایک سیاہ باب ہے۔

ہنٹنگٹن اپنی مشہور زمانہ تصنیف ''The Clash of Civilizations'' میں استعماری طاقتوں کے ظلم وتشدد پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

" The west won the world not by the superiority of its ideas or values or religion but rather by its superiority in applying organized violence."(1)

(مغرب نے کسی نظریاتی برتری، اعلیٰ اقدار یا مذہب کی بدولت دنیا کو فتح نہیں کیا تھا بلکہ یہ ایک منظم تشدد کی برتری تھی۔)

یوں یورپی استعمار کی ''تہذیب'' اور برتر اخلاقیات کے غبارے سے خود مغربی دانشور ہوا نکالتے ہیں۔

2۔ قتل وغارت گری:

اپنے شکنجے کو مضبوط رکھنے کے لئے استعماری طاقتیں کبھی بھی بڑے پیمانے پر قتل وغارت گری سے نہیں ہچکچائیں۔ جلیانوالہ باغ میں جنرل ڈائر کا سفاکانہ اقدام اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔(2) افریقہ میں تو ان استعماری قوتوں نے قتل وغارت گری کی انتہا کردی۔

ثروت صولت لکھتے ہیں:

''الجزائر، سینیگال اور بریول سے تین فوجیں مغربی افریقہ اور وسطی افریقہ کے فرانسیسی مقبوضات کو ایک دوسرے سے ملانے کے لیے روانہ ہوئیں۔ سینیگال سے جو فوج روانہ ہوئی وہ راستے میں مسلمانوں کا قتل عام کرتی اور ان کی بستیوں کو

---

(1) Huntington; "The Clash of Civilizations, ..."; pg:51

(2) سید حسن ریاض: ''پاکستان ناگزیر تھا''؛ ص:145

جلاتی اور برباد کرتی آگے بڑھی''۔[1]

ایک اور مغربی گواہی ہے کہ:

"Colonization has also caused the bloodiest wars of conquest and the destruction of peoples who stood in the path of spreading empires."[2]

(استعماری نظام کے نتیجے میں خونریز جنگیں ہوئیں اور سامراجی عزائم کے راستے میں رکاوٹ بننے والے انسانوں کو تباہ و برباد کر دیا گیا۔)

3۔آباد کاری:

اپنی نوآبادیات میں اپنے ملک سے لوگوں کو لا کر بسانا بھی استعماری طاقتوں کا حربہ رہا ہے۔ خصوصاً فرانس نے اپنے افریقی مقبوضات میں اتنے فرانسیسی باشندوں کو لا کر آباد کیا کہ کئی شہروں میں فرانسیسی باشندوں کی تعداد مقامی باشندوں سے بھی زیادہ ہوگئی۔[3]

ان اقدامات کا مقصد یہی تھا کہ مقامی آبادی کو اقلیت میں تبدیل کر کے ان کی قوت کو کمزور کر دیا جائے۔ نیز یہ کہ مقامی وسائل اور زرعی زمینوں پر استعماری ملک کے عوام کا قبضہ رہے۔

دی آکسفورڈ ہسٹری آف اسلام کے مطابق:

"In North Africa, French settlers, emerged as a dominent social and economic class".[4]

---

[1] ثروت صولت؛''ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ''؛ج: 2؛ص:505

[2] "Compton's Encyclopedia"; vol:5;pg:441.

[3] ثروت صولت؛''ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ''؛ج: 4؛ص:199

[4] "The Oxford History of Islam"; pg:576

(شمالی افریقہ میں فرانسیسی نو آباد کار سماجی اور معاشی طور پر ایک غالب طبقہ بن کر اُبھرے۔)

4۔مقامی اُمراء کا ساتھ:

استعماری طاقتیں اپنی نو آبادیات میں کئی ایسے مقامی امراء اور مؤثر افراد کو اپنے ساتھ ملا لینے میں کامیاب ہوگئیں جنہوں نے مقامی آبادی پر استعماری گرفت مضبوط رکھنے میں اہم کردار ادا کیا اور بدلے میں یورپی آقاؤں سے مراعات وصول کیں۔ انسائیکلو پیڈیا بریٹینیکا میں ان افراد کو ''co-operative local elite'' کہا گیا ہے۔[1]

برطانیہ کو خصوصاً ہندوستان میں ایسے بہت سے ''معاونین'' میسر آ گئے۔ چونکہ ہندوستان کئی ریاستوں اور نسلی و مذہبی گروہوں پر مشتمل ملک تھا جن کے اپنے اپنے راجے، سردار اور امراء وغیرہ تھے۔ ان امراء کو قابو میں کر لینے کا مطلب تھا کہ ان کے تحت آنے والی تمام آبادی برطانوی قبضے میں آجاتی۔ ایسی صورت میں برطانیہ کو حکومت کرنے کے لیے ''افرادی قوت'' بھی یہیں سے میسر آجاتی تھی۔

دی آکسفورڈ ہسٹری آف اسلام کے مطابق:

".....landowners, traditional elites, and local chiefs and grandees were used to bolster British rule... A symbolic relationship then developed between the princes and local elites and the British, whereby the British agreed to the social status of the local elites and the elites in turn provided local support and social control for the British."[2]

---

[1] "Encyclopedia Britanica";vol:18;pg:875

[2] "The Oxford History of Islam";pg: 587

(زمینداروں، روایتی اشرافیہ، مقامی سرداروں اور امراء نے برطانوی راج کی حوصلہ افزائی کی۔ لہٰذا مقامی امراء و اشرافیہ اور برطانیہ کے مابین ایک معنی خیز تعلق پروان چڑھا جس کی رو سے برطانیہ نے ان مقامی امراء اور اشرافیہ کی سماجی حیثیت کو قبول کیا اور بدلے میں ان سرداروں نے برطانیہ کو اپنی مدد اور تعاون فراہم کیا۔)

5۔اقلیتوں کا ساتھ:

اسلامی حکومتوں میں اقلیتوں کے حقوق کا ہمیشہ تحفظ کیا گیا تھا۔ لیکن یورپ کی استعماری قوتوں نے اپنے استبدادی عزائم کو پورا کرنے کے لیے مسلم خطوں میں موجود اقلیتوں خصوصاً عیسائیوں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا اور خود کو ان کے حقوق کا محافظ اور نجات دہندہ ظاہر کر کے ان کی ہمدردیاں اپنے ساتھ ملائیں۔① لہٰذا ان اقلیتوں کی ہمدردیاں اور تعاون ان استعماری طاقتوں کو حاصل رہا۔

"As the local populations began to rebel against colonial rule, they (colonists) came to view the minority communities as collaborators."②

(جب مقامی آبادیوں نے استعمار کے خلاف بغاوت شروع کی تو ان طاقتوں نے وہاں کی اقلیتوں کو اپنے حلیف کے طور پر دیکھا۔)

اکثر یہ اقلیتیں یورپ کی عیسائی طاقتوں کی قدرتی حلیف ثابت ہوئیں۔

"Minority communities ... saw only apportunities for gain in colonialism."③

(اقلیتی گروہوں کو استعماری نظام میں اپنا مفاد نظر آتا تھا۔)

---

①"The Oxford History of Islam"pg:581

②// // // ;pg:582

③// // // pg:583

استعمار نے اپنے دور میں اپنی مسلمان نوآبادیات میں جو نسلی، لسانی اور مذہبی تعصب کے بیج بوئے تھے ان کی فصل آج تک یہ خطے کاٹ رہے ہیں۔

6۔ تعلیمی نظام:

استعماری قابض طاقتوں نے اپنی مسلم نوآبادیات میں جو تعلیمی نظام متعارف کروایا اس کا مقصد یہی تھا کہ نئی نسل کے دلوں سے ان کے اسلاف اور مذہبی عقائید وروایات کی محبت اور عظمت نکال کر ان کے اندر ایسا احساس کمتری پیدا کر دیا جائے کہ وہ یورپی آقاؤں اور ان کی تہذیب میں ہی اپنی کامیابی اور فلاح کے راستے تلاش کریں نیز یہ کہ اس تعلیمی نظام کے ذریعے مقامی افراد کی ایسی ذہن سازی کی جائے کہ حکومتی مشینری چلانے کے لیے یہیں سے کچھ ''وفادار'' میسر ہو جائیں۔

"Colonial rulers across the Muslim world encouraged education and invested heavily in educational institutions. Such institutions were established to educate those who would eventually run the mechinery of colonialism."[1]

(مسلم دنیا میں استعماری طاقتوں نے تعلیم کی حوصلہ افزائی کی اور تعلیمی اداروں کے قیام کے لیے بھاری سرمایہ لگایا۔ یہ ادارے ایسے افراد کو تعلیم دینے کے لیے قائم کیے گئے تھے جو استعمار کا کاروبار حکومت چلا سکیں۔)

استعمار کے قائم کردہ اسی تعلیمی نظام کی بدولت ان طاقتوں کو مقامی آبادیوں سے ہی ایسے لوگ میسر آ گئے جو ان طاقتوں کی مضبوطی کا باعث بنے۔

---

[1] "The Oxford History of Islam"; pg:578

7۔ مضبوط ادارے:

یورپی حکومتوں نے اپنی نوآبادیات میں ایسے مضبوط اور فعال ادارے قائم کیے جنہوں نے یورپ کے استعماری عزائم کی تکمیل میں اہم کردار ادا کیا، ان میں فوج، پولیس اور بیوروکریسی سب سے اہم ہیں۔ ان تینوں اداروں میں مقامی افراد کی ایک بڑی تعداد بھرتی کی جاتی تھی۔ پھر ان کی تعلیم و تربیت اس انداز میں کی جاتی کہ وہ استعماری مشینری کے نہایت اہم پرزے ثابت ہوتے۔

دی آکسفورڈ ہسٹری آف اسلام کے مطابق:

" Throughout colonial territories, local armies and police forces were trained to support the colonial state."①

(تمام نوآبادیات میں مقامی فوج اور پولیس کو استعمار کے دست و بازو بننے کے لیے تربیت دی گئی۔)

استعماری نظام کی بیوروکریسی کے متعلق لکھا ہے:

"..... the bureaucracy also served as a pillar of the colonial order. Trained and molded in the ethos of the colonial culture, bureaucrates in the empire's service shared and followed the values and political outlook of the European rulers."②

(نوکر شاہی نے بھی استعماری نظام کے لئے ایک ستون کا کام دیا۔ انہیں استعماری اقدار کے سانچوں میں ڈھلنے کی تربیت دی گئی تھی۔ نوآبادیاتی طاقتوں کے یہ ملازم یورپی

---

①"The Oxford History of Islam";pg:592

② // // // ;pg:594

حکمرانوں کے سیاسی نظریات وافکار کے مکمل پیروکار تھے۔)

8۔معاشی دباؤ:

نو آبادیوں کے وسائل کو اپنے قبضے میں کر کے وہاں کے عوام کو اس قدر معاشی دباؤ میں رکھا گیا کہ وہ روٹی کمانے اور اپنی بنیادی ضروریات پوری کرنے کے علاوہ کچھ سوچ ہی نہ سکیں۔

ڈاکٹر مبارک علی لکھتے ہیں:

''چونکہ سامراجی طاقت کے لیے ایک بڑی آبادی کو قتل کرنا یا بالکل ختم کرنا مشکل ہوتا ہے اس لیے وہ اقتدار حاصل کرنے کے بعد اس قسم کے منصوبے بناتی ہے کہ جس میں آبادی کو محنت مزدوری میں مصروف رکھا جائے۔'' [1]

9۔اپنی زبان اور ثقافت کا فروغ:

استعماری قبضہ کار اپنے زیر تسلط خطوں میں اپنی زبان اور اپنی ثقافت کو فروغ دے کر کئی مقاصد حاصل کرتے ہیں۔ اگر مقامی لوگ قبضہ کاروں کی زبان اور ثقافت اپنا لیں تو بیرونی حملہ آور انہیں ''اجنبی'' محسوس نہیں ہوں گے نیز ہر زبان اور ثقافت اپنے ساتھ خاص اقدار اور طرزِ معاشرت لے کر آتی ہے۔ یہی اقدار اور طرز معاشرت اگر مغلوب قوم اپنا لیتی ہے تو بہت حد تک قبضہ کاروں کے خلاف جدوجہد اور مزاحمت بھی کمزور پڑ جاتی ہے۔ لہٰذا استعماری طاقتوں کی کوششوں کا ایک بہت بڑا محور یہ بھی تھا کہ زیر تسلط مسلمان علاقوں میں اپنی زبان اور ثقافت کو فروغ دیا جائے۔ اس کے لیے انہوں نے جو طریقہ کار اختیار کیے ان میں سے ایک تو یہ تھا کہ مقامی روایات اور مسلم اقدار کو تحقیر کا نشانہ بنایا گیا۔

" Colonists often looked down on local practices.

---

[1] ڈاکٹر مبارک علی؛ ''برطانوی راج (ایک تجزیہ)''؛ تاریخ پبلی کیشنز، لاہور، 2012ء؛ ص:50

Muslims were seen as prone to violence and Muslim doctrines such as Jihad were used as evidence of Islam's hostility to progress."①

(استعماری طاقتیں مقامی طرز زندگی کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتی تھیں۔ مسلمانوں کو تشدد پسند سمجھا جاتا تھا اور 'جہاد' جیسی اسلامی تعلیمات کو اسلام کی قدامت پرستی اور تنگ نظری کی علامت سمجھا جاتا تھا۔)

پھر استعماری ممالک نے اپنے زیر قبضہ علاقوں میں اپنی زبان کو فروغ دینے کے لیے نظام تعلیم اور اچھے روزگار کے مواقع کو اپنی زبان کے ساتھ مشروط کر دیا۔ سیموئل پی ہنٹنگٹن کا بجا طور پر کہنا ہے کہ طاقت اور اقتدار کی تبدیلی کے ساتھ ہی زبان کی تبدیلی بھی لازم ہے۔

" Shifts in the distribution of power produce shifts in the use of languages.... Britain and France insisted on the use of their languages in their colonies."②

(طاقت کے توازن میں تبدیلی کے ساتھ ہی لسانی استعمال میں بھی تبدیلی آتی ہے.... برطانیہ اور فرانس نے اپنی نوآبادیات کے باشندوں کو اپنی زبان کے استعمال پر مجبور کیا۔)

جب ترقی، کامیابی اور روزگار کے لیے یورپی زبانوں کا سیکھنا لازم ٹھہرا تو مقامی زبانوں کے ساتھ ساتھ عربی زبان کی اہمیت بھی کم ہونے لگی اور عربی زبان اور اسلامی ثقافت جو دنیا کے مختلف خطوں اور نسلوں کے مسلمانوں کے درمیان اتحاد و یگانگت اور اسلامی تشخص کے اہم ذرائع تھے انہیں بے اثر کر دیا گیا۔

---

①"The Oxford History of Islam";pg:563

②Huntington, "The Clash of Civilizations.....", pg:62

گو اپنی ثقافت کی ترویج کے سلسلے میں فرانس نے سب سے زیادہ پرتشدد رویہ اپنایا[1] لیکن بہر حال ہر استعماری قوت نے اپنے زیر قبضہ ممالک پر اپنی تہذیب وثقافت رائج کرنے کے لیے اقدامات کیے۔

"....to varying degrees all colonial administrations pursued cultural change and charged their policy maker and institutions with the duty to realize this change".[2]

(تمام استعماری حکومتوں نے کسی نہ کسی حد تک اپنی نوآبادیات میں ثقافتی تبدیلیاں لانے پر زور دیا اور اپنے پالیسی سازوں اور اداروں کو اس ذمہ داری پر مامور کیا۔)

اس مقصد کے لیے استعماری طاقتوں نے بیوروکریسی کو استعمال کیا۔ نوآبادیات کی مقامی آبادی سے منتخب کردہ افراد کو "بیوروکریسی" کے ادارے کے تحت ایسی تربیت دی جاتی کہ اسلامی روایات واقدار ان کے نزدیک تنگ نظری اور قدامت پرستی کی علامت بن کر رہ جاتیں۔ چونکہ یہی روایات واقدار دنیا بھر کے مسلمانوں کو ایک وحدت کی لڑی میں پرونے کا باعث تھیں، جب ان کے ساتھ عقیدت اور محبت کا رشتہ ختم ہوا تو "امتِ واحدہ" کے تصور کی اہمیت بھی کم ہوتی چلی گئی۔

دی آکسفورڈ ہسٹری آف اسلام کے مطابق بیسویں صدی کے آغاز کی اسلامی دنیا میں "امت" کی بجائے "قومیت" کا تصور مضبوط ہونے کی ایک بہت بڑی وجہ یہی تھی کہ اسلامی تہذیب وثقافت کے برعکس یورپی ثقافت کا فروغ ہو چکا تھا۔[3]

---

[1] "The Oxford History of Islam";pg:561

[2] // // //

[3] // // //;pg:557-558

فصل پنجم:

استعماری دور کا خاتمہ اور اثرات

دوسری جنگِ عظیم (1945-1938) کے بعد صدیوں پر محیط استعماری دور کا خاتمہ ہوا اور تمام نوآبادیات ایک ایک کر کے آزاد ہونے لگیں۔ نوآبادیات کی آزادی کے اس عمل کو Decolonization کہا جاتا ہے۔

"Decolonization is the process whereby a metropoliton country gives up its authority over its dependent territories and grants them the status of sovereign states."①

(Decolonization اس عمل کا نام ہے جس میں ایک قابض ملک اپنے زیرِ قبضہ علاقوں سے اپنے اقتدار کو ختم کر کے انہیں آزاد اور خود مختار ریاستیں تسلیم کرتا ہے۔)

استعماری قبضے کے خاتمے کی وجوہات

Decolonization کے اس عمل کو ممکن بنانے میں مختلف عوامل کارفرما تھے۔

1) عالمی جنگیں:

بیسویں صدی کے پہلے نصف میں برپا ہونے والی دو عالمی جنگوں نے دنیا کی بڑی طاقتوں کو نڈھال کر دیا تھا۔ ان کے بیشتر وسائل ان جنگوں میں کام آ چکے تھے۔ اب اپنے وطن سے ہزاروں میل دور موجود نوآبادیات پر قبضہ رکھنا فائدے کی بجائے دردِ سر تھا۔ خود یورپ کے عوام اس نظام کو قائم رکھنے کے خلاف ہو چکے تھے۔

①"Fontana Dictionary"; pg:410

انسائیکلوپیڈیا بریٹینیکا کے مطابق:

"the war weary public of Westren Europe eventually refused any further sacrifices to maintain overseas colonies."①

(عالمی جنگیں مغربی یورپ کے عوام کو اس حد تک تھکا چکی تھیں کہ انہوں نے اپنی سمندر پار نوآبادیات کو قائم رکھنے کے لئے مزید قربانیاں دینے سے انکار کر دیا۔)

2) شعور اور آگہی:

دنیا میں غلامی کی اس جدید قسم کے خلاف لوگوں میں آگہی اور شعور پیدا ہو گیا تھا۔ قوموں اور ملکوں کو غلام بنا کر رکھنا اب باعث فخر نہیں بلکہ باعث عار سمجھا جانے لگا تھا۔

"The possessions of colonies, so long a matter of pride and prestige , now became a sin to be expiated only, if at all, by the granting of immediate independence."②

(نوآبادیات کا مالک ہوتا اب تک تو نہایت فخر اور سربلندی کا باعث سمجھا جاتا تھا لیکن اب یہ ایک گناہ سمجھا جانے لگا جس کا کفارہ ادا کرنے کی صرف یہی صورت تھی کہ ان نوآبادیات کو فوری طور پر آزادی دے دی جائے۔)

3) نئی عالمی طاقتوں کا ظہور:

بیسویں صدی کے نصف اول میں عالمی منظر نامے پر دو نئی طاقتوں کا ظہور

①"Encyclopedia Britanica"; vol;18; pg:859

②"International Encyclopedia of Social Sciences";vol:3;pg:3

ہوا۔ یہ طاقتیں ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور روس کے ممالک تھے۔ یہ دونوں طاقتیں بظاہر انسانی حقوق کی علمبردار بن کر اٹھیں اور استعماری نظام کی سختی سے مخالفت کی (گو آنے والے وقت نے یہ ثابت کر دیا کہ یہ طاقتیں براہِ راست نوآبادیات قائم کیے بغیر کمزور اقوام پر اپنا اثر ورسوخ قائم کرنے کی پالیسی پر عمل پیرا تھیں۔)

" One cause (of decolonization) was the decline of Britain as a world power after 1945 and the ascendacny of the United States and the Soviet Union, while another reason concerns changes to technologies of production and international finance which enabled imperialist and capitalist ambitions to be pursued without the need of colonial settlement." [1]

(نوآبادیات کو آزاد کر دینے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ 1945 کے بعد برطانیہ کی عالمی برتری زوال کا شکار ہو چکی تھی اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور سوویت یونین نئی عالمی طاقتوں کے طور پر ابھر رہے تھے۔ نیز صنعت سازی اور عالمی مالیاتی نظام میں آنے والی فنی تبدیلیوں نے سامراجی اور سرمایہ دارانہ ذہنیت کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے نوآبادیاتی نظام کے علاوہ کئی دیگر طریقے سجھا دیئے تھے۔)

4) قومیت کا تصور اور آزادی کی تحریکیں:

قومیت کا تصور بیسویں صدی میں بہت طاقتور ہو چکا تھا۔ مختلف اقوام کے لیے کسی غیر قوم کی غلامی میں رہنا اب ایک ناقابل برداشت تصور تھا۔ قومیت کے اس تصور نے

[1] John Mcleod; "Beginning Post Colonialism";pg:12

مختلف خطوں میں آزادی کی تحریکوں کو جنم دیا۔ ان تحریکوں کو دبانا اب استعماری طاقتوں کے بس کی بات نہیں رہی تھی۔ کئی غیر مسلم نو آبادیات مثلاً امریکہ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ تو آزاد ریاستوں کی حیثیت حاصل کرنے تک خود یورپی اقوام کا ہی مسکن بن چکی تھیں لیکن مسلم خطوں میں گو امت کا تصور معدوم ہو رہا تھا پر قومیت کا تصور نہایت شد و مد کے ساتھ سر اٹھا چکا تھا۔

"....after world war 1 local populations increasingly turned to nationalism to provide their desire for independence with a coherent ideological framework."[1]

(پہلی جنگ عظیم کے بعد مقامی آبادیوں میں آزادی کی خواہش قومیت پرستی کے روپ میں ابھر کر سامنے آئی ـــ)

قومیت کا یہ تصور گو کہ اسلام کے دیئے گئے ''امت واحدہ'' کے تصور کے خلاف اور متصادم ہے لیکن اس دور کے حالات پر نظر دوڑائی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دنیا بھر کے مسلمان ایک طویل عرصے سے چھوٹی چھوٹی وحدتوں میں منقسم ہو کر غیروں کے زیر تسلط تھے۔ نتیجتاً ان کے اندر وحدت امت کا تصور مضبوط نہیں رہا تھا۔ ان حالات میں تمام مسلم خطوں کو اپنی اپنی جغرافیائی حدود میں رہ کر اور اپنی قومیت کا علم اٹھا کر ہی اپنی آزادی کی جنگ لڑنی تھی۔

ڈاکٹر اسرار احمد اس دور کی تحاریکِ آزادی میں ''قومیت'' کے کردار پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''....اگرچہ مختلف مسلمان ممالک میں حصول آزادی کی تحریکوں کی تقویت کے

---

[1] "The Princeton Encyclopedia of Islamic Political Thought"; Princeton University Press, Princeton and Oxford, 2013; pg:104

لیے جن علاقائی یا نسلی عصبیتوں کو استعمال کیا گیا انہیں بھی خاص اصولی اور نظری اعتبار سے اسلام کے نظام فکر کے ساتھ سوائے تضاد کے کوئی نسبت حاصل نہیں ہے لیکن عالم واقعہ میں اس کے سوا کوئی چارۂ کار موجود نہ تھا۔ اس لیے کہ اسلام کے ساتھ مسلمانوں کا ذہنی وقلبی رشتہ اتنا قوی نہ رہا تھا کہ اسے کسی جاندار اور فعال تحریک کی اساس بنایا جاسکتا۔"(۱)

بہر حال قومیت کے تصور نے آزادی کی ان تحریکوں کو جنم دیا جن کا مقابلہ کرنا اور راستہ روکنا اب یورپ کی استعماری طاقتوں کے بس کی بات نہیں تھی:

" Historically the myth of the 'nation' has proved highly potent and productive in forging effective resistance to colonialism."(۲)

(یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ نوآبادیاتی نظام کے خلاف ہونے والی مزاحمت میں 'قومیت' کا فلسفہ نہایت قوی اور نتیجہ خیز عنصر ثابت ہوا۔)

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس دور میں آزادی حاصل کرنے والے تمام مسلمان ممالک میں پاکستان وہ واحد ملک تھا جس کی تحریک آزادی کی بنیاد جغرافیائی قومیت کی بجائے "اسلامی قومیت" پر تھی۔

استعماری دور کے اثرات

استعماری دور نے حاکم اور محکوم دونوں اقوام پر اپنے دوررس اثرات مرتب کیے۔

مسلم اقوام پر استعماری دور کے اثرات:

مفتوحہ اقوام پر فاتح قوم کے تسلط کے کیا اثرات ہوتے ہیں اس کا جواب قرآن پاک

(۱) ڈاکٹر اسرار احمد؛ "سابقہ اور موجودہ مسلمان امتوں۔۔۔۔۔"؛ ص:45

(۲) John Mcleod; "Beginning Post Colonialism";pg:90

میں ملکہ سبا کا قول نقل کرتے ہوئے یوں دیا گیا ہے:

إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا وَجَعَلُوا أَعِزَّةَ أَهْلِهَا أَذِلَّةً ۚ ①

''بادشاہ جب کسی علاقے میں داخل ہوتے ہیں تو وہاں فساد کرتے ہیں اور وہاں کے معززین کو ذلیل بنا دیتے ہیں''۔

اس ایک آیت میں فتح اور شکست کے اثرات کا پورا فلسفہ سمو دیا گیا ہے۔ مسلم اقوام پر بھی ایک طویل عرصہ کی غلامی کا سب سے بڑا اثر یہی پڑا کہ عزت دار ذلیل ہو کر رہ گئے۔ ایک اسلامی معاشرے کی صدیوں سے قائم وہ روایات واقدار بدل گئیں جو افراد کے معزز یا رزیل ہونے کا معیار قائم کرتی تھیں۔ ضمیر فروشوں اور غداروں کو اموال، عہدے اور جاگیریں بخشی گئیں جبکہ غیر ملکی تسلط کے خلاف مزاحمت کرنے والے باغیرت حریت پسندوں کو غدار اور ناعاقبت اندیش کہا گیا اور ان کے لیے گولی، قید، پھانسی گھاٹ یا کالے پانی کی سزائیں لکھی گئیں۔ مسلم معاشروں میں زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہ رہا جس پر یورپی تسلط نے اپنے گہرے اثرات نہ چھوڑے ہوں۔

"Colonialism reshaped existing structures of human knowledge."②

(استعماری دور نے دنیا کے علمی معلوماتی ڈھانچے کو ایک نئی شکل میں ڈھال دیا)۔

استعماری دور نے انسانی معاشروں کے ہر پہلو پر اپنا کوئی نہ کوئی نقش ثبت ضرور کیا ہے: آکسفورڈ ہسٹری آف اسلام میں لکھا ہے:

"The colonial era forever changed all aspects of

① النمل 34:27

② Ania Loomba; "Colonialism / Post Colonialism";pg:53

geography, the economy, social relation, and politics in the areas that it ruled".①

(استعماری دور کے نتیجے میں نوآبادیاتی خطوں کا جغرافیہ، معیشت، سماجی تعلقات اور سیاسی نظام ہمیشہ کے لیے بدل گیا۔)

مسلم اقوام پر استعماری قبضوں اور تسلط نے جو سب سے واضح اور گہرا اثر چھوڑا وہ احساس مرعوبیت کا تھا جس کی بدولت آزادی کے بعد بھی مسلمان اپنی ترقی اور فلاح کا راستہ یورپی اقوام کی نقالی میں ہی تلاش کرتے ہیں۔ مولانا مودودی ؒ لکھتے ہیں:

"زندگی کا کون سا شعبہ ایسا پایا جاتا ہے جس پر غیر اسلام کا تسلط نہیں ہے؟ کیا اعتقادات اور افکار وتخیلات پر الحاد ودہریت یا کم از کم شک وریب کا غلبہ نہیں؟ کیا تعلیم پر نا خدا شناسی کی حکومت نہیں؟ کیا تہذیب وتمدن پر فرنگیت کا استیلا نہیں؟... کیا معاشرت کی جڑوں تک میں مغربیت اتر نہیں گئی ہے؟ کیا اخلاق اس کے غلبے سے محفوظ ہیں؟ کیا معاملات اس کے تسلط سے آزاد ہیں؟ کیا قانون اور سیاست اور حکومت کے اصول وفروع نظریات اور عملیات میں سے کوئی چیز بھی اس کے اثر سے پاک ہے"۔②

نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات③

1) مذہب:

یورپی نشاۃِ ثانیہ نے علم اور ترقی کے جو اصول وقوانین مرتب کیے ان میں سب سے اہم یہ تھا کہ حقیقت وہی ہے جو حواسِ خمسہ کے ذریعے محسوس ہو سکتی ہے جبکہ اسلام کی اساس

---

① "The Oxford History of Islam";pg:552

② مودودی؛ "تنقیحات"؛ ص:203

③ اقبال، نظم؛ "خضرِ راہ"؛ کتاب: "بانگ درا" (کلیات اقبال)؛ ص:292

جن اصولوں پر قائم ہے ان میں سے ایک ایمان بالغیب بھی ہے۔ چونکہ صحیح اور غلط کا معیار ہمیشہ وہی سمجھا جاتا ہے جو 'طاقت' کی طرف سے فراہم کیا جاتا ہے۔ لہٰذا آج مسلمان بھی اپنے مذہب کو مغربی قوانین کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ اس ضمن میں مولانا مودودی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''ہمارے نوجوان نے مرعوب بلکہ غلامانہ ذہنیت کے ساتھ مغرب سے جو کچھ سیکھا اس کو صحت اور درستی کا معیار سمجھ لیا۔ پھر ناقص علم کے ساتھ اسلام کے اصول وقوانین کو اس معیار پر جانچ کر دیکھا اور جس مسئلے میں دونوں کے درمیان اختلاف پایا اس میں کبھی مغرب کی غلطی محسوس نہ کی بلکہ اسلام ہی کو برسر غلط سمجھا اور اس کے اصول وقوانین میں ترمیم وتنسیخ کرنے پر آمادہ ہو گئے۔''[1]

2) معاشرت:

گو کہ مغرب کا استعماری دور شروع ہونے سے پہلے بھی مسلم معاشرے ایک مثالی اسلامی تہذیب کی تصویر پیش نہیں کرتے تھے لیکن بہر حال بنیادی اسلامی اقدار ہی معاشرے میں معزز سمجھی جاتی تھیں جن کا منبع قرآن اور سنت تھے۔ مساجد معاشرتی سرگرمیوں کی اہم مراکز تھیں۔ مسلمانوں میں ایک ''امت'' ہونے کا تصور موہوم ہی سہی بہرحال موجود تھا لیکن مغربی تسلط نے اسلامی معاشرے کے تانے بانے ادھیڑ ڈالے۔ اسلامی اقدار اور روایات کو تضحیک کا نشانہ بنایا گیا۔ مغربی اقوام نے اپنے زیر تسلط مسلمان خطوں میں اپنی ثقافت کی آبیاری کی اور اسلامی اقدار کی شدید حوصلہ شکنی کی۔ قوم پرستی کے بیج بھی مسلم معاشروں میں استعماری طاقتوں نے ہی بوئے ہیں۔

ڈاکٹر اسرار احمد لکھتے ہیں:

''اس داستان کا المناک ترین باب یہ ہے کہ مغربی استعمار نے امت مسلمہ کی وحدت ملی کو پارہ پارہ کر دیا اور اس صدی (بیسویں صدی) کے آغاز ہی میں نسلی

---

[1] مودودی: ''تنقیحات''، ص: 27

اور علاقائی عصبیتوں کے وہ بیج مسلمان اقوام کے دلوں میں بو دیے جو ابھی تک برگ و بار لا رہے ہیں۔" (1)

غرض یہ کہ مغربی تہذیب کو خدا ناشناسی اور مادیت پرستی کے جس جدید زہر نے آلودہ کر رکھا ہے وہی زہر مغربی اقتدار نے مسلم معاشروں کی رگوں میں اتار دیا ہے۔

مولانا مودودی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"(مغربی تہذیب نے) معاشرے کی رگ رگ اور ریشے ریشے میں نفس پرستی، تن آسانی اور خود کامی کا زہر اتار دیا۔" (2)

3) سیاست:

اسلام نے اپنے پیروکاروں کو ایک ایسا منفرد سیاسی فلسفہ عطا کیا ہے جو اپنی جگہ مکمل اور جامع ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے اندر اتنی لچک بھی رکھتا ہے کہ زمانے کی رفتار اور ضروریات کا ساتھ دے سکے۔ خلیفہ، حکمران اور امراء کے انتخاب کے لیے بھی ہمارے دین نے ہمیں اصول اور قاعدے طے کر کے دیئے ہیں۔ اسلامی نظام حکومت کی بنیاد بھی اطاعت الٰہی اور اتباعِ سنت پر رکھی گئی ہے جبکہ مغرب جس نظام حکومت کا علمبردار ہے اس کا مرکزی فلسفہ نفس پرستی اور جمہور عوام کی خواہشات ہے۔ آج ہر مسلم ملک کی سیاست انہی مغربی خطوط پر استوار ہے جو استعمار یہاں رواج دے کر گیا ہے اور جن کے متعلق مولانا مودودی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"(مغرب نے) سیاست کو قوم پرستی و وطنیت رنگ و نسل کے امتیازات اور خداوندِ طاقت کی پرستاری سے آلودہ کر کے انسانیت کے لیے ایک بدترین لعنت

---

(1) ڈاکٹر اسرار احمد: "سابقہ اور موجودہ مسلمان ۔۔۔۔۔۔"، ص: 39

(2) مودودی: "تنقیحات"، ص: 29

بنادیا''۔①

مغربی استعمار سے پہلے بھی دنیا بھر کے مسلم خطوں میں بادشاہت کے تحت ہی نظام چل رہے تھے لیکن عملاً خلافت فعال نہ ہونے کے باوجود خلافت کا ادارہ بہر حال موجود تھا اور دنیا بھر کے مسلمان خلیفہ سے نہیں تو ''خلافت'' کے ادارے سے مذہبی عقیدت ضرور رکھتے تھے۔ لیکن مغربی استعمار کے دور میں یہ رہی سہی خلافت بھی نہ صرف ختم کردی گئی بلکہ مغربی جمہوری نظام کو بہترین نظام حکومت کے طور پر تمام مسلم ممالک نے قبول کرلیا۔

پھر ایک بہت کارگر حربہ جو استعماری طاقتوں نے اپنایا وہ یہ تھا کہ اپنی نوآبادیات کی حکومتی اور انتظامی مشینری میں فوج اور بیوروکریسی کو طاقتور کیا اور ان دونوں اداروں کی ''تربیت'' نہایت اہتمام اور عرق ریزی کے ساتھ استعماری اور سیکولر فلسفے کے خطوط پر کی۔ یہی ادارے نوآزاد مسلم ممالک کی سیاست اور انتظامی ڈھانچوں میں عملاً دخیل رہے۔

"The bureaucratic, military and political elite who constituted the ruling order in Muslim states at the end of the colonial era were often educated in colonial educational institutions; worked for the colonial order, and were deeply influenced by the ideology and vision of the colonial administration."②

(مسلم خطوں میں نوآبادیاتی دور کے خاتمے کے وقت مقامی آبادی کے صاحب اقتدار افسران، فوجی اور سیاسی اشرافیہ ان ہی افراد پر مشتمل تھی جو استعماری تعلیمی نظام کے فارغ التحصیل تھے، استعماری مقاصد کے لیے کام کرتے تھے اور استعماری حکمرانوں کے نظریات سے متاثر تھے۔)

---

① مودودی؛ ''تنقیحات''؛ ص:29

② "The Oxford History of Islam";pg:565-566

لہٰذا آزادی کے بعد کی مسلم ریاستیں بھی اپنے سیاسی اور انتظامی معاملات میں استعماری ''تربیت'' کا حق ادا کرتی رہیں۔

4) معیشت:

استعماری قوتوں کا بنیادی مقصد تو اپنے زیر قبضہ ممالک کے وسائل پر ہاتھ صاف کرنا ہی تھا لہٰذا انہوں نے اس بات کو یقینی بنایا کہ مقامی لوگ اپنے وسائل سے فیضیاب نہ ہو سکیں۔ اپنے زیر تسلط علاقوں میں کہیں کوئی ترقیاتی کام کیے بھی گئے تو ان کا مقصد مقامی لوگوں کو فائدہ پہنچانا نہیں بلکہ اپنا مفاد تھا۔ مثلاً فرانس نے الجزائر میں جو زرعی اصلاحات اور جدید تعمیرات کیں ان پر تبصرہ کرتے ہوئے ثروت صولت کہتے ہیں:

> ''۔۔۔لیکن الجزائر کی اس ترقی کا سب سے افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ یہ سارے تعمیری کام فرانسیسی باشندوں کی خاطر کیے گئے اور ان جدید سماجی، اقتصادی اور تعلیمی سہولتوں اور ترقیوں سے الجزائر کے مقامی باشندے قطعی محروم رہے''۔[1]

اسی طرح استعمار کے زیر قبضہ جن علاقوں میں مسلمانوں کے علاوہ دیگر مذاہب کے باشندے آباد تھے وہاں خصوصاً ایسے اقدامات کیے گئے کہ مسلم باشندوں کو پسماندہ رکھ کر دوسری اقوام کو آگے بڑھنے کے مواقع دیئے جائیں۔ فرانس نے الجزائر میں ایسے قوانین لاگو کیے جن سے وہاں آباد ایک لاکھ چالیس ہزار یہودیوں کو فائدہ پہنچا۔[2]

اسی طرح برصغیر میں ایسے اقدامات کیے گئے جن کے نتیجے میں مسلمان معاشی طور پر انتہائی پسماندہ رہے اور ہندو ان سے آگے بڑھ گئے۔

مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ برصغیر میں انگریز کی پالیسی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

[1] ثروت صولت؛ ''ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ''؛ ج:4؛ص:198

[2] ایضاً؛ص:200

''ابتدا سے انگریزی حکومت کی پالیسی یہ رہی کہ مسلمانوں کو معاشی حیثیت سے پامال کر کے ان کے اس قومی فخر و ناز کو کچل ڈالے جو ایک حاکم قوم کی حیثیت سے صدیوں تک ان کے دلوں میں پرورش پاتا رہا ہے چنانچہ ایک صدی کے اندر اندر اس پالیسی کی بدولت اس قوم کو مفلس، جاہل، پست خیال، فاسد الاخلاق اور ذلیل و خوار کر کے چھوڑ اگیا''۔①

زرعی خطوں پر مشتمل نوآبادیات کی زرعی زمینوں سے مقامی افراد کو بیدخل کرنے اور یورپی اقوام کے مفاد کی پالیسیاں بنانے کے نتیجے میں مقامی افراد بدحال ہو کر رہ گئے۔

"Colonial agricultural policy led to rural poverty , which in Java, Egypt and Algeria broke down rural economies."②

(استعمار کی زرعی پالیسیوں نے دیہات میں غربت کو جنم دیا۔ جاوا، مصر اور الجیریا میں دیہی معیشت کا بیڑہ غرق ہو گیا۔)

استعماری طاقتوں کی معاشی پالیسیوں کا ایک اور تباہ کن نتیجہ یہ نکلا کہ معاشروں کی طبقاتی تقسیم استعماری طاقتوں کے مفاد کو سامنے رکھ کر عمل میں لائی گئی۔

دی آکسفورڈ ہسٹری آف اسلام کے مطابق:

"the economic impact of colonialisms produced new classes and altered the distribution of power among the existing ones."③

(استعماری دور کے اقتصادی اثرات کی بدولت معاشرے میں نئے طبقات وجود میں

---

① مودودی: ''تنقیحات''؛ ص:22

② "The Oxford History of Islam";pg:573

③ "The Oxford History of Islam"; pg : 576

آئے اور پہلے سے موجود مقتدر طبقات کی حیثیت بدل گئی۔)

مثال کے طور پر شمالی افریقہ میں فرانسیسی آباد کار ایک مقتدر اور اعلیٰ طبقہ بن کر ابھرے۔ ہندوستان میں برطانوی استعمار نے جاگیردانہ نظام قائم کر کے اسے مضبوط بنیادوں پر استوار کیا جس کا مقصد غریب عوام کو مزارع بنا کر غربت اور استحصال کی چکی میں پسوانا اور برطانوی مفادات کی حفاظت کرنا تھا۔(1)

اس نئے طبقاتی نظام کے نتیجے میں پہلے سے موجود معاشی ڈھانچہ تباہ ہو کر رہ گیا۔

"The rise of these new social groups coincided with the relative decline of artisans, small scale agricultural producers, and in some cases the traditional elite."(2)

(معاشرے میں نئے طبقات کے ابھرنے کے ساتھ ہی روایتی کاریگروں، چھوٹے پیمانے کے زمینداروں اور روایتی اشرافیہ کا زوال شروع ہوا۔)

ان نئے "تعمیر شدہ اعلیٰ طبقات" کا مفاد چونکہ استعماری نظام کے ساتھ وابستہ تھا لہٰذا ان کی ہمدردیاں اور خدمات بھی ہمیشہ استعمار کے لیے مخصوص رہیں۔ یہی طبقات آزادی کے بعد بھی مسلم معاشروں میں استعمار کی چھوڑی ہوئی جونکوں کا کام کرتے رہے۔

غرض یہ کہ جب مسلم ممالک کو استعماری قبضے سے آزادی نصیب ہوئی تو وہ دیگر شعبوں کی طرح معاشی طور پر بھی پسماندہ تھے اس پر مستزاد ذہنی غلامی کا یہ عالم تھا کہ انہیں محسوس ہوتا تھا کہ مغرب کی مدد کے بغیر وہ اپنے پیروں پر کھڑے بھی نہ ہو سکیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ آزادی کے بعد بھی ان ممالک کو اپنی معیشت سنبھالنے اور انہیں مضبوط بنیادوں پر کھڑا کرنے میں مشکل پیش آئی۔

---

(1) "The Oxford History of Islam";pg:576

(2) // // //

5) تعلیمی میدان:

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مغرب کی نشاۃِ ثانیہ کے پیچھے ایک بہت بڑا کردار مسلمانوں نے ادا کیا تھا۔ مسلمانوں کے دورِ عروج کی خاص بات ان کی علم دوستی تھی۔ پھر ان کے زوال کی اہم وجوہات میں سے ایک یہ بھی تھی کہ انہوں نے علم اور تحقیق کے میدان میں محنت کرنا چھوڑ دی تھی۔ اس کے باوجود استعماری قبضوں سے پہلے ان میں ناخواندگی کی شرح کبھی بھی خطرناک حد تک نہیں بڑھی تھی۔ مسلم خطوں میں مغربی قبضے کے بعد تعلیمی پسماندگی خطرناک حد تک بڑھ گئی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اب ذریعۂ تعلیم عربی، فارسی یا مقامی زبانوں کی بجائے مغربی زبانیں تھیں جن سے مسلمان ناآشنا تھے اور دوسری بڑی وجہ یہ تھی کہ مغرب نے جو تعلیمی ادارے قائم کیے تھے ان میں صرف تعلیم ہی نہیں بلکہ مغربی تہذیب وثقافت کا پرچار بھی کیا جاتا تھا۔ پھر مغربی نظام تعلیم کے تحت جو مسلمان تعلیم حاصل کر کے نکلے وہ مسلمانوں سے زیادہ خود ''آقاؤں'' کے کام کے بندے تھے۔ ان کی تعلیم وتربیت ہی اس نہج پر کی گئی تھی کہ وہ مسلم معاشروں میں مغرب کے نمائندوں کی حیثیت سے فرائض انجام دیں پھر مسلم معاشروں میں مغربی تعلیم نے ایک اور بڑا المیہ یہ پیدا کیا کہ یہاں دینی اور دنیاوی تعلیم علیحدہ کر دی گئی جبکہ مسلمانوں کے روایتی نظام تعلیم میں ایسا نہیں تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اچھی نوکری اور باعزت مقام کو مغربی تعلیم کے ساتھ مشروط کر دیا گیا۔ یوں دینی علوم کی اہمیت نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔ برصغیر میں انگریز دورِ حکومت شروع ہوتے ہی علماء نے اس خطرے کو بھانپ لیا تھا لہٰذا انہوں نے اپنی پوری توجہ دینی علوم کی حفاظت، تعلیم اور اشاعت پر مرکوز کر دی۔ یوں مسلم معاشرے میں دو طبقے وجود میں آئے۔ ایک وہ طبقہ جو مغربی تعلیم سے بہرہ ور ہوا لیکن دینی علوم سے ان کا کوئی واسطہ نہ رہا۔ دوسرا وہ طبقہ جو محض مدارس اور خالص دینی علوم کے حصول تک محدود رہا اور جدید دنیا میں خود کو ''اجنبی'' محسوس کرنے لگا۔ یہ خلیج بڑھتے بڑھتے اب اس قدر وسیع ہو چکی ہے جس کا پاٹنا

نہایت مشکل نظر آتا ہے۔

آزادی کے بعد مسلم معاشروں میں تعلیمی ترقی کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ذریعۂ تعلیم کا سوال بھی تھا۔ برسوں کی غلامی کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ ''فاتحین'' کی زبان بولنے والے لوگ elite سمجھے جاتے ہیں نیز نوآبادشدہ مسلم ریاستوں کا مقتدر طبقہ چونکہ ان افراد پر مشتمل تھا جن کی تعلیم وتربیت اور ذہن سازی میں استعماری محنت صرف ہوئی تھی لہٰذا مغربی زبانوں خصوصاً انگریزی زبان میں تعلیم کا حصول ہی کامیابی اور ترقی کی ضمانت قرار دیا گیا۔ جبکہ دوسری جانب معاشروں کے وہ پس ماندہ طبقے ہیں جن کی پہنچ انگریزی ذریعہ تعلیم تک ممکن ہی نہیں ہے۔ مسلم ممالک کے طلباء اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے آج بھی مغربی تعلیمی اداروں کا رُخ کرتے ہیں اور مسلمان ممالک اس ضمن میں کوئی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں کر سکے۔

5) جغرافیائی مسائل:

مغربی استعمار مسلم خطوں کو آزادی کے ساتھ ہی جو جغرافیائی مسائل 'وراثت' میں دے کر گیا ہے وہ کئی عشروں کے بعد آج بھی امت مسلمہ کے لیے رستے ہوئے زخموں کی مانند ہیں۔ مسئلہ کشمیر اور مسئلہ فلسطین استعماری دور کی ہی پیداوار ہیں۔ پھر مغربی استعمار نے اپنے دور میں اپنے زیر قبضہ علاقوں کی سرحدوں میں جو تبدیلیاں کیں اور مسلم خطوں کی بندر بانٹ کیلئے خیالی لکیریں کھینچیں اس سارے عمل میں ان خطوں کی مقامی آبادی کے مذہبی، نسلی اور ثقافتی تعلقات کو بری طرح نظر انداز کیا اس کے نتیجے میں یہ خطے آج تک سیاسی، معاشی اور معاشرتی طور پر مسائل کا شکار ہیں۔

" Colonial empires were created without regard to preexisting ethnic identities, territorial boundaries, and the like, when the European powers withdrew,. they

typically created artifical new states by stitching together a crazy quilt of incompatible peoples and cultures (Iraq, Sudan and Nigeria are three prime examples.) Chronic political instability, coups, revolutions, civil wars and even genocide these are bitter fruits of colonialism."[1]

(استعماری طاقتوں نے اپنی نوآبادیات قائم کرتے ہوئے وہاں پر پہلے سے موجود نسلی تشخص اور علاقائی سرحدوں وغیرہ کو نظر انداز کیا۔ یورپی طاقتوں نے یہاں سے جاتے ہوئے خاص طور پر ایسی ریاستیں تشکیل دیں جن میں آبادیوں اور ثقافتوں کا تنوع غیر فطری تھا۔ دائمی سیاسی عدم استحکام، بغاوتیں، خانہ جنگیاں حتیٰ کہ نسل کشی تک یہ سب نوآبادیاتی دور کے تلخ ثمرات ہیں۔)

اس وقت کی تمام مسلم دنیا جغرافیائی طور پر غیر قدرتی اور غیر طبعی تقسیم کا شکار ہے اور اس خدشے کے پیش نظر کہ کہیں کبھی مسلمانوں میں ان حدوں کے مصنوعی ہونے کا احساس نہ جاگ جائے استعماران لکیروں پر فلسفۂ قومیت کے ایسے منتر پھونک کر گیا ہے کہ یہ لکیریں آج کے مسلمانوں کے لیے ''حبل اللہ'' سے زیادہ مقدس ہوگئی ہیں۔

یورپی اقوام پر استعماری دور کے اثرات:

خود استعماری اقوام پر طویل استعماری دور کے کئی گہرے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ ان میں سے کچھ فوری اور کچھ دوررس نتائج کے حامل تھے۔ ان کا مختصر جائزہ درج ذیل ہے۔

1) باہمی رقابت اور جنگیں:

یورپی اقوام میں زیادہ سے زیادہ نوآبادیات حاصل کرنے کی ایک دوڑ لگی تھی۔ کبھی

[1] Magstadt;"Understanding Politics";pg:219

کسی ایک خطے پر اس کی جغرافیائی اور معاشی اہمیت کی بدولت ایک سے زیادہ ملکوں کی نظر لگی ہوتی تو ان کے باہمی تعلقات کشیدہ ہو جاتے۔ کبھی باہمی رضامندی کے ساتھ کچھ لو کچھ دو پر معاملہ طے ہو جاتا (جیسے برلن کانفرنس) اور کبھی باقاعدہ جنگ تک نوبت پہنچ جاتی۔ انسائیکلوپیڈیا بریٹینیکا کے مطابق:

"..... The rivalry among the colonizing nations reached new heights. ......The struggle over contested space and for redivision of empire generated an increase in wars among the colonial powers and an intensification of diplomatic manoeuvring."(1)

(استعماری اقوام کی باہمی رقابت بڑھتی گئی.... خطوں کے حصول اور ان کی تقسیم کے جھگڑوں نے استعماری طاقتوں کے مابین جنگوں کی آگ بھڑکائی اور سفارتی سطح پر جوڑ توڑ اور سازشوں کو جنم دیا۔)

بیسویں صدی میں برپا ہونے والی دو تباہ کن عالمی جنگوں کی دیگر وجوہات میں سے ایک وجہ یہی نوآبادیات کے سلسلے میں یورپی طاقتوں کی باہمی رقابت ہی تھی۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے حامد کمال الدین لکھتے ہیں:

"دراصل ان کو یقین ہی نہیں آتا تھا کہ دنیا ان کی چیر پھاڑ کے لیے ہر رکاوٹ سے پاک ہو چکی ہے اور ان کی لوٹ مار کے لیے جہاں بھر میں اب ان کا راستہ پوری طرح صاف ہے! ابھی خلافت کے خاتمے کا رسمی اعلان نہ ہو پایا تھا کہ بھیڑیے شکار چھوڑ کر آپس میں لڑ پڑے اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کے مابین تاریخ انسانی کی دو تباہ کن ترین جنگیں پیش آ گئیں۔ جن کو دنیا آج عالمی جنگوں، یا جنگ

(1) "Encyclopedia Britanica";vol:18;pg;880

ہائے عظیم کے نام سے جانتی ہے۔" ①

2) معاشیات پر اثرات:

استعماری حملوں کا اہم ترین محرک معاشی ہی تھا۔ لہٰذا یورپی اقوام کی اقتصادی و معاشی ترقی میں بہت بڑا ہاتھ ان نوآبادیات کے وسائل کا تھا۔

جان میک لیڈ لکھتے ہیں۔

"colonialism was first and foremost a lucrative commercial operation, bringing wealth and riches to western nations through the economic exploitation of others. It was persued for economic profit, reward and riches."②

(نوآبادیاتی نظام بنیادی طور پر ایک منافع بخش تجارتی کاروبار تھا، دوسری اقوام کے معاشی استحصال کے نتیجے میں مغربی ممالک میں پیسے کی ریل پیل ہوئی۔ یہ نوآبادیاتی نظام مالی فوائد اور دولت کے حصول کے لیے ہی قائم کیا گیا تھا۔)

3) انتقال آبادی:

ایک بڑے پیمانے پر یورپی آبادی اپنے ملکوں کو چھوڑ کر اپنی نوآبادیات میں آ بسی۔ اس کی مختلف وجوہات تھیں ایک تو نوآبادیات کی زرخیز زمینوں کو یورپی اقوام کے تسلط میں دینا تاکہ مقامی لوگ ان سے فائدہ نہ اٹھا سکیں۔ دوسرا یورپی ممالک کی آبادی اور وسائل کے مابین بگڑتے ہوئے توازن کے مسئلے سے نپٹنا۔ انسائیکلوپیڈیا بریٹینیکا کے مطابق:

"An estimated 35,00,000 Europeans left their

---

① حامد کمال الدین؛ "روبہ زوال امریکن ایمپائر"؛ ص:58

② John Mcleod; "Beginning Post Colonialism";pg:9

native lands in the 100 years after 1820."①

(1820ء کے بعد کے سو سالوں میں اندازاً 35,00,000 یورپین افراد اپنے آبائی وطن کو چھوڑ گئے۔)

استعماری نفسیات

یورپ کے تمام تر استعماری عمل کے پیچھے ایک بہت بڑا عنصر نسلی تفاخر بھی تھا۔ یورپی اقوام خود کو دنیا کا نجات دہندہ تصور کرتی تھیں۔ وہ خود کو تعلیم یافتہ، مہذب اور مومن جبکہ غیر یورپی لوگوں کو جاہل، اجڈ، گنوار اور کافر کہتی تھیں۔ یہ استعماری نفسیات درحقیقت اسی رومن زعم کا تسلسل تھی جسکے تحت روم کے نزدیک ہر غیر رومی barbarian تھا اور خود رومن ''تہذیب یافتہ''۔

یورپ کی استعماری قوتوں نے دنیا کے مختلف خطوں کو اپنے استبدادی پنجوں میں جکڑنے کے لیے مختلف تدابیر اور لائحہ عمل اختیار کیے لیکن ''نسلی تفاخر'' کا احساس ان سب میں مشترک تھا۔ ہر استعماری طاقت یہی سمجھتی تھی کہ ''غیر مہذب'' لوگوں کو زیر کر کے اور انہیں اپنی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ کر وہ درحقیقت ان کی بہتری، بھلائی اور نجات کا سامان کر رہی ہے اور اپنی ذمہ داری نبھا رہی ہے۔ دی آکسفورڈ ہسٹری آف اسلام کے مطابق:

" The ideology of colonialism was rooted at some level in the belief that the European power had a paternal responsibility for their subjects. This meant that not only were they obliged to protect and manage them but also to strive to better them."②

---

①"Encyclopedia Britanica";vol:18;pg:879

②"The Oxford History of Islam" pg: 560

(استعماری نظریے کی جڑیں بڑی حد تک اسی یورپی نفسیات سے پھوٹتی ہیں جس کے مطابق وہ سمجھتے ہیں کہ انسانیت کی ذمہ داری ان کے کندھوں پر ہے۔یعنی نہ صرف ان کی حفاظت ونگرانی کا کام بلکہ ان کی بہتری اور بھلائی کے لیے کوشش کرنا بھی ان ہی کا پیدائشی فریضہ ہے۔)

نوآبادیاتی طاقتوں نے اپنے زیر قبضہ عوام کو جاہل اور وحشی قرار دے کر ان کے اوپر ہر طرح کا ظلم روا رکھنے کا جواز پیدا کیا۔

ڈاکٹر مبارک علی اپنی تصنیف ''برطانوی راج ایک تجزیہ'' میں لکھتے ہیں:

''نوآبادیاتی طاقتیں مقامی لوگوں کو انسانیت کے درجے سے گرا کر انہیں وحشی اور جانوروں کی صف میں لا کر اخلاقی طور پر سمجھتے ہیں کہ چونکہ وہ مہذب برتر اور افضل ہیں اس لیے خدا نے انہیں فتح دی ہے اور ان لوگوں کو ان کی ماتحتی میں دیا ہے۔برتر اور اعلیٰ ہونے کی حیثیت سے یہ ان کا اخلاقی فرض ہے کہ ان کی زمین پر قبضہ کریں ان کی جائیدادوں کو ہتھیا لیں ان کے مال اور ان کی دولت کو چھین لیں اور انہیں مجبور کریں کہ وہ ان کے مقاصد کے تحت کام کریں''۔[1]

لہٰذا یورپ کی استعماری طاقتوں نے اپنے استعماری عمل کو قدرت کی طرف سے ودیعت کردہ حق اور اپنی مذہبی واخلاقی ذمہ داری اور فرض قرار دیا:

"The Portuguese and Spanish regarded their acquisitions as contributing to the greater glory of God. In more secular terms France invoked the 'mission civilisatrice', the Pragmatic British spoke of the white man's burden. Each Power insisted that

[1] ڈاکٹر مبارک علی: ''برطانوی راج (ایک تجزیہ)''؛ص:49

empire building was in part unselfish, even noble".①

(پرتگال اور سپین نے اپنے استعماری قبضوں کی یہ توجیہہ پیش کی کہ وہ خدا کی کبریائی بیان کرنے میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ فرانس نے اپنے استعماری اقدامات کے لئے مذہبی اصطلاحات کا سہارا لینے کی بجائے یہ کہا کہ وہ ایک تہذیبی مشن پورا کر رہے ہیں۔ برطانیہ نے اپنی استعماری ذمہ داریوں کو گوری اقوام کے کندھوں پر پڑا بوجھ قرار دیا۔ ہر استعماری طاقت مصر رہی کہ اس کے سامراجی اقدامات نہ صرف بے لوث اور بے غرض ہیں بلکہ عظیم ہیں۔)

نسلی تفاخر کے اس زعم کو چارلس ڈارون کے نظریات نے مزید مہمیز بخشی۔ انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں ڈارون کے فلسفۂ ارتقاء نے ایک نسل کی دوسری نسل پر "برتری" کے نظریے کو گویا سائنسی "سند" فراہم کردی۔

"This colonial expansion was justified by pseudoscientific argument, grounded in a vulgarized version of Darwin, the 'survival of the fittest'."②

(نوآبادیاتی توسیع کے جواز میں جعلی سائنسی منطقین پیش کی گئیں جن کی بنیادیں ڈارون کے نظریہ "Survival of the Fittest" کی من مانی توجیہہ پر اٹھائی گئی تھیں۔)

ڈارون کے نظریے کو استعماری طاقتوں نے اس بات کے ثبوت کے طور پر پیش کیا کہ نوآبادیاتی قبضہ جات اور اقدامات درحقیقت ایک بالکل قدرتی امر ہے:

"Charles Darwin's concept of the survival of the

① "The Oxford Companion to Politics of the World"; Oxford University Press; New York, Oxford, 1993; pg:156

② "The Oxford Companion to Politics of the World"; pg:156

fittest was used to 'porve' colonialism was in accordance with the inexorable laws of nature . Rudyard Kipling wrote about the white man's burden of spreading civilization to a benighted world...... "①

(''طاقتور کی بقاء'' سے متعلق چارلس ڈارون کے نظریے کی مدد سے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ استعماری نظام قدرتی قوانین کی منشاء کے مطابق ہے۔ رُڈ یارڈ کپلنگ نے لکھا کہ یہ سفید فام باشندوں کی بھاری ذمہ داری ہے کہ وہ جہالت کے اندھیروں میں بھٹکتی انسانیت کو تہذیب سکھائیں۔)

ان نظریات کا پرچار اتنے شدومد کے ساتھ اور اتنے بڑے پیمانے اور منظم انداز میں کیا گیا کہ یورپی عوام کے اندر اپنی حکومتوں کے ان ظالمانہ استعماری واستبدادی اقدامات سے متعلق کوئی احساس جرم یا ضمیر کی خلش پیدا ہی نہیں ہونے دی گئی۔ اس کے برعکس عام یورپیوں کا رویہ بھی غیر یورپیوں کے لیے تضحیک اور حقارت پر مبنی تھا۔

ڈاکٹر مبارک علی اپنی کتاب ''برطانوی راج ایک تجزیہ'' میں سر سید احمد خان کے مضمون ''نئی تہذیب'' سے ایک اقتباس نقل کرتے ہیں:

> ''جب یورپین جینٹلمین مخلع بالطبع ہو کر ہماری قوم کے پرانے فیشن کی تضحیک کرتے ہیں تو کوئی درجہ حقارت کا اٹھا نہیں رکھتے۔ کہتے ہیں کہ ہندوستانی بندر کے موافق ہیں جو چوتڑوں کے بل زمین پر بیٹھتے ہیں۔ بندر کے موافق کھانے میں ہاتھ سان کر ہاتھ سے کھانا کھاتے ہیں۔ کوئی تمیز ان کی معاشرت میں نہیں ہے۔ وحشیوں سے کسی قدر بہتر ان کا لباس ہے گو قطع اس کے مشابہ ہے جو جنگلی، وحشی، نامہذب قومیں اب تک پہنتی ہیں۔''②

---

① Magstadt; "Understanding Politics";pg:218

② ڈاکٹر مبارک علی: ''برطانوی راج (ایک تجزیہ)''؛ ص:59

لہٰذا صدیوں پر محیط یورپی استعمار کے ناجائز قبضوں اور ظالمانہ اقدامات، ناانصافی اور لوٹ کھسوٹ کو یورپی اقوام کی نسلی برتری کے نظریات اور اس ''برتری'' کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ''احساس ذمہ داری'' کے فلسفے نے جواز فراہم کیے رکھا۔

باب دوم:

﴿نو استعماری نظام: تعریف اور اہداف﴾

فصل اول:

نو استعماری نظام (Neo-Colonialism) کی تعریف

دوسری جنگ عظیم کے بعد کا دور دنیا سے نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کا دور تو ضرور ہے لیکن اگر یہ پوچھا جائے کہ کیا اس دنیا سے امپیریلزم (Imperialism) کا نام ونشان بھی مٹ گیا ہے تو اس کا جواب یقیناً نفی میں ہوگا۔ استعماری نظام کے خاتمے کے ساتھ ہی دنیا میں سامراجیت یا امپیریلزم کی ایک نئی قسم کے دور کا آغاز ہوتا ہے جسے جدید نوآبادیاتی نظام یا نو استعماری نظام (Neo-colonialism) کا عنوان دیا جاتا ہے:

"In place of colonialism as the main instrument of imperialism we have today neo-colonialism."[1]

(نوآبادیاتی نظام کی جگہ اب سامراجیت کی نئی قسم neo-colonialism نے لے لی ہے۔)

اس سلسلے میں کچھ اہم مباحث پیدا ہوتے ہیں:

1) نو استعماری نظام سے کیا مراد ہے؟

2) اس نظام کے کیا مقاصد ہیں؟

---

[1] Kwame Nkrumah; "Neo-Colonialism the Last Stage of Imperialism"; International Publishers New York. 1966: pg:ix(Introduction)

3) اس نظام کا طریقۂ کار کیا ہے؟

4) نو استعماری نظام کے علمبردار ممالک اور اقوام کون کون سی ہیں؟

5) اس نظام کے اہداف ممالک اور اقوام کون کون سی ہیں؟

Neo-Colonialism یا نو استعماری نظام درحقیقت اسی قدیم استعماری نظام اور نظریئے کی جدید شکل ہے جس کے تحت کمزور اقوام کے وسائل، ان کی تہذیب، تمدن، مذہب اور روایات پر طاقتور اقوام کا حریصانہ شکنجہ کسا جاتا ہے۔ درحقیقت Imperialism ایک ایسا فلسفہ ہے جو ہر دور کی نفسیات اور حالات کے مطابق اپنی شکل ڈھال لیتا ہے۔

"....imperialism simply switches tactics."[1]

(سامراجیت صرف اپنا چولا ہی بدلتی ہے۔)

موجودہ دور کیونکہ ''انسانی آزادی''، ''حقوق''، ''مساوات'' اور ''شعور'' کے نعروں کا دور ہے لہٰذا کسی ملک کی آزادی پر براہ راست شبخون مارنا کوئی ''مہذب'' عمل نہیں سمجھا جاتا ۔چنانچہ دور حاضر کی استعماری قوتیں بلاواسطہ اور براہ راست قبضوں کی بجائے جن بالواسطہ حربوں اور طریقوں کے ذریعے اپنے مقاصد کی تکمیل کرتی ہیں وہ مابعد نو آبادیاتی فلسفے کے تحت بیان ہوتے ہیں۔ کئی ایسے ممالک جو سیاسی طور پر بظاہر آزاد اور خود مختار نظر آتے ہیں انہیں مختلف حربوں اور طریقوں سے یوں دبا کر رکھنا کہ وہ اپنے داخلی و خارجی فیصلوں، اپنے وسائل کے استعمال، عوام پر لگائے جانے والے ٹیکس اور اپنی دیگر پالیسیوں کی تشکیل کے لیے ''بڑی طاقتوں'' کے محتاج رہیں۔ یہی نو استعماری نظام کی روح ہے۔ Kwame Nkrumah لکھتے ہیں:

"The essence of neo colonialism is that the state

---

[1] Kwame Nkrumah: "Neo-Colonialism: the Last Stage of Imperialism": pg:239

which is subject to it is, in theory, independent and has all the ontward trappings of international sovereignty. In reality its economic system and thus its political policy is directed from outside."(1)

(نو استعماری نظام کی جوہری خصوصیت یہ ہے کہ اس کی شکار ریاست بظاہر آزاد نظر آتی ہے، دنیا میں ایک خود مختار ریاست کے طور پر جانی جاتی ہے لیکن درحقیقت اس کا معاشی نظام اور (نتیجتاً) اس کا سیاسی نظام بھی کسی بیرونی قوت کے زیر اثر ہوتا ہے۔)

لہٰذا نو استعماری نظام یا (neo-colonialism) کی اصطلاحات اس استعماری عمل پر منطبق ہوتی ہیں جو decolonization کے بعد کے دور میں نئی شکل اور نئے طریقوں کے ساتھ جاری وساری ہے۔

"neo-colonialism is the continued exercise of political or economic influence over a society in the absence of formal political control."(2)

(نو استعماری نظام سے مراد ہے کسی معاشرے پر باقاعدہ سیاسی تسلط حاصل کیے بغیر وہاں کے سیاسی واقتصادی معاملات پر اثر ورسوخ کا تسلسل قائم کرنا۔)

نو استعماری نظام درحقیقت کئی صدیوں تک جاری رہنے والے استعماری نوآبادیاتی نظام سے زیادہ خطرناک نظام ہے کیونکہ اس کا شکار اقوام اپنے آپ کو "آزاد" سمجھتی ہیں۔ انہیں یہ باور کروا دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے فیصلے کرنے اور اپنی پالیسیاں بنانے میں آزاد اور خود مختار ہیں جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہوتی ہے۔ عموماً ان ممالک کا حکمران طبقہ بڑی طاقتوں

(1) Kwame Nkrumah; "Neo-Colonialism: the Last Stage of Imperialism" pg:ix(Introduction)

(2) "The Concise Encyclopedia of Sociology"; pg:71

کے ہاتھ میں کٹھ پتلیوں کی طرح حرکت کرتا ہے۔ بیرونی استعمار سے آزادی حاصل کرنے والے ممالک میں عموماً آزادی کے بعد وہی طبقات برسراقتدار آتے ہیں جن کی تعلیم وتربیت اور ذہن سازی استعماری آقاؤں کے ہاتھوں میں ان ہی کے بنائے ہوئے نظام تعلیم کے تحت ہوئی ہوتی ہے۔لہٰذا یہ بااثر اور حکمران طبقہ اس نئے استعماری نظام میں اپنے پرانے آقاؤں کے مقاصد کی تکمیل کرتا ہے:

"...the new elites brought to power by independence, and often educated and trained by the colonist powers, were unrepresentative of the people and acted as unwitting or even willing agents for the former colonial rulers."[1]

(آزادی کے نتیجے میں برسراقتدار آنے والی اشرافیہ کی تعلیم وتربیت اکثر وبیشتر نوآبادیاتی طاقتوں کے ہاتھوں ہوتی تھی۔ یہ عوام کا نمائندہ طبقہ نہیں تھا۔ انہوں نے دانستہ یا نادانستہ سابقہ نوآبادیاتی آقاؤں کے ایجنٹوں کا کردار ادا کیا۔)

نو استعماری نظام کے مقاصد:

پلوٹو پریس، برطانیہ کے مینجنگ ڈائریکٹر ڈاکٹر روجروان زوانن برگ دور حاضر کی سامراجیت پر بحث کرتے ہوئے ان کے مقاصد پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:

"کسی بھی دور کی بالا دست طاقت اپنا تسلط چاہتی ہے۔ اپنے مقتدر طبقوں کو زیادہ سے زیادہ دولت مند بنانے کی خواہش مند ہوتی ہے اور اس کی کوشش ہوتی ہے کہ باقی دنیا اس سے خوفزدہ رہے۔ آج کی دنیا میں بھی ایسی کوئی چیز نہیں جسے

[1] Bill Ashcraft, Gareth Griffiths, and Halen Tiffen; "Post Colonial Studies: The New Concepts"; Routledge, London, and New York, 2013; pg:178

مہربان سامراجی طاقت کہا جا سکے۔"①

لہٰذا اس نظام کے بنیادی مقاصد بھی وہی ہیں، یعنی "تیسری دنیا" کے وسائل پر قبضہ کرنا اور انہیں اقتصادی نفسیاتی اور سیاسی طور پر اتنا دبانا کہ وہ سر نہ اٹھا سکیں۔ لیکن موجودہ دور کے حالات مختلف ہیں۔ طویل عرصے پر مشتمل یورپی استعماری دور کا قدرتی نتیجہ یہ نکلا ہے کہ دنیا میں اس عمل کے خلاف نفرت اور بغاوت کے جذبات پیدا ہوئے ہیں لہٰذا جب استعماری طاقتوں نے یہ محسوس کیا کہ غلام قومیں اپنی آزادی اور خودمختاری کی قیمت اپنا خون دے کر چکانے کو تیار ہیں تو انہوں نے بظاہر تو ان خطوں سے اپنا بوریا بستر لپیٹ لیا لیکن اپنے استعماری مقاصد کے حصول کے لیے نئے حربے ایجاد کر لئے۔

"Faced with the militant peoples of the ex-coloinal territories... imperialism simply switches tactics.... it claims that it is 'giving' independence to its former subjects... under cover of such phrases, however, it devises innumerable ways to accomplish objectives formerly achieved by naked colonialism. It is this sum total of these modern attempts to perpetuate colonialism while at the same time talking about 'freedom' which has come to be known as 'neo-colonialism'②

---

① روجروان زوانن برگ؛ مضمون: "عصرِ حاضر کی استعماریت اور عالمگیریت" (مترجم: ثروت جمال اصمعی)؛ مجلہ: "مغرب اور اسلام"، رسالہ نمبر: 34، خصوصی شمارہ 2010، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد؛ ص: 23

②Kwame Nkrumah; "Neo-Colonialism:.... pg:239

(سامراجیت کو اپنی نو آبادیات میں حریت پسند جنگجوؤں سے واسطہ پڑتا ہے تو وہ اپنا چولا بدل لیتی ہے۔ وہ اپنی نو آبادیات کو آزادی عطا کرنے کا دعویٰ کرتی ہے لیکن پس پردہ یہ طاقتیں اپنے سامراجی مقاصد کے حصول کے لیے واضح استعماری حربوں کی جگہ مزید بے شمار طریقے ایجاد کر لیتی ہیں۔ آزادی کے اعلان کے بعد استعماری مقاصد کی تکمیل کے لیے ایجاد کردہ جدید طریقوں پر عمل درآمد کو ہی neo-colonialism یا نو استعماریت کا نام دیا جاتا ہے۔)

لہٰذا یہ کہنا بالکل غلط ہوگا کہ decolonization کا دور غلام قوموں کی آزادی اور خود مختاری حاصل کرنے کا دور تھا۔ حقیقت یہ ہے استعمار لالچ، ہوس اور خود غرضی پر مشتمل مقاصد کی تکمیل کا دوسرا نام ہے اور اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے آج استعماری فلسفے نے اپنا پینترا بدل کر خود کو ''جدید دور کے تقاضوں'' کے مطابق ڈھال لیا ہے۔

"Thus colonialism, far from disappearing as the century goes on, too often merely modified and developed into the neo -colonialism of the post-independence period."[1]

(لہٰذا استعماری نظام پچھلی صدی میں جڑ سے ختم نہیں ہو گیا تھا بلکہ نو آبادیات کی 'آزادی' کے بعد نو استعماری نظام کی تبدیل شدہ اور ترقی یافتہ شکل اختیار کر گیا تھا۔)

نو استعماری نظام کا طریق کار:

نو استعماری نظام یا جدید نو آبادیاتی نظام کا سب سے مؤثر ''طریقۂ واردات'' تو یہ ہے کہ یہ استعماری طاقتیں اپنے اہداف ممالک کے ان طبقات کو اپنے قابو میں کرتی ہیں جو

[1] Bill Ashcraft, Gareth Griffiths, and Halen Tiffen; "Post Colonial Studies: The New Concepts"; pg:58

معاشرے کے بااثر طبقات سمجھے جاتے ہیں مثلاً حکمران، لیڈر، دانشور اور میڈیا وغیرہ (یا یہ استعماری طاقتیں اپنے کام کے بندوں کو معاشرے کے بااثر طبقات بنا دیتی ہیں۔) یہ معاشرے کا elite طبقہ کہلاتا ہے اور اس کے لیے ''comprador'' کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔

"In post colonial theory, the term (comprador)has evolved a broader use, to include the intelligentsia _academics, creative writers and artists_ whose independence may be compromised by a reliance on and identification with colonial power."[1]

(مابعد نوآبادیاتی نظریات میں ''comprador'' کی اصطلاح وسیع معنوں میں استعمال ہوئی ہے۔ اس میں دانشوروں، علمی اشرافیہ، مصنفین اور فنکاروں وغیرہ کے وہ طبقات بھی شامل ہیں جن کا انحصار نوآبادیاتی طاقتوں پر ہوتا ہے اور وہ اپنی آزادی کو ان کے پاس گروی رکھوا دیتے ہیں۔)

ان لوگوں کے تمام مفادات استعماری اور نوآبادیاتی طاقتوں کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں۔ یورپی استعماری دور میں باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت ایسا طبقہ وجود میں لانے کے لئے وقت، محنت اور پیسہ صرف کیا گیا جو گورے آقاؤں کی واپسی کے بعد ان کے قائم مقام کے طور پر ''استعماری فرائض'' انجام دے سکے۔

"...the colonial powers deliberately avoided granting independence until they had through internal discriminations and hegemoic educational practices

---

[1] Bill Ashcraft, Gareth Griffiths, and Halen Tiffen; "Post Colonial Studies: The New Concepts";pg:62

created an elite (comprador) class to maintain aspects of colonial control on their behalf but without the cost or the opprobrium associated with the classic colonial models."[1]

(استعماری طاقتوں نے اپنی نوآبادیات کو آزاد کرنے کا اعلان اس وقت تک نہیں کیا جب تک کہ انہوں نے متعصبانہ اور استبدانہ تعلیمی نظام کے ذریعے ایک ایسی اشرافیہ تیار نہیں کر لی جو ان طاقتوں کی جگہ ان کے استعماری مقاصد کی تکمیل کرے اس طرح دنیا کے سامنے روایتی نوآبادیاتی نظام کی شکل کے بغیر ان طاقتوں کے مقاصد پورے ہوتے رہیں۔)

ان جدید استعماری طاقتوں کا ایک اور طریقۂ کار ''aids'' کی فراہمی بھی ہے۔ یہ طاقتیں تیسری دنیا کے ممالک کو مختلف مدوں میں ''امداد'' فراہم کرتی ہیں مثلاً کبھی ''تعلیمی میدان میں ترقی'' اور کبھی ''صحت عامہ'' کی مد میں اور کبھی سرمایہ کاری کے نام پر لیکن اس امداد اور سرمایہ کاری کی فراہمی کے پیچھے جو شرائط وضوابط اور طریقۂ کار طے کیے جاتے ہیں ان میں صرف اور صرف بڑی طاقتوں کے مفادات کا ہی خیال رکھا جاتا ہے۔ سارا سرمایہ آخرکار پھر بڑھ چڑھ کر انہی کی جیب میں جاتا ہے جبکہ نو استعماری نظام کے شکنجے میں پھنسے ہوئے بظاہر آزاد عوام کے لیے وہ ''اعلیٰ معیار زندگی'' محض ایک سراب ہی ہوتا ہے، جس کا وعدہ ان سے کیا جاتا ہے۔

".....thus, 'aid' turns out to be another means of exploitation, a modern method of capital export under

---

[1] Bill Ashcraft, Gareth Griffiths, and Halen Tiffen; "Post Colonial Studies: The New Concepts"; pg:74

a more cosmetic name."(1)

(لہٰذا 'امداد' درحقیقت 'استحصال' کا ہی ایک اور ذریعہ ثابت ہوتی ہے۔ خوش نما اصطلاحات کے پردے میں بڑی طاقتوں کے کاروباری مفادات کا ایک نیا طریقہ۔)

غیر ملکی امداد کی ایک اہم مد ''عسکری امداد'' بھی ہے جو ان نو استعماری طاقتوں کا اہم حربہ ہے۔ جہاں کہیں عوام اپنے حالات سے تنگ آ کر بغاوت پر اتر آئیں یا بھوک جہالت، ناانصافی ملک میں خانہ جنگی کے حالات پیدا کر دیں یا دو کمزور ممالک کے درمیان آپس میں کشیدگی پیدا ہو جائے تو من مانی شرائط اور قیمت پر اسلحہ کی فراہمی اور عسکری امداد بھی ان بڑی طاقتوں کی ''سخاوت'' کا ایک ثبوت ہے۔ ایک فریق کو اعلانیہ اپنی حمایت کا یقین دلا کر مدد فراہم کرنا اور دوسرے فریق کو در پردہ امداد فراہم کر کے دونوں کی چپقلش کو ہوا دینا، انہیں لڑوا کر اتنا کمزور کر دینا کہ وہ اپنے survival کے لیے انہی طاقتوں کی دست نگر ہو کر رہ جائیں۔

" Once a neo-colonist territory is brought to such a state of economic chaos and misery that revolt actually breaks out then, and only then, is there no limit to the generosity of the neo-colonial overlord, provided of course that the funds supplied are utilised exclusively for military purposes."(2)

(پہلے تو نو استعماری طاقتیں کسی خطے کو اقتصادی بدحالی اور خستہ حالی کا شکار بناتی ہیں اور پھر وہاں بغاوت پھوٹ پڑتی ہے۔ صرف اور صرف ایسی ہی صورت حال میں ان نو استعماری طاقتوں کی 'دریادلی' کی کوئی حد نہیں رہتی لیکن یہ طاقتیں اس بات کو بھی یقینی بناتی

---

(1) Kwame Nkrumah; "Neo-Colonialism:... pg:242

(2) // // // pg:xvi(Introduction)

ہیں کہ ان کی فراہم کردہ امداد کے ذریعے لڑائی کے شعلوں کو مزید بھڑکایا جائے۔)

یہاں تک کہ اگر کسی خطے میں امن وامان ہو تو یہ طاقتیں باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت بھی ایسے حالات پیدا کر دیتی ہیں کہ لوگوں میں نفرتیں اور غلط فہمیاں پروان چڑھیں۔ یوں یہ اپنے صدیوں کے آزمودہ نسخے "Divide and Rule" پر عمل کرتی ہیں۔

غرض یہ کہ نو استعماری طاقتوں کے طریقہ کار میں سیاسی اور معاشی ہتھکنڈے سب سے اہم ہیں لیکن ان کے علاوہ بھی کئی راستے اور طریقے اپنائے جاتے ہیں جن کے ذریعے یہ طاقتیں اپنے مقاصد حاصل کر سکیں۔ یہ اپنے اہداف ممالک کی تہذیب، عقائید، سیاست، ثقافت، ان کی خوبیاں اور خامیاں ان سب پر تحقیق کر کے اپنی منصوبہ بندی کرتے ہیں۔

"...the methods of neo-colonists are subtle and varied. They operate not only in the economic field, but also in the political, religious, ideological and cultural spheres."[1]

(نو استعماری طاقتوں کے حربے نہایت پراسرار اور متنوع ہوتے ہیں ان کا دائرہ کار صرف معاشی میدان تک محدود نہیں بلکہ سیاسی، مذہبی، نظریاتی، اور ثقافتی میدانوں تک پھیلا ہوا ہے۔)

اگر ہم ان جدید نو آبادیاتی طاقتوں اور قدیم استعماری طاقتوں کے مقاصد اور طریقہ کار کا تقابلی جائزہ لیں تو ہمیں زیادہ فرق نظر نہیں آتا۔ قدیم استعماری طاقتوں کا مقصد بھی دوسرے ملکوں اور قوموں کے وسائل پر قبضہ کرنا تھا اور آج کی جدید نو آبادیاتی طاقتوں کا مقصد بھی یہی ہے۔ یورپ کی استعماری اقوام نے بھی براہِ راست عسکری اور فوجی کارروائی کر کے مختلف ممالک کو فتح کرنے کی بجائے کہیں تجارتی سرگرمیوں کی اوٹ میں اپنے قدم مضبوط کیے اور کہیں امداد اور قرضوں کے ذریعے حکمرانوں کو اپنے زیر بار کیا، کہیں ''امن

[1] Kwame Nkrumah; "Neo-Colonialism:....."; pg:239

دامان'' قائم کرنے کے لیے ''مینڈیٹ'' حاصل کیے اور کہیں ترقیاتی منصوبوں کے پردے میں اپنے سرمائے کو تقویت دی۔ آج بھی صرف چہرے اور عنوانات بدلے ہیں۔ قدرتی وسائل اور افرادی قوت سے مالا مال خطے بظاہر آزاد ہونے کے باوجود آج بھی استعماری استبداد کا شکار ہیں۔ یہ استعماری قوتیں اپنے زیر قبضہ علاقوں کو آزادی دیتے ہوئے ایسے جغرافیائی، معاشی، نفسیاتی اور سیاسی مسائل میں الجھا کر گئی ہیں کہ یہاں کے عوام آج بھی خود کو کسی نادیدہ جال کی گرفت میں محسوس کرتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ قدیم استعماری نظام میں غلام قوم کم از کم اپنے دشمن کو پہچان سکتی تھی، اس کے خلاف مزاحمت کر سکتی تھی لیکن سامراجیت کا یہ موجودہ نظام اسی لیے زیادہ خطرناک اور ظالم ہے کیونکہ اس میں قبضہ کار خود سامنے آئے بغیر اپنے استحصالی مقاصد کی تکمیل کرتے ہیں:

"It was easy to define the enemy in a colonial army or in the face of some colonial administration. Colonialism continues but it appears that it is much more difficult for local people to point the finger and say exactly what is happening and who their enemies are." (1)

(نوآبادیاتی افواج یا حکومتوں کی صورت میں تو دشمن کی پہچان بہت آسان تھی۔ نوآبادیاتی نظام آج بھی جاری ہے لیکن اس کا شکار مقامی آبادیوں کے لیے اب اپنے دشمن کی واضح پہچان بے حد مشکل ہے۔)

(1) Noam Chomsky and Andre Vltchek; "On Western Terrorism.....";pg:6

فصل دوم:

نواستعماری نظام کی علمبردار اقوام اور ان کے اہداف

نشاۃِ ثانیہ کے دور میں طلوع ہونے والا یورپی اقبال کا سورج بیسویں صدی کے پہلے نصف میں غروب ہوا۔ دو عظیم جنگوں نے یورپ کی کمر بری طرح توڑ دی تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب دنیا میں دو نئی طاقتوں کا ظہور ہوا۔ یہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور سویت یونین کے ممالک تھے۔ ان دونوں طاقتوں نے خود کو انسانی حقوق کی حفاظت، مساوات اور آزادی کا علمبردار قرار دینے میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا لیکن تاریخی حقائق ان دونوں طاقتوں کے دعووں کو جھٹلانے کے لیے کافی ہیں۔ روس نے ایک طویل عرصے تک وسطِ ایشیا کی مسلمان ریاستوں پر اپنا جابرانہ تسلط قائم رکھا اور وہاں کے عوام کی مذہبی، سیاسی اور ثقافتی آزادی کو بزورِ شمشیر کچل دیا۔ انیس سو نوے کی دہائی میں افغانستان سے ٹکرانے کے نتیجے میں جب روس ٹوٹا تو ان ریاستوں کو بھی آزادی نصیب ہوئی۔ جبکہ اس واقعے کے نتیجے میں ریاستہائے متحدہ امریکہ دنیا کی واحد ''سپر پاور'' بن کر ابھرا۔ گزشتہ کئی دہائیوں کے واقعات یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ دورِ حاضر کی سب سے بڑی استعماری قوت جو آج ساری دنیا کے وسائل ہڑپ کرنے کے درپے ہے وہ ریاستہائے متحدہ امریکہ ہے۔

وہ دور جسے نوآبادیات کی آزادی کا دور (decolonization) کہا جاتا ہے حقیقی آزادی کا دور نہیں بلکہ محض ایک عبوری دور تھا جس کے دوران مغربی استعماری سیادت کا پرچم یورپ کی بجائے اٹلانٹک کے پار منتقل کیا گیا تھا۔

ہنٹگٹن کے مطابق:

"....In the 1940's, however, the American phase of western domination began.... post war decolonization

further reduced European influence but not that of the United States, which substituted a new transnational imperialism for the traditional territorial empire."[1]

(انیس سو چالیس کی دہائی میں مغربی تسلط کا امریکن دور شروع ہوا۔ عالمی جنگوں کے بعد نوآبادیاتی خطوں کی آزادی کے ساتھ یورپی اثر ورسوخ میں کمی آئی۔ اس کمی کو ریاستہائے متحدہ امریکہ نے اس طرح پورا کیا کہ روایتی علاقائی سامراجیت کی جگہ بین الاقوامی سامراجیت کو فروغ دیا۔)

نو استعماری نظام کے اس دور میں امریکہ کی عسکری، سیاسی اور سائنسی برتری نے اسے دنیا کی سب سے بڑی استعماری قوت کے طور پر متعارف کروایا ہے:

Kwame Nkrumah لکھتے ہیں:

"...Foremost among the neo-colonist is the United States...After world war II... with methodical thoroughness and touching attention to detail, the Pentagon set about consolidating its ascendancy, evidence of which can be seen all around the world".[2]

(نو استعماری طاقتوں میں سب سے پہلا نام ریاستہائے متحدہ امریکہ کا ہے۔۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد پینٹاگون نے نہایت باریک جزئیات تک کو نظر میں رکھتے ہوئے ایک مربوط حکمتِ عملی ترتیب دی تا کہ امریکہ کی بالادستی قائم کی جا سکے اس کا ثبوت آج ہمیں ساری دنیا میں نظر آتا ہے۔)

---

[1] Huntington; "The Clash of Civilizations and the Remaking of World Order";pg:83

[2] Kwame Nkrumah; "Neo-Colonialism......"; pg:239

اس ضمن میں ایک بے حد دلچسپ irony یہ ہے کہ امریکہ خود کو انسانی حقوق اور آزادی و مساوات کا علمبردار کہلاتا ہے گویا وہی نفسیات اور احساس برتری یہاں بھی کارفرما ہے جو ہمیں یورپی استعماری دور میں نظر آتی تھی۔ کل یورپ کو زعم تھا کہ زیادہ مہذب اور زیادہ تعلیم یافتہ ہونے کی بنا پر ان کے کندھوں پر دنیا کو ''civilize'' کرنے کی بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور آج امریکہ کا دعویٰ ہے کہ دنیا میں امن، آزادی، تہذیب اور انسانی حقوق کا علمبردار اگر کوئی ہے تو وہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ امریکہ کی پوری تاریخ بے گناہ انسانوں کے سفاکانہ قتل عام سے عبارت ہے۔ سید منور حسن، میر بابر مشتاق کی تصنیف ''امریکی دہشت گردی، تاریخ اور اثرات'' کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

''امریکہ اپنے سیاسی اور عسکری غلبہ کے ذریعے سے پوری دنیا کو نیست و نابود کر رہا ہے۔ امریکی چیرہ دستیوں سے کوئی محفوظ نہیں ہے اور روز بروز ان میں اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے''۔ [1]

دوسرے ممالک کو دھمکانا، ان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنا، اپنی مرضی سے دوسرے ممالک میں حکومتیں قائم کرنا اور ان کو گرانا امریکہ اپنا پیدائشی حق سمجھتا ہے۔ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے سیاسی و سفارتی حربے، عسکری کارروائیاں، دھونس، دھاندلی، دھمکیاں غرض یہ کہ ہر طرح کا جائز و ناجائز قدم اٹھانا اور پھر خود کو اس پر حق بجانب سمجھنا اور ثابت کرنا، پچھلی کئی دہائیوں سے امریکی پالیسی یہی چلی آرہی ہے۔

میر بابر مشتاق لکھتے ہیں:

''امریکہ۔۔۔ دنیا کے وسائل کو حاصل کرنے کے لیے بے صبری، بے ایمانی،

---

[1] سید منور حسن؛ پیش لفظ: ''امریکی دہشتگردی: تاریخ اور اثرات''؛ از میر بابر مشتاق، عثمانی پبلی کیشنز، کراچی، جولائی 2012؛ ص:11

ناشکری و بے قراری کا لبادہ اوڑھے اندھا دھند اخلاقی قدروں کو روندتے ہوئے آگے بڑھ رہا ہے۔"[1]

دنیا کا کوئی قانون، کوئی بین الاقوامی اخلاقی ضابطہ اور کسی قسم کی کوئی انسانی قدریں امریکی استعماری عزائم کے راستے کی رکاوٹ نہیں بنتیں۔ اس سلسلے میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے اپنا ایک الگ ضابطۂ اخلاق بنا رکھا ہے جو

National Security Strategy of the United States of America

کے عنوان سے ساری دنیا پر ٹھونس دیا گیا ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق امریکہ جب، جہاں اور جس کے خلاف یہ "تصور" کرے کہ فلاں ملک یا قوم اس کی سلامتی کے لیے خطرہ ہے تو وہ اس پر کسی بھی قسم کی فوجی، عسکری یا جارحانہ کارروائی کرنے کا حق محفوظ رکھتا ہے۔ اس قانون پر تبصرہ کرتے ہوئے نوم چومسکی کہتا ہے:

"...The report proposed some what novel and unusually extreme doctorine on the war of force in the world.... a doctorine that does not begin to have any grounds in international law, namely 'Preventive war'. That is, the United States will rule the world by force, and if there in any challange to its domination, whether it is perceived in the distance, invented, imagined, or what ever then the United States will have the right to distroy the challange before it

---

[1] میر بابر مشتاق: "امریکی دہشتگردی: تاریخ اور اثرات"؛ ص: 144

becomes a threat."(1)

(یہ رپورٹ کچھ انوکھے اور دنیا میں طاقت کے استعمال کے انتہا پسندانہ نظریات پر مشتمل ہے۔۔۔اس رپورٹ کا 'دفاعی جنگ' کے بین الاقوامی قانون سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔اس کے مطابق ریاستہائے متحدہ امریکہ دنیا پر حکومت کرے گا اور اس کی بالادستی کے راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ، چاہے وہ خیالی ہی ہو امریکہ اسے حقیقی خطرہ بننے سے پہلے ہی تباہ کر دے گا۔)

لہٰذا یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے اور خود غیر جانبدار مغربی مفکرین بھی اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ دورِ حاضر کی سب سے بڑی استعماری قوت خود ریاست ہائے متحدہ امریکہ ہے اور اپنے استعماری عزائم کی تکمیل کے لیے اس ملک نے ظلم، ناانصافی اور بربریت کی جو داستانیں رقم کی ہیں ان کی مثال استعمار کی پوری تاریخ میں ملنا دشوار ہے۔

"... the barbarism of Western Europe has reached an incredibly high level, being only surpassed far surpassed, it is true by the barbarism of the United States."(2)

(مغربی یورپ کی بربریت ناقابلِ تصور سطح تک پہنچی ہے۔اس بربریت کو کسی نے پیچھے چھوڑا ہے تو وہ ریاستہائے متحدہ امریکہ ہے۔)

آج ہم جب بھی ''مغرب'' کا ذکر کرتے ہیں تو ''مغرب'' سے مراد یورپ اور امریکہ کی استعماری طاقتیں ہیں جن کی کمان اس وقت ریاستہائے متحدہ امریکہ کے ہاتھ میں ہے۔ان کے علاوہ وہ تمام قوتیں جو ریاستہائے متحدہ امریکہ کے استعماری عزائم میں

---

(1) Noam Chomsky; "Imperial Ambitions"; Penguin Books, London, 2005; pg:2

(2) Aime Cesaire; "Discourse on Colonialism"; pg:47

اس کے ساتھ معاون و مددگار رہیں۔

خرم مراد لکھتے ہیں:

"آج کا 'مغرب' محض گوری اقوام یا عیسائیت و یہودیت کے پیروکاروں سے تشکیل نہیں پاتا، بلکہ اس میں آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور متعدد ایشائی اور افریقی اقوام اور ان اقوام کے مغرب زدہ حکمران طبقے بھی شامل ہیں۔" (۱)

دور حاضر میں استعمار کے اہداف ممالک اور اقوام

موجودہ دور میں استعمار کا سب سے بڑا ہدف امت مسلمہ اور اس کے وسائل ہیں۔ عصرِ حاضر میں کرۂ ارض پر جہاں کہیں کسی جارحیت کا ارتکاب ہوتا ہے اس کا شکار مسلمان ہی ہوتے ہیں اور چونکہ آج کے دور کی سب سے بڑی استعماری قوت ریاستہائے متحدہ امریکہ ہے لہٰذا یہ کہنا بجا ہوگا کہ امریکہ کا ہدف موجودہ دور میں صرف اور صرف عالم اسلام اور اس کے وسائل ہیں۔

سیّد منور حسن لکھتے ہیں:

"گزشتہ دہائی کے حالات وواقعات نے ثابت کیا ہے کہ امریکہ عالمی دہشت گرد ہے۔ پوری دنیا بالخصوص امت مسلمہ اس کا ہدف اور وسائل پر قبضہ کرنا اس کے ایجنڈے کا حصہ ہے"۔ (۲)

مختلف حیلے بہانوں سے مسلمان خطوں پر پابندیاں عائد کرنا، پھر انہیں عسکری جارحیت کا نشانہ بنانا اور وہاں کے تمام معاملات کو اپنے ہاتھ میں لے لینا۔۔ یہ سب واقعات مغرب اور امریکہ کی اسلام دشمنی کا ثبوت ہیں۔ اور اس وقت اسلام اور مسلمان مغرب اور امریکہ کے منفی پراپیگنڈے سیاسی، سفارتی اور عسکری غنڈہ گردی کا شکار ہیں اور

---

(۱) خرم مراد؛ "مغرب اور عالم اسلام"؛ص:7

(۲) سید منور حسن؛ پیش لفظ "امریکی دہشتگردی تاریخ اور اثرات"؛ص:11

اس حقیقت کو جھٹلانا خود ایماندار اور غیر جانبدار مغربی مفکرین کے لیے بھی ممکن نہیں ہے:

"Despite what has been reported by George W Bush and later by Barak Obama, that the West was not at war against Islam, the Muslim world felt so, and the wars in Afghanistan and Iraq appeared to confirm this belief."①

(جارج ڈبلیو بش اور اس کے بعد باراک اوبامہ کے ان دعووں کے باوجود کہ ان کی جنگ اسلام کے خلاف نہیں ہے اسلامی دنیا تو یہی سمجھتی ہے اور افغانستان اور عراق پر حملہ مسلمانوں کے اس یقین کو اور تقویت پہنچاتا ہے۔)

ریاستہائے متحدہ امریکہ اٹھارویں صدی کے اواخر میں دنیا کے نقشے پر ایک نئی مملکت کی حیثیت سے ابھرا لیکن امریکہ کی اسلام دشمنی کا تسلسل اس سے بھی بہت پہلے سے چلا آرہا ہے۔ اس تسلسل کو سمجھنے کے لیے ہمیں ظہورِ اسلام کے دور کی تاریخ دیکھنی پڑتی ہے۔

ساتویں صدی عیسوی میں جب جزیرہ نما عرب میں اللہ کے آخری نبیؐ کا ظہور ہوا اور یہ خطہ چند سالوں کے اندر اندر اسلام کی ضیاء پاش کرنوں سے منور ہو گیا تو اس کے بعد دین اسلام کے راستے میں کھڑی ہونے والی اولین رکاوٹیں روم و ایران کی طاقتور سلطنتیں تھیں۔ ان کے متعلق نبیؐ نے اپنی زندگی میں یہ پیشنگوئی فرمادی تھی:

"فارس نطحة اونطحتان ثم لا فارس بعد ها ابداً والروم ذات القرون اصحاب بحرٍ وصخرٍ كلّما ذهب قرن خلف

---

①Bill Ashcraft, Gareth Griffiths, and Halen Tiffen; "Post Colonial Studies: The New Concepts"; pg:47

قرن مکانہ.①

(یعنی فارس/ ایران تمہاری ایک ٹکر ہوگی یا دو، پھر فارس نہیں رہے گا لیکن روم کے کئی سینگ ہوں گے۔ اس کا ایک سینگ ہلکان ہوگا تو ایک نیا سینگ نکل آئے گا۔)

لہٰذا سلطنت رومایوں تو خلافت راشدہ کے دور میں مسلمانوں کی قوت سے ٹکرا کر پاش پاش ہوگئی لیکن آنے والے ادوار نے یہ ثابت کیا کہ ''روم'' محض ایک سلطنت نہیں بلکہ ایک تاریخی، تہذیبی اور نظریاتی میراث کا نام بھی تھا اور براعظم یورپ درحقیقت قدیم سلطنت روما کا ہی ایک مذہبی، تہذیبی اور تاریخی تسلسل تھا۔ گویا روم کا ایک سینگ خلافت راشدہ کے دور میں ہلکان ہوا تو چند صدیوں بعد براعظم یورپ کی صورت میں ایک نیا سینگ نمودار ہوا۔ پھر کئی صدیوں کی طاقت اور عروج کے بعد بالآخر بیسویں صدی کے نصف اول میں یہ سینگ بھی ہلکان ہوا۔ نبی ﷺ کی حدیث کی روشنی میں اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ روم کا وہ کون سا سینگ ہے جو یورپ کے بعد ''قائم'' ہوا ہے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے حامد کمال الدین لکھتے ہیں:

> ''جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ اقوام روم کا وہ کون سا سینگ ہے جو عالم اسلام کو پنج دینے کے لیے اس وقت 'ملت روم' کے سر پر لہرا رہا ہے۔۔۔ تو یہ واضح ہو جانے کے بعد کہ آج کا مغرب جو کہ یورپ سے شروع ہو کر براعظم جنوبی امریکہ، براعظم شمالی امریکہ، براعظم آسٹریلیا اور جزائر نیوزی لینڈ تک جاتا ہے، اسی ایک ملت روم کا تسلسل یا اسی کا پھیلاؤ ہے۔۔ کوئی ابہام باقی نہیں رہ جاتا کہ ملت روم کا حالیہ سینگ جس نے ہمارے وجود کو لہولہان کر رکھا ہے 'ریاستہائے متحدہ امریکہ' ہے۔''②

---

① ابن ابی شیبہ، ابوبکر، عبداللہ بن محمد؛ الکتاب المصنف فی الحدیث الآثار؛ مکتبۃ الرشد، الریاض، 1409ھ؛ کتاب الجھاد، باب: ماذکر فی فضل الجھاد والحث علیہ؛ حدیث:19342

② حامد کمال الدین؛ ''روبہ زوال امریکن ایمپائر''؛ ص:33

گویا استعماری اور نوآبادیاتی تاریخ کا تسلسل روم کے بعد یورپ اور یورپ کے بعد ریاستہائے متحدہ امریکہ کے ساتھ جڑ جاتا ہے۔

قدیم رومن سلطنت اور جدید ریاستہائے متحدہ امریکہ کی باہمی مشابہت خود کئی امریکی دانشوروں کی نظروں سے بھی اوجھل نہیں۔ مثال کے طور پر ایک امریکی مصنف John Cullen Murphy نے اپنی کتاب "Are we Rome" میں قدیم رومن قوم اور جدید امریکن قوم کے مابین موجود مشترک اقدار و عادات پر بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ یہ دونوں اقوام خود کو غیر معمولی طور پر برتر سمجھتی ہیں۔ غیر اقوام کو حقیر سمجھنا، ان کے حقوق اور ان کے نکتہ ہائے نظر کو چنداں اہمیت نہ دینا دونوں اقوام کی خاصیت نظر آتی ہے۔

کتاب کے Prologue میں مصنف لکھتا ہے:

"America and Rome-the comparison is by now so familier, so natural, that you just cant help yourself: it comes to the mind unbidden.."[1]

(امریکہ اور روم۔ یہ تقابل اب اتنا جانا پہچانا اور اتنا قدرتی لگتا ہے کہ آپ اس کے بارے میں سوچنے پر خود کو مجبور پاتے ہیں یہ خود بخود آپ کے ذہنوں میں در آتا ہے۔)

نوم چومسکی اپنی کتاب "Imperial Ambitions" میں Joseph Schumpeter کے مضمون "The Sociology of Imperialisms" سے رومن ایمپائر کے متعلق ایک اقتباس نقل کرتے ہیں:

"There was no corner of the world where some interest was not alleged to be in danger or under actual

[1] Murphy, John Cullen; "Are we Rome?"; A Mariner Book Houghton Mifflin Company, Boston, New York, 2008;pg:5 (Prologue)

attack. If the interests were not Romans, they were of Rome's allies, and if Rome had no allies, then allies would be invented. When it was utterly impossible to continue such an interest_why, then it was the national honor that had been insulted. The fight was always invested with the aura of legality. Rome was always being attacked by evil- minded neighbours, always fighting for a breathing space. The whole world was pervaded by a host of enemies, and it was manifestly Rome's duty to guard against their indubitably aggressive designs."(1)

(دنیا کا کوئی کونا ایسا نہیں تھا جہاں روم کے کسی مفاد کو خطرہ نہ ہو۔ اگر روم کے نہیں تو روم کے کسی حلیف کے مفادات کو خطرہ ضرور ہوتا تھا اور اگر روم کا کوئی حلیف نہیں تھا تو حلیف 'ایجاد' کر لیا جاتا تھا اور اگر ان مفادات کا بہانہ بنانا ممکن نہ رہ جاتا تو قومی وقار اور غیرت کا کوئی مسئلہ کھڑا کر لیا جاتا۔ جنگ کو ہمیشہ قانونی لبادہ پہنا کر ہی مسلط کیا جاتا تھا۔ روم ہمیشہ برے ہمسائیوں کے حملوں کی زد میں رہتا تھا اور ہمیشہ اپنے دفاع اور آزادی کی جنگ لڑتا تھا۔ ساری دنیا کسی دشمن کے حملوں کی زد میں تھی اور دشمنوں کے ان جارحانہ اقدامات سے دنیا کو محفوظ رکھنا صریحاً روم کی ذمہ داری تھی۔)

اس اقتباس کو نقل کرنے کے بعد نوم چومسکی لکھتے ہیں:

"Monthly Review used that quote in a fairly recent issue in an editorial referring to Bush's National

(1) Noam Chomsky; "Imprial Ambitions"; pg:53

Security Strategy, Precisely because it is so apposite. You just change the words from 'Rome' to 'Washington.' "①

(Monthy Review نے اپنے تازہ شمارے کے اداریے میں بش کے نیشنل سیکیورٹی اسٹریٹجی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ مندرجہ بالا اقتباس نقل کیا ہے۔ آپ صرف 'روم' کی جگہ 'واشنگٹن' کا لفظ استعمال کریں۔)

اسی ریاستہائے متحدہ امریکہ کی زیر قیادت آج کی نو استعماری طاقتوں کا ہدف ملت توحید ہے۔ مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک مسلم آبادی کا کوئی خطہ ایسا نہیں جو اس وقت اپنے وسائل کے استعمال، اپنی داخلی و خارجہ پالیسی یا اپنے عسکری و معاشرتی فیصلوں میں مکمل طور پر آزاد ہو۔ مسلم خطوں پر ناجائز قبضہ کر رکھنے والا ہر ظالم اور غاصب امریکہ کو مظلوم نظر آتا ہے اور اپنی آزادی کی خاطر کفار سے برسرِ پیکار ہر بے کس اور نہتا مسلمان اس کو "دہشت گرد" اور "عالمی امن کے لیے شدید خطرہ" محسوس ہوتا ہے۔

دورِ حاضر کے استعمار کا سب سے بڑا ہدف امت مسلمہ ہے:

برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر②

اور استعمار کی اس اسلام دشمنی کے در پردہ صرف اقتصادی عوامل ہی نہیں بلکہ دیگر کئی وجوہات بھی ہیں۔

---

①Noam Chomsky; "Imprial Ambitions"; pg:53

②اقبال، نظم: "شکوہ"، کتاب: بانگِ درا (کلیات اقبال)، ص:166

فصل سوم:

عالمِ اسلام پر نو استعماری یلغار کی وجوہات

ملتِ روم جسے احادیث میں بنی الاصفر (white skin nation) بھی کہا گیا ہے۔① آج دنیا میں عموماً ''مغرب'' کے نام سے جانی جاتی ہے اور مغرب کی اسلام دشمنی اب کسی سے ڈھکی چھپی بات نہیں رہی۔ گو اٹھارویں اور انیسویں صدی میں عالمِ اسلام پر ہونے والے استعماری حملوں کے محرکات عموماً ان خطوں کے وسائل ہی تھے لیکن جدید استعمار کی مسلم دشمنی کے پیچھے دیگر کئی عناصر بھی کارفرما ہیں۔ ان عناصر اور وجوہات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ مغرب کے ان نظریاتی فلسفوں اور تاریخی بنیادوں کو سمجھا جائے جن پر مغربی معاشرے کھڑے ہیں۔

حامد کمال الدین اپنی تصنیف ''رو بہ زوال امریکن ایمپائر'' میں مغربی معاشروں کی نظریاتی تہذیبی اور تاریخی اساس پر روشنی ڈالتے ہیں۔②

وہ کہتے ہیں کہ آج کا مغرب اپنے نظریاتی وجود اور اپنی تاریخی پہچان کے معاملے میں چار بنیادوں پر کھڑا ہے:

1) یونانی فلسفہ و افکار کے ساتھ ان کی ایک تہذیبی نسبت، بلکہ اس پر حد درجہ فخر،

2) رومن طنطنہ و جبروت، تسلط و جبر اور توسیع پسندی،

(جبکہ مشرکانہ و بت پرستانہ پس منظر رکھنے میں یونان و روم ہر دو تاریخ کے ساتھ تحت الشعور میں بیٹھی ہوئی ایک وابستگی)

3) عیسائی عنصر کی آمیزش، یعنی بائبل پر دھرم اور صلیب سے وفاداری،

---

① بخاری؛ ''الجامع الصحیح''؛ ابواب الجزیۃ والموادعۃ، باب: ما یحذر من الغدر

② حامد کمال الدین؛ ''رو بہ زوال امریکن ایمپائر''؛ ص: 37

4) جبکہ چوتھا عنصر ہے جدید الحاد اور انسانی خدائی کی نئی نئی صورتوں کی دریافت۔

لہٰذا جدید مغربی تہذیب کے ان تاریخی وفکری پہلوؤں کو مدنظر رکھیں تو مغرب کی اسلام دشمنی کی مندرجہ ذیل وجوہات سامنے آتی ہیں:

1) مذہبی وجوہات

2) تاریخی وجوہات

3) جغرافیائی وجوہات

4) معاشی وجوہات

5) معاشرتی اور تہذیبی وجوہات

1۔ مذہبی وجوہات:

یورپ کی عیسائیت حضرت عیسیٰ کے دین سے اتنا تعلق نہیں رکھتی جتنا سینٹ پال کے خودساختہ عقائد سے۔ رہا سہا کام رومی شہنشاہ قسطنطین کے قبول عیسائیت نے کیا جس نے "بحق سرکار" عیسائی عقائید کے اندر مداخلت کرتے ہوئے بت پرست رومی عقیدوں اور تہواروں کو ہی عیسائی قالب میں ڈھال دیا۔ یوں سیدنا عیسیٰ کے خالص دین توحید میں اس حد تک شرک کی آمیزش کی گئی کہ یہ اپنی اصل موحدانہ شکل میں باقی نہ رہا۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ رومن دراصل عیسائی نہیں ہوئے بلکہ عیسائیت کو رومن کیا گیا۔ جبکہ امت مسلمہ وہ قوم ہے جس نے خالص توحید کے پرچم کو نہ صرف خود تھاما بلکہ اسے ساری دنیا میں سربلند کرنے کے لئے اپنے مال اور جانیں قربان کرنے کو اپنی خوش نصیبی جانا۔ لہٰذا شروع سے ہی ان دونوں امتوں کے مابین باہم ٹھن جانا ایک قدرتی امر تھا۔

پھر جب یورپ کی نشاۃِ ثانیہ کا دور شروع ہوا تو گویا مذہب کو بالکل ہی دیس نکالا مل گیا۔ یورپی عیسائی عقائید گو انبیاء بنی اسرائیل کی غیر مستند اور من گھڑت روایتوں اور رومی تہذیب کی مشرکانہ رسوم کا مجموعہ تھے لیکن پھر بھی انبیاء کی تعلیمات کا کچھ حصہ پانے کے

نتیجے میں یورپی معاشرے کسی حد تک بنیادی اخلاقی معیارات رکھتے تھے۔ سائنس اور مذہب (عیسائیت) کی باہمی کشاکش میں عیسائیت کو شکست فاش ہوئی تو مغرب کے اس نئے روشن خیال انسان کو اپنی تمدنی ضروریات کے تحت اجتماعیت اور معاشرت کے نئے نظریات تشکیل دینے پڑے اور ایک ایسا معاشرہ وجود میں آیا جہاں خدا، رسالت، وحی یا مذہب فرسودہ نظریات قرار پائے۔ اس نئے نظام کی روح یہ تھی کہ مذہبی عقائید کا انسانی معاشرت، سیاست اور معیشت میں کوئی کردار نہیں۔ مذاہب اس دنیا میں رہیں گے تو ریاست کی قائم کردہ ''شرائط'' اور ''قیود'' میں رہیں گے۔ اس کے برعکس دین اسلام ریاست، معاشرت اور معیشت کے لئے خود ''شرائط'' اور ''قیود'' مقرر کرتا ہے۔ مغربی کفریہ نظام کے علمبردار پچھلی کئی صدیوں سے دنیا کے اندر الحاد پھیلانے کا مصدر ہیں۔ تاریخ کے بدترین ملحد آج کے مغرب نے ہی پیدا کیے ہیں۔ آسمانی ہدایت کے متبادل کے طور پر ڈارون ازم، لبرل ازم، ریلٹوازم، ہیومن ازم، کیپٹل ازم اور سوشل ازم ایسی کفریہ مصنوعات مغرب کی ہی سوغات ہیں۔ انبیاء کی سکھائی گئی تعلیمات اور اقدار کے خلاف ایک منظم تحریک چلانے کا سہرا مغرب کے سر ہے خدائی شریعتوں کے خلاف تاریخ کی سب سے بڑی مہم ان ہی کی برپا کردہ ہے۔ دوسری جانب یہ بھی واضح ہے کہ انبیاء کی وارث اور تمام آسمانی شریعتوں اور رسالتوں کی امین قیامت تک کے لیے امت محمدیہؐ ہی ہے۔ ایک طرف ''بنی الاصفر'' ہیں جو انسانی زندگی کے ہر گوشے سے ''مذہب''، ''رسالت'' اور ''وحی'' کی راہنمائی نکال کر طاغوت کا نظام جاری کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں جبکہ دوسری طرف ملت بیضاء ہے جس کے اندر کئی صدیوں کی استعماری غلامی کے باوجود ''اسلام'' اور ''اسلامی نظام'' کی تڑپ اور خواہش کسی دبی ہوئی چنگاری کی طرح موجود ہے اور جس کے کسی بھی وقت شعلہ بن جانے کا امکان مغرب کو ہمیشہ خوفزدہ رکھتا ہے۔ سو یہ دو نظاموں کی جنگ ہے جن میں سے ایک مغربی الحاد کے ''شجرِ خبیثہ'' کا پھل ہے جبکہ دوسرا

نظام خالقِ کائنات کی وضع کردہ شریعت کے "شجر طیبہ" کا ثمر ہے۔

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد کے ڈائریکٹر جنرل لکھتے ہیں:

"۔۔۔امریکہ ایک نو آبادیاتی طاقت ہے بلکہ امریکہ اپنے سے پہلے والوں (یورپیوں) سے بھی بدتر نظر آئے گا کیونکہ ان کو اقتصادی مفادات کی حامل وسائل چوسنے والی طاقتیں سمجھا جاتا تھا جبکہ امریکہ وسائل ہڑپ کرنے والی طاقت کے ساتھ ساتھ نظریاتی دشمن بھی ہے۔"①

یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ جب مغرب اور امریکہ کی اسلام دشمنی کا جائزہ مذہبی عوامل کی روشنی میں لیا جاتا ہے تو اس کے دو پہلو سامنے آتے ہیں ایک تو مغربی الحاد پرستی اور امتِ مسلمہ کی خدا پرستی کی باہمی کشاکش ہے۔ جبکہ دوسری جانب خالصتاً مذہبی عقائید پر مبنی صلیب وہلال کی باہمی رقابت ہے۔ یعنی ایک تو مغرب کا الحادی اور طاغوتی نظام بمقابلہ اسلام کا رحمانی نظام اور دوسری جانب عیسائیت کا بطورِ عقیدہ اسلامی عقیدے کے خلاف تعصب اور بغض ہے۔

اسی حقیقت کو ہنٹگٹن یوں بیان کرتا ہے:

".......conflict (between Islam and Christianity) was on the one hand a product of difference, particularly the Muslim concept of Islam as a way of life transcending and uniting religion and politics versus the western Christian concept of the seperate realms of God and Caesar, The conflict also stemmed, however, from their similarities. Both are

---

① خالد رحمن، مضمون: "مشرقِ وسطیٰ سے متعلق امریکی پالیسیاں اور اس کے مضمرات"، مجلہ: "مغرب اور اسلام"، رسالہ:35، 2011، ص:71

monotheistic religions.... which see the world in dualistic, us- and- them terms. Both are universalistic, claiming to be the one true faith to which all humans can adhere....... "[1]

(اسلام اور عیسائیت کے مابین تنازعہ کی ایک وجہ تو ان کے درمیان پایا جانے والا فرق ہے خاص طور پر مسلمانوں کا یہ نظریہ کہ اسلام مذہب اور سیاست دونوں میدانوں میں مکمل راہنمائی فراہم کرتا ہے جبکہ عیسائیوں کا نظریہ اس کے برعکس یہ ہے کہ مذہب اور ریاست کا دائرۂ کار فرق ہے۔ دوسری طرف اسلام اور عیسائیت کی باہمی چپقلش کی ایک وجہ ان کے درمیان پائی جانے والی یکسانیت بھی ہے۔ دونوں خدا کی وحدانیت کے قائل ہیں اور دنیا کو مومن اور کافر کے خانوں میں تقسیم کرتے ہیں، دونوں عالم گیر مذاہب ہیں اور دونوں کا دعویٰ ہے کہ وہ اکیلے ہی ایک ایسے سچے دین کے پیروکار ہیں جو ساری انسانیت کے لیے ہے۔)

آج امریکہ خود کو کتنا ہی "سیکولر" ظاہر کرنے کی کوشش کیوں نہ کرے اسلام کے خلاف اس کا "صلیبی" بغض چھپائے نہیں چھپتا۔ افغانستان پر حملے کا اعلان کرتے ہوئے صدر بش کا اس جنگ کو "صلیبی جنگ" قرار دینا اس دشمنی کے مذہبی پہلو کا ثبوت ہے۔

عابداللہ جان کہتے ہیں:

"Motivation for the war is evident from Bush's calling the coming war on Afghanistan a 'crusade' and leading his friends to believe that he views his new duty as a mission from God."[2]

---

[1] Huntington; "The Clash of Civilizations....";pg:210

[2] Abidullah Jan; "Afghanistan: The Genesis of the Final Crusade"; Pragmatic Publishing, Ottawa, Canada, 2006;pg:31

(جب بش نے افغانستان پر حملے کو 'صلیبی' جنگ قرار دیا تو اس جنگ کے محرکات خود بخود واضح ہو گئے اور اس اعلان کے بعد بش کے قریبی دوست یہ سمجھنے لگے کہ بش اپنی ذمہ داریوں کو خدا کی طرف سے تفویض کردہ مشن گردانتا ہے۔)

اس پر مستزاد امریکہ کا یہودیوں اور اسرائیل کے ساتھ تعلق ہے۔

آج یہود و نصاریٰ اپنی دو ہزار سالہ پرانی دشمنی کو پس پشت ڈال کر جو بظاہر باہم شیر و شکر نظر آ رہے ہیں اس کی وجہ دونوں کی اسلام دشمنی ہی ہے۔ کئی صدیوں تک قوم یہود عیسائیوں کے ظلم و ستم اور منتقمانہ کاروائیوں کا شکار رہی ہے لیکن آج کا عالمی منظر نامہ کچھ اور ہی تصویر دکھا رہا ہے۔ امتِ مسلمہ کو یہ دونوں اقوام ایک مشترکہ خطرے کے طور پر دیکھتی ہیں۔ صدیوں تک یہود پر عذاب کا کوڑا بن کر برسنے والی عیسائی اقوام آج مکمل طور پر صیہونیت کے زیر اثر ہیں۔

ڈاکٹر اسرار احمد لکھتے ہیں:

''یہودیوں کے لیے سولہ سو برس تک اور مسلمانوں کے لیے ایک ہزار برس سے عیسائیوں نے عذاب کے کوڑے کا کردار ادا کیا ہے اگرچہ۔۔۔ اب مسیحی دنیا۔۔۔ یہودیوں کے بظاہر معاون و محافظ اور مددگار و سرپرست اور بباطن ۔۔۔ حاشیہ بردار بن چکی ہے۔ لیکن مسلمانوں کے معاملے میں ان کا سابقہ کردار پوری طرح برقرار ہے۔۔۔۔'' (۱)

پھر اسلام کے خلاف یہود و نصاریٰ کی دشمنی پر تو خود قرآن گواہی دیتا ہے۔ (۲)

اسلامی خطوں کے خلاف امریکہ کی حالیہ یورش کی وجوہات پر بحث کرتے ہوئے عابداللہ جان رقمطراز ہیں:

---

(۱) ڈاکٹر اسرار احمد؛ ''سابقہ اور موجودہ مسلمان۔۔۔۔''؛ ص:57

(۲) المائدہ 51:5

"In the United States, the religious, political and military fronts against Islam work hand in hand... the religious front is now more united and strongly placed behind its favourite crusaders on the political front then ever in U.S histroy."①

(ریاستہائے متحدہ امریکہ کے مذہبی، سیاسی اور عسکری طبقات اسلام کے خلاف محاذ پر ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے سرگرمِ عمل ہیں۔ امریکہ کے مذہبی طبقات آج جتنے متحد اور مضبوط ہو کر سیاسی محاذ پر اپنے پسندیدہ صلیبیوں کی پیٹھ ٹھونک رہے ہیں ایسا امریکہ کی تاریخ میں پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔)

2۔ تاریخی وجوہات:

اگر جائزہ لیا جائے کہ وہ کون سی قوم ہے جس کے ساتھ پچھلے چودہ سو سال سے عالمِ اسلام مسلسل برسرِ جنگ ہے تو اس کا جواب یہی ہوگا کہ وہ ملتِ روم ہے۔ گو تاریخ کے مختلف ادوار میں روم کے مختلف قرن (سینگ) تھے جو عالمِ اسلام کے خلاف برسرِ پیکار رہے۔ یہی ملتِ روم ہے جو آج مغربی یا عیسائی دنیا کے نام سے جانی جاتی ہے اور جس کی قیادت و سیادت آج ریاستہائے متحدہ امریکہ کے ہاتھ میں ہے اور یہی امریکہ آج مسلم دنیا کے خلاف صلیبی لشکر کا ہراول ہے۔ امریکہ کا کہنا ہے کہ مغرب اسلام کے خلاف نہیں لیکن صدیوں کے تاریخی حقائق اس دعویٰ کو جھٹلانے کے لیے کافی ہیں۔ ان دونوں ملتوں کی باہمی کشاکش اتنی ہی پرانی ہے جتنی پرانی خود اسلام کی تاریخ ہے اور اس کی گواہی خود مغربی دانشور بھی دیتے ہیں۔

ہنگٹن کے مطابق:

①Abidullah Jan; "Afghanistan.....";-pg:37

"Some Westereners including president Bill Clinton have argued that the West doesnot have problems with Islam but only with violent Islamist extremists. Fourteen hundred years of history demonstrates otherwise. The relation between Islam and Christianity both orthodox and Western have often been stormy."①

(چند مغربی حضرات بشمول صدر کلنٹن بضد ہیں کہ مغرب کو اسلام سے نہیں بلکہ انتہا پسند مسلمانوں سے مسئلہ ہے لیکن چودہ سو سال کی تاریخ کوئی اور ہی کہانی سناتی ہے۔ اسلام اور عیسائیت [کٹر عیسائیت ہو یا روشن خیال] کے تعلقات ہمیشہ کشیدہ ہی رہے ہیں۔)

امت مسلمہ اور ملتِ روم کا ٹکراؤ نبی ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں ہی اس وقت شروع ہو گیا تھا جب ۸ھ میں سرحدِ شام کے قریب مقام موتہ میں وہاں کے حاکم شرجیل بن عمر غسانی نے نبی ﷺ کے ایلچی کو گرفتار کر کے شہید کر دیا۔ شرجیل بن عمر قیصر روم کی طرف سے اس علاقے کا صوبہ دار تھا۔② اسی قتل کا بدلہ لینے کے لئے سیدنا زید رضی اللہ عنہ بن حارث کی قیادت میں موتہ کی مہم روانہ کی گئی جہاں تین ہزار غازیان اسلام نے دو لاکھ کے رومی لشکر کو شکست سے دو چار کیا۔ مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان یہ پہلی باقاعدہ جنگ تھی۔ پھر رسول اللہ ﷺ کی سب سے بڑی اور بلحاظ مسافت سب سے طویل و پر مشقت فوجی مہم جو کہ آپ ﷺ نے اپنی وفات سے کچھ عرصہ پہلے ایک عظیم الشان تیاری کے ساتھ برپا کی تھی اور جس کی آپ ﷺ نے بنفسِ نفیس قیادت فرمائی تھی۔ آپ ﷺ کی زندگی کا یہ بھاری بھرکم غزوہ جو تبوک کے نام سے جانا جاتا ہے روم کے خلاف ہی تھا۔ اپنی

---

①Huntington;"The Clash of Civilizations....";pg:209

② نجیب آبادی؛ ''تاریخ اسلام''، ج:1؛ص:244

وفات کے وقت نبی ﷺ نے جس سریہ کو تیار کیا اور جس کی روانگی میں تاخیر پر آپ ﷺ اپنی بیماری میں بھی برہم ہوئے تھے وہ روم کی طرف ہی بھیجا گیا تھا۔ اور یہی وہ جیشِ اسامہ تھا جس کی روم کے محاذ پر روانگی کے لیے کبار صحابہ رضی اللہ عنہم کے تحفظات کے باوجود خلیفہ اول ابوبکر رضی اللہ عنہ نے نہایت مستعدی سے کام لیا تھا۔

ہمارے دین میں روم کے خلاف جہاد کرنا دنیا کی کسی بھی دوسری قوم کے خلاف جہاد کرنے کی نسبت افضل ہے بلکہ کتب حدیث وفقہ میں اس پر ابواب باندھے گئے ہیں مثال کے طور پر ''سنن ابوداوَد'' میں کتاب الجہاد کے تحت باقاعدہ ایک باب باندھا گیا ہے۔

"باب فضل قتال الروم علی غیرھم من الامم"[1]

(اس بات کا بیان کہ دوسری امتوں کی نسبت رومیوں کے خلاف قتال کرنا زیادہ فضیلت کا باعث ہے۔)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نبی ﷺ اپنی زندگی میں بہت اہتمام کے ساتھ اپنی امت کو اس قوم کی دشمنی کے متعلق خبردار کر کے گئے تھے۔ آپ ﷺ نے اپنی پیشنگوئیوں میں قیصر روم کے پایۂ تخت قسطنطنیہ پر لشکرکشی کرنے والے مجاہدین کی فضیلت کا ذکر بھی فرمایا[2] اور خلیفۂ اول حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا قول مشہور ہے کہ ''شام کا ایک دور دراز دیہہ (رومیوں سے) فتح کرنا مجھے فارس کا ایک پورا شہر لینے سے بڑھ کر عزیز ہے''[3]۔ خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں مدینہ سے نکل کر خاص طور پر کسی طرف کو سفر اختیار کیا تو وہ سرزمینِ شام و فلسطین تھی جہاں مجاہدین اسلام رومیوں کے خلاف برسر

---

[1] ابوداؤد؛ ''سنن ابوداوَد''؛ کتاب الجہاد، باب: فضل قتال الروم علی غیرھم من الامم

[2] بخاری؛ ''الجامع الصحیح''؛ کتاب الجہاد، باب: ما قیل فی قتال الروم

[3] ابن تیمیہ، الحرانی، تقی الدین، ابوالعباس، احمد بن عبدالحلیم: ''مجموعہ الفتاویٰ''؛ مجمع الملک فھد لطباعۃ المصحف الشریف، المدینۃ النبویۃ، 1995؛ ج:4؛ ص:448

پیکار تھے۔

خلافت راشدہ کے عہد میں رومیوں کو ان کے ایشیائی اور افریقی مقبوضات سے نکال دیا گیا اور رومی سرحدیں مسلسل سمٹتی رہیں۔ مسلمانوں کے ہاتھوں مسلسل اور پے در پے شکستیں اُٹھانے کے بعد قیصر روم کو اس وقت بدلے کا ایک سنہری موقع نظر آیا جب سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے باہمی اختلاف کے نتیجے میں خلافت اسلامیہ دو حصوں میں تقسیم ہوئی۔ قیصر روم نے مسلمانوں کی نا اتفاقی سے فائدہ اٹھا کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حکومت میں شامل ایران کے شمالی صوبوں پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو خبر ملی تو انہوں نے قیصر کے نام خط لکھ کر اسے سخت تنبیہ کی اور دھمکی دی جس کے بعد قیصر نے حملے کا ارادہ ترک کر دیا۔

غرض یہ کہ صحابہ و تابعین کے دور میں عیسائیوں کے خلاف محاذ کو خصوصی اہمیت حاصل رہی۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں قسطنطنیہ پر فوج کشی کا ارادہ فرمایا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے پیش نظر صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ (1) یوں عیسائیت اور اسلام مسلسل ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار رہے۔ عباسی دور تک یہ حال رہا کہ ہر سربرآوردہ خلیفہ اس کے خلاف جہاد کے لیے نکلتا یا مہمات روانہ کرتا۔ خلیفہ ہارون الرشید کے دور میں کوئی سال ایسا نہ تھا جس میں رومیوں کے خلاف معرکہ گرم نہ ہوتا۔ (2)

رفتہ رفتہ روم کی عظیم الشان سلطنت کی جغرافیائی حیثیت تو قصہ پارینہ بن گئی لیکن رومی مذہب، تہذیب، تمدن اور فلسفے کا وارث براعظم یورپ ٹھہرا۔ اور یہی براعظم یورپ تھا جہاں سے اسلام کے خلاف ۱۰۹۵ء میں ''مقدس جنگ'' کا طبل بجایا گیا اور صلیبی جنگوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا۔ پوپ اربن دوم عیسائی دنیا میں مسلمانوں کے خلاف صلیبی

(1) اکبر نجیب آبادی؛ ''تاریخِ اسلام''؛ ج:1؛ ص:646

(2) ڈاکٹر نذیر احمد پراچہ: ''مسلمان فاتحین'': ص:393

جنگوں کی آگ بھڑکانے کے لیے نبی رحمۃ اللعالمین کو مسیح کا سب سے بڑا حریف بلکہ بعض روایات کی رو سے آپ ﷺ کو معاذ اللہ ثم معاذ اللہ Anti Christ قرار دیتا رہا۔ (1)

تقریباً تین سو سال تک جاری رہنے والے ان صلیبی حملوں کے پیچھے مذہبی، نسلی، عصبیتی اور اقتصادی تمام محرکات بیک وقت کارفرما تھے۔ صلیبیوں کی ان یورشوں کے سامنے مختلف ادوار میں مختلف مسلم سلاطین نے بند باندھا۔ خلافت آل عباس، بعد ازاں سلجوقی حکمران، پھر اتابکہ (آلِ زنگی) پھر بنی ایوب پھر ممالیک اور پھر خاص طور پر عثمانی خلافت کی بدولت مسلمانوں کے مغربی اور شمالی ساحل کئی صدیاں صلیبیوں کی لوٹ مار سے محفوظ رہے۔ بلکہ ایک وقت تو ایسا بھی آیا جب عثمانی یلغار کے آگے شائید پہلی بار یورپ کو خطرہ لاحق ہوا کہ ان کا یہ چھوٹا سا براعظم جلد ہی اسلام کے ہاتھوں مفتوح ہو جائے گا۔ اور ایسا ہو بھی جاتا اگر خود اسلامی دنیا کی افواج اور حکمران آپس میں بھڑ نہ جاتے۔ بہر حال خطۂ بلقان کی کئی یورپی اقوام عثمانی دور میں حلقہ بگوشِ اسلام ہوئیں۔ آج کا البانیہ، بوسنیا اور کوسووو وغیرہ اسی دور کی عثمانی یادگاریں ہیں جو آج تک ملت روم کے دل میں کانٹے کی طرح چبھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بلقان کے ان خطوں نے عالم اسلام کے ضعف اور خلافت کی غیر موجودگی کی قیمت سب سے بڑھ کر چکائی ہے۔

بہر حال ایک طرف خلافت پر زوال آیا اور عالمِ اسلام غفلت، کاہلی اور دنیا پرستی کے عارضوں کا شکار ہوا تو دوسری طرف مغرب نے محنت،، علم اور اپنی تنظیم نو کے ذریعے مشینوں اور ہتھیاروں کی ایک نئی دنیا پیدا کر ڈالی۔ لیکن اس بار وہ صلیبی جنگجوؤں کی شکل میں اسلامی دنیا پر حملہ آور نہیں ہوئے بلکہ تاجروں اور تہذیب کے علمبرداروں کا بھیس بدل کر آئے۔ پھر ایک طویل عرصہ عالم اسلام کے وسائل پر ہاتھ صاف کرنے اور خلافت عثمانیہ کو ختم کر دینے کے بعد یہ "بنی الاصفر" مسلم خطوں کو "آزادی" عطا کر کے اپنے گھروں کو عازم سفر ہوئے۔

---

(1) حامد کمال الدین؛ "روبہ زوال امریکن ایمپائر"، ص: 71

لیکن عالم اسلام کو آزادی سے ''سرفراز'' کرنے کے پیچھے ان کی دریا دلی، اچھائی یا انسانی حقوق کی پاسداری کے جذبات نہیں تھے بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ عالمی جنگوں اور آزادی کی تحریکوں نے ان استعماری طاقتوں کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔ یوں بھی جانے سے پہلے یہ اقوام اپنی ان نو آبادیات کے اُن ''مقامی عناصر'' کا محکم اور دور رس بندوبست کر کے گئی تھیں جو ان کی غیر موجودگی میں ان کے استعماری مقاصد کو ''تسلی بخش'' انداز میں پورا کرتے رہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے خلاف عیسائیت کا تاریخی بغض اور صلیبی کینہ ہر دور میں زندہ رہا ہے اور تاریخ کے ہر اہم موقع پر اس کا اظہار بھی ہوتا رہا ہے۔

پروفیسر خورشید احمد لکھتے ہیں:

''تاریخی اعتبار سے بھی اہلِ مغرب اسلام سے نفسیاتی خوف یا اسلام فوبیا کا شکار رہے ہیں۔ اگرچہ صلیبی جنگوں نے اپنا رنگ ڈھنگ اور شدت تبدیلی کر لی ہے لیکن درحقیقت یہ ابھی جاری ہیں۔۔۔''(1)

<u>۱۹۱۷ء</u> میں برطانیہ کا جنرل ایڈمنڈ ایلن بی (Edmund Allenby) بیت المقدس میں فاتحانہ داخل ہوا تو اس نے یہ جملہ کہا:

''صلیبی جنگیں آج ختم ہوئی ہیں!''(2)

برطانیہ کے اس وقت کے وزیر خارجہ Lloyd George نے اس جرنیل کے نام فتح یروشلم کی خوشی میں ایک مراسلہ لکھا جس میں کہا گیا تھا:

''مبارک ہو آٹھویں صلیبی مہم کامیاب ہوئی!''(3)

---

(1) پروفیسر خورشید احمد؛ مضمون: ''عالمی سرمایہ داری، توانائی کی سیاست اور مشرق وسطیٰ''، مجلہ: ''مغرب اور اسلام''، رسالہ: 35، 2011؛ ص: 20

(2) ثروت صولت؛ ''ملتِ اسلامیہ کی مختصر تاریخ''؛ ج: 3؛ ص: 426

(3) حامد کمال الدین؛ ''روبہ زوال امریکن ایمپائر''؛ ص: 74

پھر ۱۹۲۰ء میں فرانسیسی جنرل Henri Gourand دمشق میں فاتحانہ شان کے ساتھ داخل ہوا تو سلطان صلاح الدین ایوبی کی قبر پر جانا نہیں بھولا وہاں کھڑا ہو کر اس نے یہ الفاظ کہے:

"آنکھ کھول کر دیکھو صلاح الدین، ہم پھر آ چکے!"(۱)

یہ سب مثالیں ان مغربی (اور کئی مسلمان) تجزیہ نگاروں اور دانش وروں کے ماہرانہ تبصروں اور آراء کی تردید کرنے کے لیے کافی ہیں جو مغرب اور اسلام کی جنگ کو صرف چند "مٹھی بھر انتہا پسندوں" کے خاتمے یا زیادہ سے زیادہ مسلم خطوں کے وسائل پر قبضہ کی جنگ قرار دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ "وسائل پر قبضہ" تو موجودہ استعماری اقدامات کی محض ایک جہت ہے۔ جبکہ مذہبی اور تاریخی عناصر بھی اپنی جگہ نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ کیونکہ "وسائل" کی خاطر بھی کسی آزاد ملک پر حملہ یا قبضہ یا دراندازی کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ مذہبی اور تاریخی محرکات کو مہمیز دی جائے تاکہ مغربی طاقتوں کی حکومتیں خود اپنے عوام کے ضمیر کو جاگنے سے پہلے ہی مطمئن کر کے سلا سکیں۔ لہٰذا ۲۰۰۱ء میں افغانستان پر حملے کی مہم پر روانہ ہونے سے پہلے ملت روم کا اپنے وقت کا سب سے بااثر اور طاقتور حکمران جارج ڈبلیو بش جونیئر اپنی قوم کو مژدہ سناتا ہے کہ یہ ایک صلیبی مشن ہے۔ بعد میں اپنے ان الفاظ پر "مسلمانوں" سے بش کی معذرت بے اختیار اس قرآنی آیت کی یاد دلاتی ہے:

قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۚ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ۚ (۲)

"تحقیق پھوٹا پڑتا ہے بغض وعناد ان کے مونہوں سے اور جو کچھ چھپائے ہوئے

---

(۱) حامد کمال الدین: "روبہ زوال امریکن ایمپائر"، ص: 75

(۲) آل عمران 3:118

ہیں ان کے سینے وہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔۔۔"

لہٰذا چودہ سو سالہ اسلامی تاریخ میں اگر کوئی دور ایسا آیا ہے جس میں اسلامی دنیا عیسائی حملوں اور جارحیت سے محفوظ رہی ہے تو یہ صرف وہ دور تھا جب ملت روم کے پرچم بردار امریکہ کو کیمونزم کا خطرہ درپیش تھا۔ کیمونزم سے نپٹنے کے بعد طبعی بات تھی کہ ملت روم اپنے صدیوں پرانے اور روایتی حریف "اسلام اور عالمِ اسلام" پر اپنے خون آشام پنجے گاڑنے کے لیے بہانے اور جواز گھڑتی اور ہلال وصلیب کے مابین معرکے پھر سے زور پکڑتے:

"With the collapse of communism in Europe, the United States was reframed as the defender of global civilization against the heathens in 'rogue' Muslim States, where according to the neoconservatives' perception, terrorism still festered, women rights are abused and human rights are violated".①

(یورپ میں کیمونزم کے زمین بوس ہوتے ہی امریکہ 'بدمعاش' مسلم ریاستوں کے گمراہوں کے ہاتھوں سے تہذیب وتمدن کی عالمگیر اقدار بچانے والے نجات دہندہ کی صورت میں اُبھرا۔ ایک عام خیال یہ ہے کہ ان (مسلمان خطوں) میں ابھی بھی دہشت گردی پنپتی ہے، عورتوں کا استحصال ہوتا ہے اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں کی جاتی ہیں۔)

لہٰذا جب روسی افواج افغانستان سے چلی گئیں اور سوویت روس ٹوٹ پھوٹ گیا تو نیٹو کے سیکرٹری جنرل نے برملا یہ کہا کہ سرخ خطرہ (کیمونزم) جا چکا ہے۔ لیکن سبز خطرہ (اسلام) ابھر آیا ہے۔②

---

① Abidullah Jan; "Afghanistan.... ";pg:63

② پروفیسر خورشید احمد؛ مضمون: "عالمی سرمایہ داری، توانائی کی سیاست اور مشرق وسطیٰ"؛ ص:20

آج اکیسویں صدی میں دنیا کا منظر نامہ کچھ یہ ہے کہ ''بنی الاصفر'' اور ''اقوام روم'' کو ان کے دین، تاریخ اور تہذیب سمیت شناخت کرنا ہو تو آج یہ ملت یورپ، امریکہ اور آسٹریلیا کے براعظموں میں پھیلی ہوئی ہے۔ اپنے بہت سے تاریخی خصائص، اپنی تاریخی وابستگی اور اپنا تاریخی بغض اور کینہ اور عداوت ان اقوام کو آج تک نہیں بھولی۔ یہی وجہ ہے کہ افغانستان میں ہم پر چڑھ آنے والی افواج میں ''ملت روم'' کی کسی قوم کا جھنڈا مفقود نہیں۔ پھر افغانستان کی جنگ سے متعلق مغربی میڈیا نے ایک یہ نظریہ بھی پیش کیا ہے کہ ماضی میں جو مسلمانوں نے وسیع عیسائی رقبے کو فتح کیا تھا یہ جنگ مسلمانوں کے انہی حملوں کے ''دفاع'' میں لڑی جا رہی ہے اور یہ مسلمانوں کی ماضی کی فتوحات کے خلاف مغرب کا ایک ''belated response'' ہے۔①

3۔ جغرافیائی وجوہات:

دنیا کے نقشے کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی خطوں کو قدرت نے جو جغرافیائی حیثیت اور برتری عطا کر رکھی ہے وہ دنیا کے دیگر خطوں اور ممالک کو نصیب نہیں ہوئی۔ عالم اسلام کی یہ جغرافیائی اہمیت ایک بہت بڑا عنصر ہے جس کی وجہ سے یہ خطہ آج کل عالمی استعماری طاقتوں کی ہوسِ ملک گیری کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ نوم چومسکی کے مطابق پہلی جنگ عظیم کے بعد فلسطین پر برطانوی قبضے کا اہم محرک فلسطین کی "geostrategic position" بھی تھی۔② عالمی اقتصادی ذرائع پر تسلط حاصل کرنے کی حرص رکھنے والی مغربی اقوام کسی نہ کسی طرح اسلامی دنیا کے اہم جغرافیائی خطوں میں قدم جمانے کی کوششوں میں لگی ہوئی ہیں اور ہماری شامت اعمال کی بدولت یہ کئی اہم خطوں میں اپنے قدم گاڑ بھی چکی ہیں۔

---

①Abidullah Jan; "Afghanistan..."; pg:33

②Noam Chomsky; "Imperial Ambitions"; Pg:49

جزیرۃ العرب اپنے محل وقوع کے اعتبار سے کرۂ ارض کے قلب میں واقع ہے دنیا کے اہم بحری راستے اس کے ارد گرد واقع ہیں۔ اس کے ایک طرف خلیج عرب یا خلیج فارس ہے جس میں پوری دنیا کے پٹرول کا ۶۲ فیصد سے ۷۵ فیصد ذخیرہ موجود ہے خلیج عرب سے تھوڑا آگے پورے جزیرۂ نما عرب سے لگتا ہوا بحر عرب یا بحر ہند ہے۔ جزیرۂ عرب کے مشرق میں خلیج عمان اور مغرب میں خلیج عدن واقع ہے۔ یہ پورا علاقہ مشرق و مغرب کی گزر گاہ اور عالمی تجارت اور ہر قسم کی نقل و حمل کے لیے عالمی شاہراہ ہے۔ جزیرۂ نما عرب کی دوسری طرف بحر احمر یا بحرِ قلزم ہے جو براعظم ایشیا اور براعظم افریقہ کے درمیان حد فاصل اور ایشیا سے یورپ جانے کا مختصر ترین راستہ ہے۔ جزیرۂ عرب ان عظیم ارضی و آبی خطوں کے درمیان واقع ہے اور ان علاقوں کے درمیان ہونے والی تجارت اور بذریعہ سمندر آمد و رفت یہاں سے گزرے بغیر نہیں ہو سکتی۔ بحرِ احمر کو استعمال کیے بغیر سمندری راستے کے ذریعے اگر کوئی ایشیا سے یورپ و امریکہ جانا چاہے تو کئی مہینوں اور سینکڑوں میل کا اضافی سفر اور اخراجات برداشت کرنے پڑتے ہیں لہٰذا بحر احمر ایشیا، یورپ، افریقہ اور امریکہ کے چاروں براعظموں کے درمیان واحد سمندری شاہراہ اور عالمی تجارت کے لیے ریڑھ کی ہڈی ہے۔ اس کے علاوہ براعظم افریقہ، براعظم یورپ اور براعظم ایشیا کے تمام اہم سمندری درے یا گھاٹیاں عالم اسلام میں واقع ہیں۔ یہ وہ جگہیں ہیں جو عالمی تجارت اور بین الاقوامی اقتصادیات کے لیے شہ رگ اور عسکری و دفاعی نقطۂ نظر سے اہم مورچوں کی حیثیت رکھتی ہیں جغرافیائی اصطلاح میں انہیں Choke Points کہا جاتا ہے۔ مفتی ابولبابہ شاہ منصور اپنی کتاب ''حرمین کی پکار'' میں ان دروں کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔ [1]

1) **مضیق ہرمز:** یہ خلیج عرب کے دہانے پر عمان سے متصل واقع ہے، خلیج سے نکلنے والا کوئی بھی جہاز اس کو عبور کیے بغیر بحرِ ہند میں داخل نہیں ہو سکتا۔

---

[1] مفتی ابولبابہ: ''حرمین کی پکار''؛ البدر اس، کراچی، سن: ن؛ ص: 99

2) **بابُ المندب:** یہ بحرہ احمر کے دہانے پر واقع ہے اور بحیرۂ احمر کو بحر ہند سے ملاتا ہے۔

3) **نہر سویز:** عالمی اہمیت کی حامل اور دنیا میں اپنی نوعیت کی واحد نہر جو بحرِ ہ احمر کو بحرِ ہ روم سے ملانے کا واحد راستہ ہے۔ اگر یہ راستہ یورپ اور امریکہ کے جہازوں کے لیے بند کر دیا جائے تو ان کو سینکڑوں میل کا اضافی فاصلہ طے کرنا پڑے گا۔

4) **آبنائے باسفورس:** یہ ایشیا اور یورپ کے درمیان حدِ فاصل کا کام دیتی ہے۔ اس سے گزرے بغیر بحرِ اسود سے بحیرۂ روم میں داخل نہیں ہو سکتے۔

5) **مضیق جبل الطارق:** یہ مراکش اور سپین کے درمیان واقع وہ شہرۂ آفاق درہ ہے جس کے ایک ساحل پر طارق بن زیاد نے اپنی کشتیاں جلائی تھیں۔ آج اس کے ایک جانب برطانیہ اور دوسری جانب امریکہ کے فوجی اڈے قائم ہیں۔ یہ درہ بحیرہ روم اور بحرِ اوقیانوس کے درمیان ملاپ کا واحد ذریعہ ہے۔

یہ تمام Chokepoints اتنے اہم ہیں کہ ان میں سے کسی ایک پر بھی کوئی قابض ہو تو وہ بے حساب اقتصادی، عسکری اور سیاسی فوائد حاصل کر سکتا ہے۔ یہ ہیں تو مسلم ممالک کی ساحلی حدود میں مگر ان پر امریکہ یا اس کے اتحادیوں میں سے کسی نہ کسی کا اثر ورسوخ قائم ہے جو یہاں سے ہزروں میل دور ہونے کے باوجود مسلمانوں کی نااہلی اور اپنی مکارانہ سیاست کے بل بوتے پر یہاں چوہدراہٹ قائم کیے ہوئے ہیں۔

پھر پاکستان میں گوادر کی بندرگاہ ہے جس کی جغرافیائی حیثیت مسلم ہے۔ بلوچستان کے ساحل دنیا کی دفاعی شہ رگ ہیں کیونکہ ان سے چند ناٹس کے فاصلے پر وہ بین الاقوامی بحری راستہ ہے جہاں سے ایران، متحدہ عرب امارات، قطر، عمان، یمن، عراق، سعودی عرب، ایتھوپیا، صومالیہ اور دیگر ممالک کی ساری بحری ٹریفک گزرتی ہے۔ جبکہ گوادر سے چند میل کے فاصلے پر تحصیل جیوانی ہے جہاں سے بندر عباس کی روشنیاں نظر آتی ہیں۔ پھر

بلوچستان خلیج عرب کے کنارے پر واقع ہے جہاں دنیا کا ۷۰ فیصد سے زائد پٹرول موجود ہے۔اگر گوادر کے ساحلوں پر میزائل نصب کردیے جائیں تو جہاں دنیا بھر کی بحری ٹریفک کی آمد ورفت معطل ہو جائے گی وہاں سارا عرب، وسطی ایشیا اور سارا مشرق بعید غیر محفوظ ہو جائے گا۔اس حساس محل وقوع کے باعث تمام عالمی قوتوں اور دفاعی ماہرین کے لیے یہ خطہ نہایت اہمیت کا حامل ہے۔

اگر مسلم خطوں کی جغرافیائی حیثیت کا مذہبی تناظر میں جائزہ لیا جائے تو یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ چند ایک مسلم ممالک مثلاً بنگلہ دیش یا ملایا وغیرہ کے خطوں کو چھوڑ کر تمام مسلم ممالک ایک دوسرے کے ساتھ باہم یوں متصل ہیں کہ ایشیا، افریقہ اور یورپ تینوں براعظموں میں انکی ایک طویل اور مستقل 'بیلٹ' پائی جاتی ہے۔ اگر کبھی دنیا بھر کے مسلمانوں میں اپنے ''جسدِ واحد'' ہونے کا شعور جاگ جائے اور اپنی ''حب الوطنی'' اور وفاداریوں کو سرحدوں میں مقید کرنے کی بجائے خود کو امتِ مسلمہ کا فرد اور عالمِ اسلام کا شہری تصور کرنے لگیں تو ایک وسیع وعریض 'اسلامی بلاک'' کو وجود میں آنے سے کوئی روک نہیں سکے گا۔پھر کسی ایک اسلامی خطے پر جارحیت تمام اسلامی دنیا پر جارحیت تصور کی جائے گی،جسم کے کسی ایک حصے میں درد ہوگا تو تکلیف سے سارا جسم تڑپے گا۔اور یہ وہ ''خطرہ'' ہے جس نے موجودہ استعماری طاقتوں کی نیندیں حرام کر رکھی ہیں، لہٰذا اس خطرے کو وجود میں آنے سے روکنے کے لیے بھی عصرِ حاضر کی استعماری قوتیں اسلامی دنیا کے اہم جغرافیائی مقامات پر اپنا اثر ونفوذ قائم کرنے اور اسے قائم رکھنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہیں۔

4۔معاشی وجوہات:

معاشی واقتصادی عوامل تو ہر دور کی استعماری طاقتوں کے پیش نظر ہوتے ہی ہیں اور اقتصادی مفادات کا حصول استعماری اقدامات کے بنیادی محرکات میں سے ہوتا ہے، پھر

عصر حاضر میں تو ان کی اہمیت دو چند ہوگئی ہے۔ ماضی میں بھی عباسی دور کے اندر عالمِ اسلام میں زندگی کی جو آسائشیں پائی جاتی تھیں اور اسباب وضروریاتِ زندگی کی جو فراوانی تھی یورپ کے پسماندہ ملکوں میں ان کا ذکر رشک، حیرت اور استعجاب کے ساتھ ہوتا تھا۔ اور یہاں دولت کی ریل پیل کا سن کر وہاں ان کی رال بہنے لگتی تھی۔ ان کی صلیبی مہم جوئی کے محرکات میں سے ایک محرک یہ بھی تھا۔ پوپ اربن دوئم نے ''ارض مقدس'' کو ''کفار'' کے ہاتھوں سے چھین لینے کے لیے عیسائی عوام کو مغفرت اور بہشت کی ضمانت اور بشارتوں کے علاوہ یہ لالچ بھی دیا:

''فرانس انسانی آبادی سے تنگ پڑ گیا ہے اور ارضِ کنعان میں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں''۔ (1)

اور آج کا دور تو یوں بھی ''سرمایہ دارانہ'' دور ہے اور دنیا کے وسائل پر قبضہ و دسترس موجودہ سرمایہ دارانہ طاقتوں کو اپنے ''survival'' کے لیے از حد ضروری نظر آتا ہے۔

خالقِ کائنات نے عالم اسلام کو نہایت فیاضی کے ساتھ قدرتی وسائل سے نوازا ہے۔ اوریا مقبول جان اپنے ایک کالم میں اسلامی دنیا کے وسائل کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دنیا کے کل دریافت شدہ تیل کا دو تہائی خلیج فارس سے نکلتا ہے۔ سعودی عرب 26 فیصد۔۔۔ عراق 11 فیصد، متحدہ عرب امارات 10 فیصد، کویت 10 فیصد اور ایران 8 فیصد۔ دنیا کے قدرتی گیس کے وسائل میں سے 40 فیصد مسلمان ملکوں میں پائے جاتے ہیں۔ جبکہ وہ وسائل جو ابھی دریافت کرنا یا نکالنا باقی ہیں ان کی حالت یہ ہے کہ وسطی ایشیائی مسلمان ریاستوں میں قازقستان کے پاس 17 بلین بیرل تیل اور 83 ٹریلین کیوبک فٹ گیس کے مصدقہ ذخائر ہیں۔

---

(1) حامد کمال الدین: ''رو بہ زوال امریکن ایمپائر''، ص: 60

ترکمانستان کے پاس 155 ٹریلین کیوبک فٹ گیس ہے اور وہ دنیا کا چوتھا بڑا گیس پیدا کرنے والا ملک ہے۔ ازبکستان اور کرغستان سونے کی پیداوار میں دنیا میں اہم درجے پر ہیں۔ اور تاجکستان کے پاس ایلومینیم کے ذخائر دنیا کے کسی بھی ملک سے زیادہ ہیں۔''(۱)

سمندر، دریا، معدنیات، جنگلات، موسم اور افرادی قوت کی فراوانی کی بدولت اسلامی دنیا کا آج کے عالمی لٹیروں کے استعماری حملوں کی زد پر ہونا ایک قدرتی امر ہے۔

حامد کمال الدین لکھتے ہیں:

''ہم اپنے ان تجزیہ نگاروں سے اختلاف نہیں کرتے جو ان استعماری حملوں کا محرک 'وسائل پر قبضہ و دسترس' بیان کرتے ہیں۔ بلاشبہ عالم اسلام کے وسائل پر تسلط پانا اور یہاں پائے جانے والے انسانوں کو 'مزدوروں'، 'کان کنوں' اور ٹیکس کلکٹروں کی صورت میں دیکھنا ان کی اس تگ ودو کا ایک بڑا محرک رہا ہے اور آج تک ہے۔''(۲)

مشینوں اور صنعتوں کے اس دور میں جتنی اہمیت معدنی تیل کی ہے وہ محتاج بیان نہیں اور اسلامی دنیا خصوصاً عرب اور خلیجی ممالک اس سیال سونے کی نعمت سے مالا مال ہیں جس پر دور حاضر میں اقوامِ عالم کی زندگی، بقا اور ترقی کا دارومدار ہے۔ انسان کی تمام تر ضروریات و سہولیات، خوراک و پوشاک، دوائیاں اور دیگر اشیائے صرف، ہر چیز تیاری سے لے کر صارف کے ہاتھ میں پہنچنے تک ہر ہر مرحلے میں پٹرول کی محتاج ہے۔ یہ صنعتی دور کا آبِ حیات ہے جس کا تقریباً ۷۰ فیصد خلیج اور عرب ممالک میں پایا جاتا ہے۔ پٹرول کے بعد توانائی کے حصول کا دوسرا اہم ترین ذریعہ قدرتی گیس ہے۔ اس معاملے میں بھی اللہ تعالیٰ نے مسلم خطوں کو بہت نوازا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان ذخائر کی دریافت کے پہلے دن

(۱) اوریا مقبول جان؛ کالم: ''آہنی گیٹ'': حرف راز 1، 2013ء: ص: 19

(۲) حامد کمال الدین؛ ''روبہ زوال امریکن ایمپائر''، ص: 71

سے ہی اس وادی ''غیر ذی زرع'' اور خلیج کے ممالک پر اپنا اثر و رسوخ قائم کرنے اور اپنا قبضہ جمانے کے لیے عالمی استعماری طاقتیں سرگرمِ عمل ہیں۔

ہمپٹن یونیورسٹی، ورجینیا کے پروفیسر سیٹون جے روز تھل کہتے ہیں:

''امریکی حکمران طبقے کے مشرقِ وسطیٰ میں واضح مفادات ہیں جنکے حصول کے لیے وہ تقریباً ایک صدی سے مسلسل کوشاں ہیں۔ ان مفادات کو 'سامراجی مفادات' کے نام سے موسوم کیا جاسکتا ہے۔ جنہوں نے ہمیشہ اس خطے کے توانائی کے ذرائع یعنی تیل، گیس، پائپ لائن اور عالمی منڈیوں سے ملانے والے سمندری راستوں پر کنٹرول کے لیے جغرافیائی تذویراتی مفادات کے حصول کی کوششوں پر زور دیا ہے۔''(۱)

امریکی صدر کارٹر نے ایک مرتبہ اپنی حسرت اور مجبوری کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر خدا عرب کے پٹرول کو ذرا مغرب کی طرف سرکا دیتا تو ہماری مشکلات آسان ہو جاتیں۔(۲)

یہ تیل ان مغربی قوتوں کی ایسی دکھتی رگ ہے کہ جب سعودی فرمانروا شاہ فیصل شہید نے امریکی عزائم کے خلاف مزاحمت کا پرچم بلند کیا اور تیل کی فراہمی پر پابندی لگائی تو انہیں قتل کروا دیا گیا۔ امریکہ کے عراق پر حملے کے پسِ منظر میں بھی عراق کی جغرافیائی حیثیت اور اس کے معدنی وسائل حملے کی اہم وجوہات ہیں۔ نوم چومسکی عراق پر امریکی حملے کی وجوہات بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

"It (Iraqi oil) is undoubtedly central (to U.S)

---

(۱) روز تھل سٹیون، جے؛ مضمون: ''امریکی خارجہ پالیسی اور مشرقِ وسطیٰ''، مجلہ: ''مغرب اور اسلام''، رسالہ: 35؛ ص: 23

(۲) مفتی ابولبابہ؛ ''حرمین کی پکار''؛ ص: 116 (بحوالہ التدخل العسکری فی منابع النفط، ص: ۱۲)

strategy."①

(عراقی تیل بلا شک امریکی حکمتِ عملی میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔)

اللہ تعالیٰ نے اسلامی خطوں کو مناسب موسموں، آب وہوا اور آبی ذخائر سے بھی نوازا ہے۔ یوں زیر زمین معدنیات کے علاوہ زراعت کے شعبے میں ترقی کے بھی بے شمار مواقع عالم اسلام کو میسر ہیں۔ مغربی ممالک کے برعکس اسلامی خطوں میں افرادی قوت کی بھی کمی نہیں، لیکن ہماری بدقسمتی ہے کہ ان بیش بہا وسائل کے مالک ہونے کے باوجود مسلم ممالک شدید پسماندگی اور بدحالی کا شکار ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو بلا شک وشبہ ہماری اپنی ہی نالائقیاں اور کوتاہیاں ہیں لیکن دوسری طرف اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ مغربی استعماری طاقتوں نے مسلم خطوں کے وسائل پر اپنا قبضہ اور تصرف قائم کرنے کے لئے ان ممالک کو اپنی سازشوں اور مکارانہ سیاستوں کے جال میں الجھا رکھا ہے اور ان قوتوں کے جارحانہ اقدامات اور دراندازیاں کمزور مسلمان خطوں کو معاشی طور پر سنبھلنے نہیں دیتیں۔ عابداللہ جان اپنی تصنیف "Afghanistan:The Genesis of the Final Crusade" میں افغانستان پر امریکہ کے حملے کی تین وجوہات بیان کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک پہلی وجہ تو ایک خالص اسلامی ریاست کے قیام کا خوف تھا، دوسری وجہ یہ تھی کہ امریکہ کو افغان طالبان کی شکل میں ایک ایسی قوت ابھرتی نظر آ رہی تھی جو امریکہ کے سامراجی اور استعماری عزائم کے لیے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتی تھی۔ جبکہ مصنف کے نزدیک تیسری وجہ خالصتاً معاشی مفادات کا حصول تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

"The third reason was actually the expected bonus or booty of the crusade. It is the leverage over the oil and natural gas of Central Asia. Afghanistan was one country that the United States could control where a

①Noam Chomsky; "Imperial Ambitions";pg:5

pipe line can run from those reserves to the Indian Ocean, for the rapidly growing Asian market."①

(تیسری وجہ صلیبی جنگ کے نتیجے میں حاصل ہونے والا مال غنیمت تھی۔ یہ وسطی ایشیا کے قدرتی گیس اور تیل کے ذخائر کو اپنی دسترس میں کرنا تھا۔ افغانستان ایک ایسا ملک تھا جو ریاستہائے امریکہ کے قبضے میں آجاتا تو یہاں پائپ لائنیں بچھا کر وسطی ایشیا کے ان قدرتی وسائل کی ترسیل بحر ہند تک ممکن بنائی جاتی اور ایشیا میں اس کی بڑھتی ہوئی مانگ سے فائدہ اٹھایا جاتا۔)

5۔ معاشرتی اور تہذیبی وجوہات:

بیسویں صدی کے مشہور مغربی تاریخ دان آرنلڈ جے ٹائن بی اپنی شہرہ آفاق تصنیف "A Study of History" کے آغاز میں کہتے ہیں کہ انسانی تاریخ کی تحقیق اور مطالعے کے لیے انسانوں کی موثر ترین گروہ بندی لسانی، نسلی یا جغرافیائی نہیں بلکہ "معاشرتی" ہے۔ اسی کو ٹائن بی "Intelligible Unit of History" قرار دیتا ہے۔ یعنی دنیا کی تاریخ کا مطالعہ کرنا ہو تو انسانوں کو زبان، رنگ، نسل یا وطن کی بنیاد پر نہیں بلکہ صرف معاشرتی اور تہذیبی بنیاد پر ممیز کیا جا سکتا ہے۔②

تہذیب وہ عنصر ہے جو کسی انسانی گروہ کے بنیادی فلسفۂ حیات و ممات، نصب العین اور اساسی عقائد سے تشکیل پاتا ہے۔ لہٰذا اسلام اور مغرب کی تہذیبوں کے نکتہ ہائے آغاز پر نظر دوڑانے سے ہی دونوں کی تہذیبی کشمکش واضح ہو جاتی ہے۔

اسلام کی معاشرتی اور تہذیبی تاریخ کا نقطۂ آغاز ہجرتِ مدینہ کے واقعے سے ہوتا

---

①Abidullah Jan; "Afghanistan........"; pg:29

②Toynbee, Arnold J; "A Study of History" (Abridgement of vol I-VI by D.C Somervell, Oxford University Press, New York, Oxford, 1946; pg: 11

ہے۔ ہجرت کے بعد مدینہ میں قائم ہونے والی مختصر اسلامی ریاست کے قیام کے ساتھ ہی اسلامی تہذیب اور معاشرت کی بنیاد بھی رکھی گئی۔ اس اولین اسلامی ریاست کے تہذیبی اور معاشرتی خدوخال براہِ راست آسمان سے اترنے والی وحی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کی روشنی میں تشکیل پائے۔ مغربی تہذیب اور اسلامی تہذیب میں ایک بہت بڑا جوہری فرق یہ ہی ہے کہ مسلمان اپنے تہذیبی، تمدنی اور معاشرتی وجود کا آغاز ''اسلام'' کے آغاز کے ساتھ تصور کرتے ہیں۔ بعثتِ نبویؐ سے ماقبل عرب معاشرت کا ذکر ہماری تاریخ میں جب بھی ہوتا ہے ''زمانۂ جاہلیت'' کے عنوان کے تحت ہی ہوتا ہے۔ خود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی اپنے اسلام لانے سے پہلے کی زندگیوں اور طرزِ معاشرت کو جاہلیت کے دور سے ہی تعبیر کرتے تھے۔ پھر عجمی دنیا میں بھی جو جو اقوام مشرف بہ اسلام ہوتی رہیں ان کی معاشرت اور رہن سہن بھی اسلامی تعلیمات کے رنگ میں رنگتا چلا گیا۔ ان کے رہن سہن، معاشرتی اور تہذیبی روایات اور رسومات پر اسلامی تعلیمات کا رنگ غالب آ گیا۔ مثال کے طور پر ہندوستان کے جن باشندوں نے کلمۂ توحید پڑھ لیا انہوں نے صرف مذہبی ہی نہیں بلکہ اپنی معاشرتی اور تہذیبی شناخت بھی بدل لی اور اپنے ہندو آباء اور ان کی مذہبی روایتی دیومالائی داستانوں کے کرداروں کے ساتھ اپنا رشتۂ شناخت ہمیشہ کے لیے منقطع کر دیا۔ مسلمانانِ مصر فراعنہ کی تہذیب کو اور اسلامیانِ عراق بابل کی تہذیب کو آثارِ قدیمہ، کھنڈرات اور عجائب گھروں کی زینت ہی تصور کرتے ہیں۔ اسی طرح آج یورپ یا امریکہ کا کوئی سفید فام باشندہ جب اسلام قبول کرتا ہے تو لمحوں میں اس کا تہذیبی ورثہ تبدیل ہو جاتا ہے۔

البتہ مغرب کا معاملہ اور ہے۔ یہ اپنے وجود کا آغاز دین سے کرتے ہیں اور نہ ہی اپنے دورِ ماقبل عیسائیت کا ذکر زمانۂ جاہلیت کے طور پر۔ بلکہ یہ اپنے تہذیبی اور معاشرتی وجود کا سلسلہ اس یونانی اور رومی تہذیب سے جوڑنے میں فخر محسوس کرتے ہیں جس کی بنیاد

ہی بت پرستی، توہمات، دیویوں اور دیوتاؤں کی حیا باختہ داستانوں، خداؤں کی باہمی جنگ وجدل، طبقاتی نظام اور شہوت پرستی پر مشتمل ہیں۔ اپنی معاشرتی اور تہذیبی تاریخ میں عیسائیت کو ''بنیاد'' نہیں بلکہ صرف ایک ''واقعہ'' یا ''اضافہ'' سمجھتے ہیں۔ ایک مسلمان کے نزدیک علم وحکمت کا اولین سرچشمہ وحیٔ الٰہی اور انبیاء اللہ کی تعلیمات اور اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کی صحبت سے فیض یاب ہونے والے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگیاں ہیں جبکہ امریکہ اور یورپ کی عیسائی اقوام ''Greek Mythology'' میں ''علم وحکمت'' کے موتی عین اسی عرق ریزی اور عقیدت سے چنتی ہیں جو ہمارے یہاں انبیاء کی سچی داستانیں نقل کرتے ہوئے ملحوظ رکھی جاتی ہیں۔ مدنی دور میں جب اسلامی تہذیب ومعاشرت کے خدوخال وحیٔ الٰہی کی روشنی میں تراشے جارہے تھے تو کسی بھی غیر اسلامی روایت کو اسلامی معاشرت کا حصہ بننے کی اس شدت اور احتیاط کے ساتھ حوصلہ شکنی کی گئی کہ عاشورہ کے روزوں کی تعداد میں بھی غیر قوم کی مشابہت اور پیروی سے روک دیا گیا۔(1) حتیٰ کہ سر کے بالوں کی مانگ نکالنے جیسے ایک نہایت معمولی عمل میں بھی مشرکین کی نقل سے باز رکھا گیا(2) تاکہ یہ واضح ہوجائے کہ دین اسلام کا دائرہ صرف عبادت کی رسومات تک ہی محدود نہیں بلکہ مسلمانوں کی تہذیب اور معاشرت کے خدوخال بھی آسمانی شریعت کے ہاتھوں ہی تراشے جائیں گے۔ چونکہ اسلامی معاشرت اور اسلامی تہذیب کا ماخذ براہِ راست قرآن اور سنت نبویؐ ہے لہٰذا ہمارے معاشروں میں غیر اسلامی، رسومات وعادات کا رواج پاجانا بالآخر اسلامی معاشروں کو کمزور کرنے کا باعث ہوسکتا ہے۔ اسی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے مولانا مودودی رحمہ اللہ اسلامی تہذیب کو ایک خوبصورت مستحکم اور شاندار عمارت سے تشبیہ

(1) مسلم، ابوالحسین مسلم بن الحجاج القشیری، النیسابوری: ''صحیح مسلم''؛ کتاب الصیام، باب: ای یوم یصام فی عاشوراء

(2) بخاری: ''الجامع الصحیح''؛ کتاب اللباس، باب الفرق

دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"....اس عمارت کے دروازے اور روشن دان اس طرز پر بنائے گئے ہیں کہ باہر کی روشنی اور صاف ہوا کو بخوبی داخل ہونے دیتے ہیں مگر گرد وغبار اور خس وخاشاک اور بادوباراں کو داخل ہونے سے روک دیتے ہیں۔ یہ تمام خوبیاں جو اس عمارت میں پیدا ہوئی ہیں ایک ہی چیز کی بدولت ہیں اور وہ ایمان ہے.... اسی پر عمارت کی وسعت ورفعت اور استحکام کا انحصار ہے.... پس ایمان اس عمارت کی جان ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو اس کا قائم رہنا کیسا، وجود میں آنا ہی محال ہے...."(1)

یہی وہ اہم نقطہ ہے جو مغربی استعمار سمجھ چکا ہے کہ اسلامی معاشرے کی بنیاد "مذہبیت" پر رکھی گئی ہے۔ اسی لیے مغربی تہذیب کے ماڈرن نظریات کے لیے اسلامی تہذیب و معاشرت میں اپنی جگہ بنالینا آسان نہیں:

"What distinguishes the Muslim state from the modern West, however, is its preoccupation with the central role of Islamic culture in the discussion over modernization and development."(2)

(اسلامی ریاست کو جو چیز جدید مغرب سے ممتاز کرتی ہے وہ ترقی یافتہ دور کی جدید تہذیب میں اسلام کے کردار کے ساتھ مسلمانوں کی جذباتی وابستگی ہے۔)

لہٰذا اسلامی معاشرتی نظام کے لیے مغرب کی لادینی اور سیکولر ذہنیت کا بُغض ایک طبعی اور قدرتی امر ہے۔

---

(1) مودودیؒ، "اسلامی تہذیب اور اس کے اصول ومبادی" اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ستمبر 2008، ص: 265

(2) "The Oxford History of Islam";pg:560

آرنلڈ جے ٹائن بی نے اپنی تصنیف "A Study of History" میں دنیا کی مختلف تہذیبوں کا جائزہ پیش کیا ہے اور اس سوال پر بحث کی ہے کہ تہذیبیں کیسے جنم لیتی ہیں، کیسے پھلتی پھولتی اور ترقی کرتی ہیں اور کیسے دوسری تہذیبوں پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ایک نئی تہذیب کی ابتدا کسی معاشرے کی ایک اقلیت کے ہاتھوں ظہور پذیر ہوتی ہے۔ یہ افراد دو کام کرتے ہیں۔ ان کا پہلا کام کسی نئے نظریئے کا حصول ہوتا ہے اور دوسرا کام اپنے معاشرے اور تہذیب کے لوگوں کو اس نئے طرز زندگی پر ڈھالنا ہوتا ہے۔ یہ اقلیت اپنے معاشرے کے چند تخلیقی افراد پر مشتمل ہوتی ہے جو پہلے خود اس نئے نظریئے کو اپنی ذات پر لاگو کرتے ہیں اور تبدیلی کی کیفیت اور تجربے سے گزرتے ہیں۔ ان کے بعد ان کی پیروی کرنے والے لوگ ان افراد کے ظاہری طور طریقوں کی نقل کرتے ہوئے اس نئی تہذیب کا حصہ بنتے ہیں۔ ان ہی ظاہری طور طریقوں کی نقل کو ٹائن بی Mimesis کا نام دیتا ہے۔[1] ان چند تخلیقی یا اقلیتی افراد کے 'mimesis' یعنی ظاہری طور طریقوں کو جتنی تیزی اور مضبوطی کے ساتھ کسی دوسری زوال پذیر پرانی تہذیب کے لوگ اپنا لیتے ہیں اتنی ہی تیزی کے ساتھ یہ نئی تہذیب پروان چڑھتی ہے اور بڑھتی ہے۔ گویا جس فرد، گروہ یا معاشرے کے ظاہری طور طریقوں کی نقل کی جائے گی اُن ہی کی تہذیب ترقی کرے گی اور پھلے پھولے گی۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ نے چودہ صدیاں قبل اپنی اُمت کو خبردار کیا تھا کہ:

من تشبه بقوم فهو منهم.[2]

(جو شخص کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے وہ ان ہی میں سے ہے۔)

یہ اسی لیے کیونکہ غیر قوم کی نقالی کا لازمی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ اس قوم کی تہذیب ترقی

---

[1] Toynbee, "A Study of History"(Abridgement of voll I-VI by D.C Somervell), Oxford,1946;pg:276

[2] ابوداؤد: ''سنن ابي داوٗد'': کتاب اللباس، باب في لبس الشهرة

کرتی ہے اور ہماری تہذیب زوال کا شکار ہوتی ہے۔ چونکہ اسلام کی معاشرتی اور تہذیبی اقدار کا منبع و سرچشمہ نبی ﷺ کی سنت مبارکہ ہے لہٰذا اسلامی تہذیب کو کمزور اور بے وقعت کرنے کی واحد صورت یہی ہے کہ مسلمانوں میں سنت رسول ﷺ کی پیروی کا تصور نعوذ باللہ ختم ہو جائے اور غیر اقوام کی عادات و رسومات یہاں رواج پا جائیں۔ اسی لیے مسلمانوں کو اپنے نبی ﷺ کی سنت سے چمٹا دیکھ کر وہ پیچ و تاب کھاتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ جب تک مسلمان اپنے نبی ﷺ کی سنت اور اسلاف کی روایات سے چمٹے رہیں گے اسلامی تہذیب نہ صرف قائم رہے گی بلکہ اس کی روشنی سے مغربی تہذیب کی مصنوعی چکا چوند کا پول بھی کھل جائے گا۔ اس کے برعکس عہد حاضر کے مسلمان اگر اپنی تہذیبی اقدار کو چھوڑ کر مغربی تہذیب کے رنگ میں رنگے جائیں تو ان کی شناخت اور تشخص ختم ہو جائے گا اور پھر انہیں مغربی استعمار کا تر نوالہ بننے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کو ان کی تہذیبی اقدار سے دور کرنے کے لیے آج پوری طاقت صرف کی جا رہی ہے۔

اسلامی تہذیب کو اپنے ہدف پر رکھنا مغربی دنیا کے لیے اس لیے بھی ضروری ہے کیونکہ گو مغرب اپنے طور پر تو دنیا بھر کے مسلمانوں کے بیچ قومیت کی دیواریں کھڑی کرنے میں تو کامیاب ہو گیا ہے لیکن ''مشترکہ اسلامی تہذیب'' ابھی بھی ایک ایسی ڈور ہے جس نے آج بھی دنیا بھر کے مختلف مسلمان ممالک کے عوام کو کسی حد تک آپس میں باندھ رکھا ہے۔

فصل چہارم:

عالمِ اسلام کے خلاف نو استعماری نظام کے اہداف

دورِ حاضر کے استعمار نے مسلم ممالک کے خلاف اپنے ناپاک عزائم کی تکمیل کے لیے کچھ اہداف پر اپنی توجہ مرکوز کر رکھی ہے۔ صدیوں کے تجربات سے ہمارے دشمن یہ سبق سیکھ چکے ہیں کہ مسلمانوں کو براہِ راست میدان جنگ میں شکست دینا ناممکن نہیں تو کم از کم بے انتہا مشکل ضرور ہے۔ خود قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ مسلمان اگر ثابت قدم رہیں تو اللہ کفار کے دلوں میں خود مسلمانوں کی دہشت ڈال دے گا[1] اور مسلمان اپنے سے دوگنا تعداد کے دشمنوں پر بھی غالب آجائیں گے۔[2]

لہٰذا آج کی استعماری طاقتوں کا پورا زور اور محنت میدانِ جنگ کے علاوہ مسلمان معاشروں کے ان تمام دفاعی حصاروں میں نقب لگانے پر صرف ہو رہی ہے جو اس امت کو ناقابل تسخیر قوم بناتی ہیں۔ اس ضمن میں جدید استعمار کے مندرجہ ذیل اہداف ہیں:

1) مذہبی اہداف
2) معاشرتی اہداف
3) معاشی اہداف
4) عسکری اہداف
5) سیاسی اہداف

1۔ مذہبی اہداف:

چودہ صدیاں قبل مسلمانوں کا آدھی دنیا کو فتح کر لینا، ایک ہزار سال تک ایک

---

[1] الانفال 12:8

[2] الانفال 66:8

شاندار ''اسلامک ایمپائر'' کو کھڑا رکھنا، دنیا کے ایک بڑے حصے کو علم، تہذیب اور تمدن کی نئی جہتوں سے روشناس کروانا یہ کسی ''قوم'' کی فتح نہیں تھی، یہ ایک ''عقیدے'' کی فتح تھی۔ یہ ایک نظریئے کی کامیابی تھی اور اس ''راز'' کو ہمارا دشمن نہایت اچھی طرح پہچان چکا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کا سامنا ایک قوم سے نہیں بلکہ ایک عقیدے سے ہے۔ اس کی فتح اس قوم کو میدانِ جنگ میں شکست دینا نہیں بلکہ اس نظریئے کو جڑ سے ختم کرنے میں ہے جو ایک مسلمان کو انسانوں کی غلامی کا طوق گلے سے اتار پھینکنے کی جرأت عطا کرتا ہے۔ کلمۂ لا الہ الا اللہ جب دل کی گہرائیوں کے ساتھ ادا کیا جاتا ہے تو یہ محض زبان سے ادا ہونے والے چند الفاظ نہیں ہوتے بلکہ یہ باطل پر چلنے والا تیشہ بن جاتے ہیں۔ جب تک مسلمان کی زندگی میں مرکزی حیثیت اس کلمے کی رہتی ہے اس کی زندگی کا ہر انفرادی و اجتماعی عمل، لین دین، سیاست، حکومت، معیشت الغرض سب معاملات خالقِ کائنات کے بتائے ہوئے اور نبی اُمی صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم کے سکھائے ہوئے ''اوامر و نواہی'' کی روشنی میں طے پاتے ہیں۔ پھر وہاں کفر کی مصنوعی چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے اور نہ ہی باطل کے چہرے پر پڑے دنیاوی زینتوں سے مزین پردے اسے کسی دھوکے میں ڈال سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی زندگیوں سے دین اور عقیدے کی مرکزیت کو ختم کر دینا آج استعمار کا ایک بہت اہم ہدف ہے۔ ان کی کوشش ہے کہ جس طرح انہوں نے ''مذہب'' سے یہ حق چھین لیا ہے کہ وہ انسانی معاشروں کے لیے زندگی اور آخرت کی کامیابی و ناکامی کے اصول وضع کرے اسی طرح اسلامی معاشرے بھی اس ''پس ماندگی''، ''تنگ نظری'' اور ''جہالت'' سے پیچھا چھڑا لیں اور فلاح اور ترقی کے تمام تر ضابطے آسمانی وحی کی بجائے مغربی Think Tanks سے درآمد کر کے معاشروں پر لاگو کیے جائیں۔ مغرب کے اس الحادی فلسفے کی یلغار اتنی شدید تھی کہ عیسائیت سمیت دنیا کے ہر معاشرے نے اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا۔ یا اگر کہیں کوئی اور سیاسی یا معاشی نظریہ مقابلے پر آیا بھی تو اسے قوت کے زور پر دبا دیا گیا۔

مغرب کو کسی مضبوط مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تو وہ اسلام کی طرف سے کرنا پڑا کیونکہ عقیدۂ توحید کی فطرت میں ہی نہیں کہ وہ باطل کی بالادستی قبول کرے۔ لہٰذا اسلام کے اس آفاقی عقیدے ''عقیدۂ توحید'' پر ضرب لگانا مقصود ہے۔ یہ وہ عقیدہ ہے جو استعماری مقاصد اور عزائم کی راہ میں مختلف سطحوں پر مزاحم ہوتا ہے۔

1) سب سے پہلے تو یہ عقیدہ انسان کو کسی دوسرے انسان کا غلام نہیں بننے دیتا۔

2) یہ عقیدہ انسانی زندگی کی کسی بھی پہلو میں (وہ انفرادی ہو یا اجتماعی) ربّ کائنات کے بنائے ہوئے نظام کے علاوہ کسی اور نظام کی پیروی قبول نہیں کرتا۔

3) یہ عقیدہ اپنے پیروکاروں کو سرحدوں اور ملکوں کی قیود سے نکال کر ایک ''امت'' بناتا ہے۔ لہٰذا یہ ''خطرہ'' ہمہ وقت استعمار کے سر پر منڈلاتا ہے کہ اگر کبھی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹی ہوئی مسلمان ''قوموں'' کے اندر ایک قوم ہونے کا شعور مکمل طور پر جاگ گیا تو ان کی صدیوں کی ''محنت'' بیکار ہو جائے گی۔

4) عقیدۂ توحید کے پیروکاروں کو دوستوں اور دشمنوں کی پہچان علاّمُ الغیوب کی طرف سے چودہ سو سال پہلے کروادی گئی ہے۔ اگر مسلمان اپنے دین کے سکھائے گئے عقیدۂ الولاء البراء کی طرف لوٹ آئیں تو باطل طاقتیں کبھی بھی مسلمانوں کو ''دوستی'' اور ''خیر خواہی'' کا فریب دے کر لوٹ نہیں سکیں گی۔

لہٰذا استعمار کی آج پوری کوشش یہی ہے کہ دین کو صرف عبادت خانوں میں محصور کر دیا جائے اور امورِ ریاست و معاشرت اور معیشت سے اسے بے دخل کر دیا جائے اور مسلمانوں میں اس قدر فکری انحرافات پیدا کر دیے جائیں کہ اصل دین اور عقیدہ ان انحرافات کے غبار میں دھندلا کر رہ جائے۔ اسلام کا عقیدۂ الولاء البراء بھی استعمار کا ایک بڑا ہدف ہے کیونکہ یہ عقیدہ واضح راہنمائی کرتا ہے کہ دوستی، دشمنی، دلی تعلق اور رازداری کے تعلقات کا معیار کیا ہو۔ اگر مسلمان اپنے دوستوں اور دشمنوں کی پہچان اس کسوٹی کو سامنے

رکھ کر کرنے لگیں تو استعمار کی کوئی سازش کبھی کامیاب نہ ہو۔

غرض یہ کہ استعمار کو آج اسلام کا وہ ایڈیشن درکار ہے جو اپنے پیروکاروں کو بس عبادات اور زیادہ سے زیادہ کچھ اخلاقیات تو سکھا سکتا ہے لیکن اس سے آگے مذہب کا دائرۂ کار ختم ہو جائے۔

حامد کمال الدین اپنے مضمون ''میثاقِ لا الہ الا اللہ'' میں لکھتے ہیں:

''مذہب کا وہ ایڈیشن یہاں شدت سے درکار ہے جو 'مسجدوں' سے بڑے پیمانے پر ایسے 'عبادت گزار' پیدا کر دے جو کفر کے محکوم معاشروں میں ناک کی سیدھ چلیں اور صرف اپنی 'روحانی ترقی' کی فکر کریں! ہر مذہب کو آج ایسے ہی پیروکار پیدا کرنا ہیں جن کے دین کا فرق 'عبادت خانوں' کے اندر جا کر ہی پتہ چلتا ہو۔ رہی 'عبادت خانوں' سے باہر کی دنیا، تو یہاں سب کا دین ایک ہو۔'' (1)

تو گویا آج کے نو استعماری ایجنڈے میں ایک اہم ہدف یہی ہے کہ مذہب اور عقیدے کو عبادت خانوں میں مقید کیا جائے اور مغربی الحادی فلسفے کا ''عالمی شریعت'' کے طور پر نفاذ کو ممکن بنایا جائے۔ عقیدے کی اس جنگ میں مغرب کا واحد حریف اسلام ہی ہے۔ کیونکہ یہی وہ دین ہے جو اس عالمی استعماری ایجنڈے کے مقابلے پر کھڑا ہے، دوسری جانب پوری انسانیت کی مزاحمت مذہب کے اس ''اسٹینڈرڈ ایڈیشن'' کے آگے دم توڑ چکی ہے۔ صرف مسلمان ہی ہیں جن کے پاس دنیا کو دینے کے لیے ایک مکمل متبادل نظام موجود ہے اور مغرب کو خوف بھی اسی بات کا ہے کہ اگر کہیں مسلمانوں میں عقیدے کی پختگی اور درستگی پیدا ہو گئی تو نہ صرف یہ کہ وہ مغرب کا تر نوالہ نہیں بنیں گے بلکہ باقی دنیا بھی اس مذہب

---

(1) حامد کمال الدین، مضمون: ''میثاق لا الہ الا اللہ''، سہ ماہی ایقاظ، جنوری تا مارچ 2010: مطبوعات ایقاظ، لاہور، ص 144:

کی سچائی اور آفاقیت کی قائل ہو جائے گی۔ لہٰذا مسلمانوں کے اندر فکری انحرافات پیدا کرنا، انہیں دین کے متشابہات میں الجھائے رکھنا اور انہیں خود اپنے دین کے متعلق شکوک وشبہات میں ڈال دینا، یہ اس وقت عالمی طاغوت کے بڑے مقاصد ہیں وہ دنیا میں جاری اپنی تمام تر جارحانہ کوششوں کو کوئی بھی عنوان دیں اور اس کا کوئی بھی جواز پیش کریں حقیقت یہی ہے کہ انکی تمام تر محنت اور بھاگ دوڑ کا ایک بنیادی مقصد اسلامی عقیدے اور نظریے کو شکست سے دوچار کرنا ہے۔

عابداللہ جان لکھتے ہیں:

"Although the goals in the publicaly available reports revolve around military control of the Gulf region, simultaneonsly fighting multiple wars, permanent bases in saudi Arabia and Kuwait... But the facts on the ground reveal that the single objective is defeating the ideology of Islam."[1]

(گوعوام کے سامنے پیش کی جانے والی رپورٹوں میں خلیج پر فوجی قبضہ، بیک وقت کئی محاذوں پر جنگ اور سعودی عرب اور کویت میں مستقل اڈے قائم کرنے جیسے مقاصد ہی گنوائے جاتے ہیں۔۔ لیکن زمینی حقائق یہی ثابت کرتے ہیں کہ واحد مقصد صرف اسلام کے نظریے کو شکست سے دوچار کرنا ہے۔)

یہی وجہ ہے کہ امریکہ نے جن مسلم خطوں پر اپنا تسلط جمایا ہے وہاں اس کی کوشش یہی ہے کہ رفتہ رفتہ اسلام کو عوام کی اجتماعی زندگیوں سے خارج کر دیا جائے۔

"Organized efforts are under way to draft Iraqi and Afghan constitution in a manner to confine Islam

---

[1] Abidullah Jan; "Afghanistan...";pg:71.

to private lives and restrict Muslims from living collective lives by Islam."[1]

(افغانستان اور عراق میں اسلام کو مسلمانوں کی انفرادی زندگیوں تک محدود کرنے اور جتماعی طور پر اسلامی قوانین کے مطابق زندگیاں گزارنے سے روکنے کے لیے نہایت منظم اور منضبط انداز سے آئین کی تشکیل کی جارہی ہے۔)

2۔ معاشرتی اور تہذیبی اہداف:

ماضی میں بھی استعمار نے جہاں جہاں اپنے خونی پنجے گاڑے وہاں بڑی شدومد کے ساتھ مغلوب اقوام کے ''غیر تہذیب یافتہ'' ہونے کا ڈھنڈورا پیٹا۔ رومیوں کے نزدیک بھی ہر غیر رومی ''barbarian'' تھا اور یورپ کی استعماری طاقتوں نے بھی ایشیا اور افریقہ کی عوام کو ایسی بیگانہ، غیر مہذب اور مضحکہ خیز مخلوق جانا جنہیں تہذیب یافتہ بنانے کے لیے ان یورپی اقوام نے نہایت ''عرق ریزی'' اور ''جانفشانی'' سے کام کیا۔ آج کا استعمار بھی اپنے شکار یعنی مسلم دنیا اور اسلامی تہذیب کو اپنے نشانے پر رکھے ہوئے ہے اور اسلامی تہذیب کے خدوخال کو مسخ کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا ہے۔ ان کا ہدف یہ ہے کہ فکری اور ثقافتی پہلوؤں سے وہ مسلم معاشروں کی چولیں ہلا دیں۔ استعمار اپنی طاقت اور غلبے کے کسی بھی دور میں اس بات پر قادر نہیں ہوسکا کہ وہ عام مسلمانوں کو اسلام سے منحرف کر سکے۔ اس کا بس آج بھی اسلام کے ثقافتی اور تہذیبی پہلوؤں پر ہی چلتا ہے لہٰذا ان کا ہدف یہ ہے کہ اسلامی تہذیب کے ''mimesis'' کو مغربی تہذیبی اقدار سے بدل دیا جائے۔ اسلامی معاشروں میں صدیوں سے جاری وساری تہذیبی روایات مثلاً شرم وحیا، خاندانی نظام کا تقدس، نسل اور نسب کا تحفظ، بزرگوں کا مقام اور احترام، چھوٹوں سے محبت اور شفقت، تکریم انسانیت، خدا خوفی، آخرت کی سزا و جزا کا تصور یہ سب وہ بنیادی اخلاقیات ہیں جن سے اسلام کا سماجی ڈھانچہ کھڑا ہوتا ہے اور ان ہی کو تار تار کرنا آج کے

[1] Abidullah Jan; "Afghanistan...";pg:51

استعماری ایجنڈے میں بیحد اہم ہے۔ ساری دنیا میں عموماً اور اسلامی معاشروں میں خصوصاً بڑی ہوشیاری اور منصوبہ بندی کے ساتھ ان فلسفوں اور علوم کو پھیلایا جا رہا ہے جو براہِ راست ہمارے ان عقائید پر ضرب لگاتے ہیں جو اسلامی تہذیب کی صورت گری کرتے ہیں۔ کبھی ڈارون کے نظریات کی ترویج سے شرفِ انسانیت کو پامال کیا جاتا ہے اور کبھی فراعنہ و بابل کی معذب بستیوں کی تہذیبی عظمت کے گن گائے جاتے ہیں۔ شرم وحیا کا دامن تھامے رکھنے والوں کو ''قدامت پرست''، اور چھوٹی سے چھوٹی سنت پر سختی سے کاربند رہنے والوں کو ''شدت پسند'' کا خطاب دیا جاتا ہے۔ آج مغرب کی تہذیب جس قدر خدا بیزار، بے حیا اور غیر انسانی وغیر فطری ہے بدقسمتی سے اسے اتنا ہی چمکدار اور پرکشش بنا کر پیش کیا جا رہا ہے تاکہ ایک عام مسلمان کی نگاہیں اس مصنوعی ملمع کاری سے اس قدر خیرہ ہو جائیں کہ اسے اپنی تہذیب فرسودہ اور بے رنگ نظر آئے۔ وہ مغربی تہذیب سے اس قدر مرعوب ہو جائے کہ اسی تہذیب کو اپنا لینا اپنی ترقی اور خوشحالی کی ضمانت سمجھے۔ ہنٹنگٹن اپنے مقالے میں ایک امریکن صحافی Danial Pipes کا قول نقل کرتا ہے:

"Only when Muslims explicitly accept the western model will they be in a position to technicalize and then to develop."①

(مسلمان ٹیکنالوجی میں اسی وقت آگے بڑھ سکتے ہیں اور اسی صورت میں 'ترقی' کر سکتے ہیں اگر وہ مغرب کے نمونے کو مکمل طور پر اپنا لیں۔)

اسی طرح آسٹریلیا کے ایک سابق وزیر اعظم ٹونی ایبٹ کا بیان ہے کہ اسلام پر بالا دستی حاصل کرنے کے لیے مغرب کو ''ثقافتی بالا دستی'' حاصل کرنی ہوگی۔②

---

①Huntington; "The Clash of Civilizations.....";pg:74 (Ref:Pipes, "Path of God",pp.197-198)

②روزنامہ جنگ، لاہور؛10 دسمبر 2015؛ص:17

اگر مغرب اپنے اس مقصد میں نعوذ باللہ کامیاب ہو جاتا ہے اور مسلمانوں کی ایک قابل لحاظ تعداد اس خیال میں پختہ ہو جاتی ہے کہ ''چند'' مغربی اقدار، روایات، رسومات اور عادات کو اپنا لینے سے ہمارے اسلام کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا بلکہ اسلام کی ''بھلائی'' اسی میں ہے کہ مسلمان ''روشن خیالی'' کا مظاہرہ کریں اور دورِ حاضر کی غالب تہذیب کو اپنا لیں تو یہی عصرِ حاضر کے استعمار کی بہت بڑی جیت ہوگی۔

3۔ معاشی اہداف:

عصرِ حاضر کی استعماری قوتیں چونکہ براہِ راست مسلم خطوں پر قابض نہیں ہیں لہٰذا عالم اسلام کے بیش بہا قدرتی وسائل بھی براہِ راست ان طاقتوں کے قبضے میں نہیں۔ لیکن عصرِ حاضر کے نو استعماری نظام کا ایک ہدف یہ ہے کہ مسلم خطوں کو معاشی طور پر اتنا مضبوط نہ ہونے دیا جائے کہ وہ اپنے قدموں پر کھڑے ہو سکیں۔ مختلف بین الاقوامی مالیاتی اداروں، تنظیموں، قوانین اور پابندیوں، یہاں تک کہ دھونس اور دھاندلی کے ذریعے بھی تیسری دنیا کے ممالک خصوصاً مسلم خطوں کو ایسی اَن دیکھی زنجیروں میں جکڑ دیا گیا ہے کہ قدرتی وسائل سے مالا مال ہونے کے باوجود ان کی معیشت دنیا کی بڑی طاقتوں کے رحم و کرم پر ہے۔ نوید صادق خان، نامہ نگار روزنامہ ''انصاف'' لکھتے ہیں:

> ''اب پوری دنیا پر یہ حقیقت عیاں ہو گئی ہے کہ بش اینڈ کمپنی کی دہشت گردی کے خلاف جنگ ایک ٹوپی ڈرامہ ہے۔ اس کی آڑ میں یہ دنیا میں سرمایہ دارانہ نظام کی گرفت کو مضبوط سے مضبوط تر کرتے جا رہے ہیں تاکہ دنیا کے تمام پیداواری وسائل کو اپنے چند من پسند سرمایہ داروں کی گرفت میں دے کر کرۂ ارض کے انسانوں کی تقدیر سے کھیل سکیں۔۔۔ اسلام کے خلاف ان کی جنگ بھی اسی ایجنڈے کا ایک اہم نکتہ ہے''۔ ①

① نوید صادق خان؛ مضمون: ''دہشت گردی کی آڑ میں سرمایہ دارانہ ایجنڈے کی تکمیل''؛ ماہنامہ ترجمان القرآن، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، جنوری 2007؛ ص:52

ہمارے معاشی معاملات کی راہنمائی کے لیے شریعت ہمیں مکمل ضابطہ عطا کرتی ہے لیکن بدقسمتی سے آج ہماری معاشی پالیسیوں، عوام پر لگائے جانے والے ٹیکسوں، اپنے قدرتی وسائل کا استعمال ان سب سے متعلق احکامات مغرب سے درآمد کر کے ہم پر لاگو کیے جاتے ہیں۔ کچھ ہمارا احساس مرعوبیت اور کچھ مغربی طاقتوں کی دھونس اور دھمکیاں جن کی بدولت ہم ان کے دیئے گئے نظریات اور نظام کو قبول کر کے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار بیٹھے ہیں۔

مسلمانوں کے خلاف آج کے استعمار کا معاشی ہدف یہ ہے کہ مسلم دنیا کے وسائل پر مغربی طاقتوں کی گرفت قائم رہے اور اسلامی دنیا خود مختار معاشی ترقی کے راستے پر گامزن ہو کر اپنے پیروں پر کھڑی نہ ہو سکے۔ مغربی حربوں کی ایک بڑی مثال اس امر سے واضح ہو جاتی ہے کہ آج تیل پیدا کرنے والے مسلم ممالک میں تیل کی پیداوار اور اس سے متعلق تمام فیصلے تیل پیدا کرنے والے ممالک کی بجائے مغربی قوتوں کے ہاتھوں میں ہیں۔

پروفیسر خورشید احمد لکھتے ہیں:

> ”انہیں (مشرق وسطی کے ممالک کو) عالمی، معاشی وسیاسی ٹھیکیداروں نے مختلف حیلے بہانوں کے ذریعے اور ذرا دھمکا کر مجبور کیا ہوا ہے کہ وہ ان کی مرضی کے مطابق تیل کی پیداوار جاری رکھیں“۔ [1]

آج مغربی طاقتیں مسلمانوں کے وسائل ”مالِ مفت، دلِ بے رحم“، کے مصداق لوٹ لوٹ کر اپنے ملکوں میں لے جاتی ہیں اور اسی لوٹی ہوئی دولت سے وہ مسلمان ملکوں کو اہانت آمیز شرائط کے تحت سود پر قرض دیتی ہیں۔ غرض یہ کہ اسلامی دنیا میں نو استعماری نظام کے واضح معاشی مقاصد یہ ہیں کہ:

---

[1] پروفیسر خورشید احمد؛ مضمون: ”عالمی سرمایہ داری، توانائی کی سیاست اور مشرق وسطی“: مجلہ ”مغرب اور اسلام“؛ ص: 16

(1) اسلامی دنیا کے وسائل خصوصاً ذرائع توانائی کو اپنے قبضے میں رکھنا۔ اس مقصد کے لیے کبھی مسلم خطوں کے حکمرانوں کو قابو میں کیا جاتا ہے اور کبھی دھونس دھاندلی اور طاقت کے مظاہروں سے کام لیا جاتا ہے۔ خلیجی ممالک میں مختلف بہانوں سے اتاری گئی ان گنت مغربی افواج کے مقاصد میں سے ایک یہ بھی ہے۔

نوم چومسکی عراق پر امریکی حملے کی وجوہات بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"..If you control Iraq, your are in a very strong positon to determine the price and production levels.. and to throw your weight around throughout the world . This has nothing in particular to do with access to the oil for import into the United States. Its about control of the oil."[1]

(اگر عراق پر آپ کا تسلط قائم ہو جاتا ہے تو (تیل) کی قیمت اور پیداوار سے متعلق فیصلوں کا اختیار بھی آپ کے ہاتھ میں آجاتا ہے۔ اور ساری دنیا میں آپ کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ اس قبضے کا تعلق صرف تیل کے ذخائر تک رسائی ریاستہائے متحدہ امریکہ کی پہنچ سے نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق تیل پر ریاستہائے متحدہ امریکہ کے مکمل قبضے سے ہے۔)

(2) مسلمان ممالک کی چھوٹی چھوٹی صنعتوں اور کاروباروں کو تباہ کرنا اور انہیں پھلنے پھولنے نہ دینا۔ اس مقصد کے لیے حکمرانوں پر دباؤ ڈال کر مقامی تاجروں کے لئے ٹیکسوں کی شرح میں اضافہ، ملٹی نیشنل کمپنیوں اور مختلف کاروباری و بین الاقوامی تجارت کے اصول وقوانین کے ذریعے مشکلات پیدا کی جاتی ہیں۔

(3) اسلام اپنے پیروکاروں کو جو نظام معیشت سکھاتا ہے اس میں سود کی حرمت کے علاوہ دو نہایت اہم اصول سادگی اور اعتدال کے ہیں۔ دنیا کو حقیر جاننا اور آخرت کی نعمتیں پانے کی خواہش رکھنا خود بخود انسان کے اندر سادگی اور اعتدال کی خصوصیات پیدا کر

[1] Noam Chomsky; "Imperial Ambitions";pg:6

دیتا ہے۔ لیکن آج مغربی تسلط کے نتیجے کے طور پر مادیت پرستی اور دنیاوی لذتوں اور آسائشوں کو ہی عزت اور کامیابی کا معیار سمجھا جا چکا ہے۔ دنیا کی عارضی چکا چوند نے نگاہوں کو یوں خیرہ کر رکھا ہے کہ اس عارضی قیام گاہ میں ہی خوب سے خوب تر پانے کے لیے اندھا دھند دوڑ لگی ہوئی ہے۔ معاشی طور پر خوشحال مسلمان خطے اور افراد کے اموال و اسباب بھی امت کی فلاح کے لیے نہیں بلکہ مغرب کے مہیا کردہ عیش و عشرت کے سامان میں خرچ کر دیئے جاتے ہیں۔

4۔ عسکری اہداف:

اپنے گھوڑوں کو تیار رکھنا اور اللہ کے دشمنوں کے دلوں پر رعب اور دہشت طاری رکھنا اللہ کے احکامات میں سے ایک حکم ہے۔① نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مسلمانوں کو گھڑ سواری اور تیر اندازی جیسے عسکری مشغلوں کو اپنانے کی خصوصی ہدایت فرمائی ہے۔② اسلام کی یہی عسکریت پسندی آج کے استعمار کو خوفزدہ رکھتی ہے۔ صدیوں کے تجربات نے انہیں یہ سکھا دیا ہے کہ جب اس امت میں حقیقی جذبہ جہاد پیدا ہو جائے تو یہ دشمنوں کے ہتھیاروں، تعداد اور طاقت سے کبھی خوفزدہ نہیں ہوتی۔ یہ وہ قوم ہے جس کو میدان میں اترنے کے لیے محض ایمانی حرارت اور جذبہ حریت ہی کافی ہے۔ جس امت کی عسکری تاریخ میں دریاؤں میں گھوڑے دوڑا دینے③ اور خشکی پر بحری جہاز چلا دینے④ جیسے محیر العقول واقعات

---

① الانفال 8:60

② ترمذی، ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ، امام؛ "جامع ترمذی"؛ ابواب فضائل الجہاد، باب: ماجاء فی فضل الرمی فی سبیل اللہ

③ (اشارہ ہے سعد بن ابی وقاص اور ان کے لشکر کی طرف) نجیب آبادی؛ "تاریخ اسلام"؛ ج:1 ص:413

④ (اشارہ ہے سلطان محمد فاتح کی فتح قسطنطنیہ کے واقعے کی طرف) نجیب آبادی؛ "تاریخ اسلام"؛ جلد:2؛ ص:915

شامل ہوں ایسی قوم کے پاس اگر ایٹمی صلاحیت اور بہترین افواج کے ساتھ ساتھ عسکری اعتبار سے دنیا کی بہترین جغرافیائی پوزیشن بھی دستیاب ہو جائے تو ان کے کسی بھی لمحے ''ہوش'' میں آجانے کا امکان استعمار کی روح فنا کیے رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امتِ مسلمہ کے عسکری وسائل خصوصی طور پر استعمار کا ہدف ہیں اور ان اہداف میں صرف اسلحہ اور مادی وسائل ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کی جہادی اور عسکری نفسیات کو کچل دینا بھی مغرب کے ایجنڈے میں سرِ فہرست ہے۔ کفر کے استعماری عزائم کے آگے رکاوٹیں کھڑی کرنے والے نہتے لیکن غیرت مند مسلمانوں کو عسکریت پسند اور دہشت گرد قرار دینے کی پراپیگنڈہ مہم کا مقصد اور ہدف یہی ہے کہ اس امت کو اس جذبۂ جہاد اور حریت پسندی پر فخر کرنے کی بجائے اس پر شرمندہ اور معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیا جائے۔

آج مغرب خود ناقابلِ یقین حد تک خطرناک ہتھیاروں کا مالک ہے لیکن اسلامی دنیا کی چھوٹی سے چھوٹی عسکری صلاحیت بھی اس کی آنکھ میں کانٹے کی طرح چبھتی ہے۔ بھارت امریکہ اور اسرائیل کے مابین اسلحے کی تجارت اور عسکری تعاون کی خبریں روز کا معاملہ ہے لیکن بوسنیا اور غزہ کے مظلوم مسلمانوں کے لیے کسی بھی قسم کے اسلحے تک رسائی کو ناممکن بنا دیا جاتا ہے۔ پاکستان کی ایٹمی صلاحیت کے متعلق بھی امریکہ اکثر اپنے ''خدشات'' کا اظہار کرتا رہتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں بھی مسلمانوں کو خبردار کیا ہے کہ کفار کی پوری کوشش اور خواہش ہے کہ مسلمان اپنے اسلحہ سے غافل ہو جائیں۔

وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَاَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً ۭ [1]

''دل سے چاہتے ہیں وہ لوگ جو کافر ہیں کہ کاش غافل ہو جاؤ تم اپنے ہتھیاروں

[1] النساء 4:102

سے اور سامانوں سے تو ٹوٹ پڑیں وہ تم پر ایک دم۔"

اس ایک آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے خلاف کفار کے "عسکری اہداف" خود کھول کر بیان فرما دیے ہیں۔

آج امریکہ اور اس کے حواری دنیا کے جدید ترین تباہ کن اسلحے سے لیس ہیں لیکن عالم اسلام کے ایسے ممالک جو اپنا ایٹمی پروگرام رکھتے ہیں ان پر ہر طرف سے گھیرا تنگ کیا جاتا اور اقتصادی پابندیاں عائد کرنے کی دھمکیاں دی جاتی ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ جو مسلمان خطے بیرونی حملہ آوروں کے مظالم کی چکی میں بری طرح پس رہے ہوں ان تک کسی بھی قسم کے اسلحے کی فراہمی خاص طور پر روکی جاتی ہے تاکہ وہ اپنا دفاع کرنے کی بجائے بے یار و مددگار ہو کر رہ جائیں۔ مثلاً بوسنیا پر سربوں کے ہاتھوں جو قیامت ٹوٹی اور بوسنیا کے مسلمانوں کو اپنے دفاع کے لیے اسلحے کی ضرورت پیش آئی تو اس کے متعلق برطانوی وزیر اعظم جان میجر نے اپنے ایک وزیر ڈگلس ہاگ کو خط میں لکھا:

"....ہم بوسنیا ہرزیگوینا کے مسلمانوں کو مسلح کرنے اور بھاری تربیت دینے کے کسی بھی پروگرام پر متفق نہیں ہو سکتے....ہم اس بات کی ہر ممکن کوشش کریں گے کہ بوسنیا کو کسی بھی اسلامی ملک یا اسلامی گروہ کی طرف سے اسلحہ فراہم کرنے کی کوشش کامیاب نہ ہو سکے۔" ①

اسی خط میں جان میجر نے اس بات کا اعتراف بھی کیا کہ یونان، روس اور بلغاریہ کی طرف سے سربیا کو اسلحے کی فراہمی جاری ہے اور جرمن، آسٹریلیا، سلوسینیا، حتیٰ کہ ویٹکن سٹی بھی کروشیائی فوجوں کے ساتھ تعاون کر رہے ہیں۔

غرض جہاں جہاں اور جس جس خطے میں مسلمانوں پر کفار کا ظلم جاری ہے وہاں وہاں

---

① مریم خنساء: "اسلام، مغرب اور پاکستان"؛ دار الکتب السلفیہ، لاہور، ستمبر 2008؛ ص:103 (بحوالہ ہفت روزہ ایشیا، 31 جولائی 1993)

نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کیلئے اپنے دفاع کی خاطر اسلحہ کا حصول ناممکن بنایا جاتا ہے بلکہ ظالم استحصالی قوتوں کو مزید تباہ کن اسلحے کی فراہمی بھی کی جاتی ہے۔ مغرب کے اسی طرزِ عمل کے متعلق بوسنیا کے واقعات کی روشنی میں خرم مراد لکھتے ہیں:

> ''ہوش کی آنکھوں سے دیکھا جائے تو امریکہ، برطانیہ، فرانس اور یورپ نے بالکل یہی عمل پورے بوسنیا کے ساتھ کیا (کہ) پہلے اس کے ہاتھ پیچھے باندھے، پھر اپنے دفاع کے لیے ہتھیاروں سے محروم کیا، پھر اسے دشمن کے آگے گھٹنوں کے بل رینگنے پر مجبور کیا، پھر دشمن کو شہ دی اور اس کی پشت پناہی کی کہ وہ اس کا ایک ایک عضو کاٹے اور اس کے سارے جسم کو آگ اور لوہا برساتی گولیوں سے چھلنی کر دے''۔ (1)

5۔ سیاسی اہداف:

موجودہ استعمار کے عالمِ اسلام کے خلاف سیاسی اہداف بنیادی طور پر دو جہتوں پر مشتمل ہیں۔ ایک تو یہ کہ کسی بھی اسلامی خطے میں کوئی ایسا شخص یا گروہ برسرِ اقتدار نہ آنے پائے جس کے اندر دینی غیرت وحمیت کے جذبات پائے جائیں کیونکہ ایسے حکمران مغرب کے استعماری اقدامات کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ سعودی عرب کے شاہ فیصل شہید بھی ایک ایسے ہی راہنما تھے جنہوں نے مغرب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان کے عزائم کے آگے رکاوٹیں کھڑی کرنے کی کوشش کی تھی۔ عالمی طاقتوں کی تمام تر ترقی، ان کے کاروبار اور روز مرہ زندگیوں کی چہل پہل تیل اور گیس کی مرہونِ منت ہے اور توانائی کے ان وسائل کی فراہمی مسلمان خطوں سے ہو رہی ہے لہٰذا عالمی طاقتوں کی کوشش ہوتی ہے کہ یہ خطے ایسے چند ظالم، آمر، تعیش پسند اور مفاد پرست حکمرانوں کے قبضے میں رہیں جن کو صرف اقتدار سے محبت ہو اور ہر وقت اپنی حکومتوں کے گرنے کا خوف ہو۔

---

(1) خرم مراد: ''مغرب اور عالم اسلام''، ص156:

مغرب کا دوسرا سیاسی ہدف یہ ہے کہ مسلمان قرآن وسنت کو ریاستی وسیاسی معاملات میں اپنا راہنما تسلیم کرنے کی بجائے مغربی سیاسی افکار اور نظریات سے راہنمائی حاصل کریں۔ لیکن یہاں بھی امریکہ کا دوغلا پن اور منافقت واضح ہو جاتی ہے کیونکہ امریکہ یوں تو دنیا بھر میں جمہوری اقدار کو وسعت دینے اور اسے مضبوط کرنے کا دعویدار ہے لیکن اگر کسی ملک میں جمہوریت کی وجہ سے ایسے قائدین سامنے آئیں جو اسلام پسند ہوں اور امریکہ کے عزائم کے سامنے گھٹنے نہ ٹیکیں تو ایسی ''جمہوریت'' کی اینٹ سے اینٹ بھی بجادی جائے تو امریکہ کی ''جمہوریت پسندی'' خاموشی کا لبادہ اوڑھ لیتی ہے۔ مصر کے صدر مرسی کی مثال ساری دنیا کے سامنے ہے۔

قائد اعظم یونیورسٹی اسلام آباد میں شعبۂ ڈیفنس اینڈ سٹریٹجک اسٹڈیز کے سربراہ ڈاکٹر سید رفعت حسین کہتے ہیں:

> ''امریکہ ایک ایسی جمہوریت چاہتا ہے جو امریکہ کے لیے قابل قبول حکمران پیدا کرے۔ امریکہ اپنے مفادات اور سیاسی ضروریات کے تحت انتہائی ڈھٹائی کے ساتھ کبھی آمریت اور کبھی جمہوریت کی سرپرستی کرتا رہا''۔ [1]

لہٰذا اسلامی خطوں کے بے دین اور سیکولر مزاج حکمرانوں کو ہمیشہ امریکہ کی پشت پناہی حاصل رہی اور ان معاملات میں مغرب کا دوغلا پن ہمیشہ واضح ہوا۔ انسٹی ٹیوب آف اسٹریٹجک اسٹڈیز اسلام آباد کے ڈائریکٹر جنرل جناب تنویر احمد خان اپنے ایک انٹرویو میں کہتے ہیں۔

> ''مغرب ہمیشہ اس خوف میں مبتلا رہا ہے کہ کہیں سعودی عرب، پاکستان یا کوئی بھی اور ریاست مغرب کے کنٹرول سے نکل نہ جائے اور اپنے فیصلے خود مختاری

---

[1] سید رفعت حسین؛ مضمون: ''عراق میں موجودہ پیش رفت اور مستقبل کے امکانات''؛ مجلہ: ''مغرب اور اسلام''، رسالہ: 35، 2011؛ ص: 39

سے نہ کرنے لگے۔“(۱)

مغرب کا دوسرا بڑا خوف یہ ہے کہ کہیں مسلمانان عالم میں ”اسلامی نظام“ کی برکات کا شعور پیدا نہ ہو جائے۔ ان کے اس خوف کی وجہ مشہور مغربی دانشور لارنس براؤن یوں بیان کرتا ہے:

”ہمارے لیے سب سے بڑا خطرہ اسلامی نظام سے ہے کیونکہ اس میں پھلنے پھولنے کی مکمل صلاحیت موجود ہے اور مغربی استعمار کے سامنے سب سے بڑی رکاوٹ یہی ہے۔“(۲)

سو اسلامی دنیا کے سیاسی معاملات، اتار چڑھاؤ، رویوں اور رجحانات پر مغرب گہری نظر رکھتا ہے تاکہ کبھی بھی کسی بھی وقت کسی مسلمان خطے میں کوئی اسلام پسند راہنما ابھر رہا ہو یا اسلامی نظام کا ”خطرہ“ پنپ رہا ہو تو بروقت اقدامات کر کے اس پر قابو پایا جا سکے۔

حاصل کلام:

حاصل کلام یہ کہ عصرِ حاضر میں بین الاقوامی اور عالمی صورتحال یہ ہے کہ امریکہ ہی بنیادی طور پر بین الاقوامی ترجیحات طے کرتا ہے اور مغربی دنیا بالعموم امریکی نقطۂ نظر اور پالیسیوں کی ہی پیروی کرتی ہے۔ بہت سے ممالک اپنے مالی، انسانی، عسکری، سفارتی اور سیاسی وسائل امریکی عزائم اور مفادات کے حصول کے لیے صرف کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ خود مسلمان ممالک کی حکومتیں امریکہ کے ایماء پر اپنے ہی مسلمان بہن بھائیوں کے خون سے ہاتھ رنگ لیتی ہیں۔ امریکہ اس وقت دنیا کی واحد سپر پاور ہونے کے زعم میں ”اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰی“(۳) (میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں) کی تصویر بنا ہوا ہے۔ دنیا کی

---

(۱) تنویر احمد، خان: ”ایران کے معاملات پر ایک نظر“، مجلہ: ”مغرب اور اسلام“، رسالہ: 35، 2011ء، ص: 51

(۲) مریم خنساء: ”اسلام، مغرب اور پاکستان“، ص: 95 (بحوالہ: شبہات التغریب، صفحہ: 30)

(۳) النازعات 79: 24

بہترین ٹیکنالوجی، اسلحہ اور میڈیا کی طاقت امریکہ کے ہاتھ میں ہے اور تمام مغربی دنیا اسلام اور مسلمانوں کے خلاف امریکہ کی 'اتحادی' بن چکی ہے۔ اس طاقت اور زور کے بل بوتے پر امریکہ چاہتا ہے کہ مسلمان ممالک بھی اپنی تہذیب و اقدار، نظام حکمرانی، تعلیمی نظام، اسلامی تمدن اور قدرتی وسائل پر امریکی عملداری کو خاموشی کے ساتھ برضا و رغبت تسلیم کر لیں۔ اپنے انفرادی اور اجتماعی معاملات میں شریعت کے ضابطوں کی بجائے ان بین الاقوامی قوانین و ضوابط کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں جو صرف مغربی سیکولر طاقتوں اور خصوصاً امریکہ کے مفادات کے تحفظ کے لیے تشکیل دیئے گئے ہیں۔

وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان اپنی دینی حیثیت اور اسلامی تشخص سے ناطہ توڑ کر خود کو مغرب کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں۔

مشہور امریکی تھنک ٹینک Rand Corporation کی ایک رپورٹ کے الفاظ ہیں:

"Clearly, the United States, the modern industrialized world, and indeed the international community as a whole would prefer an Islamic world that is compatible with the rest of the system: democratic, economically viable , politically stable , socially progressive, and follows the rules and norms of international conduct." ①

(ظاہری بات ہے کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ، جدید صنعتی دنیا اور تمام بین الاقوامی برادری ایک ایسی اسلامی دنیا کو ترجیح دیں گے جو دنیا کے نظام کے ساتھ مطابقت رکھتی ہو۔

①Cheryl Benard; "Civil Democratic Islam : Partners, Resources, and Strategies"; RAND Corporation,2003: pg: ix (summary) URL: http: // www.rand.org

جہاں جمہوریت ہو، معاشی اور سیاسی استحکام ہو، سماجی ترقی ہو، اور جہاں بین الاقوامی طور پر مسلمہ قوانین اور معیار کی پابندی کی جاتی ہو۔)

گویا بین الاقوامی اور عالمی طور پر مسلمہ قوانین کے مطابق اگر سیاسی و معاشی استحکام کے لیے سیکولر جمہوریت اور سود ناگزیر ہو، اگر حجاب، شرم وحیا اور خاندانی نظام کو سماجی ترقی کی راہ میں رکاوٹ سمجھا جائے، اگر آزادیٔ اظہار رائے کے نام پر انبیاء کی توہین کی جسارت کو قانونی تحفظ حاصل ہو، اگر مسلمانوں کی جان، مال، عزت، آبرو، آزادی اور وسائل پر امریکی دست درازی کی صورت میں عالمی برادری چپ سادھ لے تو ایسی صورتوں میں مسلمان اپنی دینی غیرت، حمیت اور حریت کا سودا کر ڈالیں، اپنی آنکھیں بند کر لیں اور خاموشی کے ساتھ پامال ہوتے رہیں۔ کیونکہ اسی صورت میں مسلمان عالمی سطح پر "compatibility" کی شرائط پر پورا اتر سکیں گے اور بین الاقوامی برادری انہیں ''قبولیت'' کی سند عطا کرے گی۔

لیکن امریکہ اور مغرب پر یہ واضح ہو چکا ہے کہ ''عالم اسلام'' آسان شکار نہیں ہے اور یہ کہ امریکہ اور مغرب کے استعماری اہداف کی تکمیل کے راستے میں انہیں قدم قدم پر باغیرت اور غیور مسلمانوں کی طرف سے شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا، لہٰذا اپنے اہداف کے حصول کے لیے مغرب کی استعماری طاقتوں نے کئی خطرناک حربوں کا جال بُن رکھا ہے۔

باب سوم:

عالمِ اسلام کے خلاف نو استعماری حربے

فصل اول:

عصرِ حاضر میں مغرب اور عالمِ اسلام کا تقابلی جائزہ

عالمِ اسلام مختلف وجوہات کی بنا پر دورِ حاضر کی نو استعماری طاقتوں کا ہدف ہے اور اس بار مغربی استعمار کی یلغار بھی ہمہ جہت ہے۔ امت مسلمہ کو آج ایک سنگین چیلنج کا سامنا ہے۔ وہ نظریاتی، تہذیبی، معاشی اور عسکری سطحوں پر مغرب کے استعماری حملوں کی زد پر ہے۔ باوجود اس کے کہ عالم اسلام کو یورپی استعمار کی براہِ راست غلامی سے نجات ملے نصف صدی سے زائد عرصہ بیت چکا ہے مسلمان ابھی تک انحطاط اور تنزل کا شکار ہیں اور اس قعرِ مذلت سے نکلنے کے لیے کوئی مؤثر لائحہ عمل تک ترتیب نہیں دے سکے۔ جہاں مغرب سیاسی، معاشی، ثقافتی اور سائنسی میدانوں میں ساری دنیا پر اپنی اجارہ درای قائم کر چکا ہے وہیں مسلمانوں کی صورتِ حال یہ ہے کہ تعداد میں تقریباً ڈیڑھ ارب ہونے کے باوجود ان کی کیفیت اس وقت بالکل وہی ہے جس کا نقشہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ایک حدیث میں کھینچا تھا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ ایک زمانہ آئے گا کہ نہایت کثیر تعداد میں ہونے کے باوجود تمہاری حیثیت سیلاب کے ریلے کے اوپر کے جھاگ سے زیادہ نہیں رہے گی۔[1]

ڈاکٹر اسرار احمد مسلمانوں کی موجودہ صورتحال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم سورۂ بقرہ کی آیت 41 کے الفاظ "ضُرِبت علیھمُ الذّلة والمسکنة" (ان پر ذلت

---

[1] ابوداؤد: "سنن ابوداؤد"، کتاب الملاحم، باب فی تداعی الامم علی الاسلام

اور مسکنت تھوپ دی گئی) کو پڑھتے ہوئے اطمینان سے گزر جاتے ہیں کہ یہ الفاظ یہودیوں کے بارے میں کہے گئے ہیں لیکن اگر موجودہ حالات کا معروضی مطالعہ کیا جائے تو اس وقت ان الفاظِ قرآنی کے مصداقِ کامل یہود نہیں بلکہ مسلمان ہیں۔ (1)

اس وقت ساری دنیا میں مسلمان شدید ترین مصائب و آلام سے دو چار ہیں۔ کہیں کشمیر اور فلسطین میں کفار کے ہاتھوں جان، مال، عزت، آبرو لٹوا رہے ہیں تو کہیں جلا وطن ہو کر سمندروں کی وسعتوں میں اپنے لیے ٹھکانے تلاش کرتے حیران و سرگرداں پھر رہے ہیں۔ جن مسلم علاقوں میں دولت کی ریل پیل اور خوشحالی موجود ہے وہاں بھی مسلم امہ کی بہتری اور فلاح پر خرچ کرنے کی بجائے ذاتی عیش و عشرت یا مغربی مفادات ہی ترجیحی امور ہیں۔ دنیا میں کہیں بھی مسلمانوں پر ظلم کے پہاڑ توڑے جائیں، عزتیں نیلام کی جائیں یا مساجد شہید کی جائیں کسی مسلمان حکومت کی یہ جرأت نہیں کہ ان اقدامات کو روکنے کے لیے کوئی قدم اٹھائے۔ بین الاقوامی سطح پر مسلمانوں کے کسی احتجاج یا رائے کی کوئی حیثیت نہیں۔ تعلیمی اور علمی پسماندگی دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ حکمران ہیں تو مغربی طاقتوں کی شطرنج کے پیادوں کا کام کر رہے ہیں، دانشور ہیں تو مغرب کی عظمت و تقدیس کے گن گا رہے ہیں، علماء ہیں تو لایعنی و معمولی فقہی بحثوں میں الجھے ہوئے یا ذاتی ناموری کے شوقین۔ مولانا مودودی رحمہ اللہ اپنے مضمون ''ہماری ذہنی غلامی اور اس کے اسباب'' میں مغلوبیت اور محکومیت کی دو قسمیں بیان کرتے ہیں۔ ایک ذہنی مغلوبیت اور دوسری سیاسی مغلوبیت، اور پھر کہتے ہیں:

''مسلمان آج کل اس دوہری غلامی میں مبتلا ہیں.... بدقسمتی سے اس وقت کوئی اسلامی آبادی ایسی نہیں ہے جو صحیح معنوں میں سیاسی اور ذہنی اعتبار سے پوری

---

(1) ڈاکٹر اسرار احمد؛ ''سابقہ اور موجودہ مسلمان۔۔۔۔۔''؛ ص:7

طرح آزاد ہو"۔ (۱)

۱۹۳۴ء میں مولانا مودودی رحمہ اللہ کا کیا گیا یہ تبصرہ آج تک مسلمانوں پر صادق آتا ہے۔اس کے برعکس مغرب کی صورتحال یہ ہے کہ یہ طاقتیں خصوصاً ان کا سرغنہ "ریاست ہائے متحدہ امریکہ" ہر قسم کی سیاسی، عسکری، فنی، معاشی اور ابلاغی قوتوں سے لیس ہیں۔کسی ملک کی یہ جرأت نہیں کہ ان کی مرضی اور مفادات کے خلاف جنبش کر سکے۔ان کی فوج دنیا کے مختلف "آزاد مسلم ممالک" میں دھڑلے سے ڈیرے جمائے ہوئے ہے۔حد یہ ہے کہ جزیرۃ العرب بھی ان کی موجودگی سے خالی نہیں۔زمین کے ہر کونے پر ان کا فوجی اڈہ موجود ہے۔عالمی اقتصادی معاملات پر ان کا کنٹرول اس حد تک ہے کہ جب چاہیں اور جہاں چاہیں مالی بحران پیدا کر کے دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت کو جھکنے پر مجبور کر دیں۔تمام ذرائع ابلاغ پر بھی یہ اس حد تک قابض ہیں کہ ابلاغی قوتوں کے ذریعے سیاہ کو سفید اور رات کو دن ثابت کر سکتے ہیں۔ناپسندیدہ حکومتوں کا تختہ الٹنا یا اپنے عزائم کے راستے میں دیوار بننے والے افراد کو راستے سے ہٹا دینا ان کے لئے کچھ مشکل نہیں۔حربی اور عسکری اعتبار سے امریکہ کی طاقت کا مقابلہ دنیا کے کسی اور ملک کے بس کی بات نہیں۔عدل وانصاف اور بین الاقوامی قوانین کے مسلمہ اصولوں کا لحاظ تو دور کی بات ہے امریکہ کو اپنے بہترین اتحادیوں اور خود اپنے عوام کی رائے کا بھی کوئی احترام ولحاظ نہیں۔ڈاکٹر اسرار احمد اپنے کتابچے "موجودہ عالمی حالات کے پسِ منظر میں اسلام کا مستقبل" میں امریکہ کو ایک ایسے مست ہاتھی سے تشبیہ دیتے ہیں جس کا مقابلہ کرنے کی حیثیت کسی میں نہیں ہے۔ (۲)

غرض یہ کہ عالمی اکھاڑے میں موجود ان دو حریفوں عالم اسلام اور مغرب کا کسی بھی

---

(۱) مودودیؒ: "تنقیحات"؛ ص: 8

(۲) ڈاکٹر اسرار احمد: "موجودہ عالمی حالات کے پس منظر میں اسلام کا مستقبل"؛ مکتبہ خدام القرآن، لاہور، اگست 2004؛ ص: 8

پہلو سے تقابلی جائزہ لیا جائے، مغرب کا پلڑہ ہی بھاری نظر آتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ جہاں مغرب کے حکمران، دانشور اور ذرائع ابلاغ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اپنی نفرت، تعصب اور استعماری عزائم کا خود وقتاً فوقتاً اظہار کرتے رہتے ہیں وہیں امت مسلمہ کے مقتدر اور بااثر طبقات بھی نہ صرف خود امریکہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کسی بھی حد تک جانے کو تیار رہتے ہیں بلکہ اپنی عوام کے سامنے امریکہ کو ہمارا خیر خواہ اور مشکل کشا ثابت کرنے کے لیے بھی ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان حالات کے باوجود آخر مغرب اور امریکہ اسلام اور مسلمانوں سے خائف کیوں ہیں؟ دورِ حاضر کی سب سے بڑی استعماری طاقت ریاست ہائے متحدہ امریکہ اس وقت دنیا کی واحد سپر پاور کی حیثیت رکھتی ہے۔ تمام مغربی ممالک اپنے اپنے وسائل سمیت امریکی کی پشت پر ہیں۔ مسلمان ممالک کی حکومتیں اور بااثر طبقات سب امریکہ کی وفاداری کا دم بھرتے ہیں۔ مغربی نظریات کی بالادستی کو اس وقت مسلم آبادی کے ایک بڑے حصے سمیت دنیا بھر کے معاشرے برضا و رغبت سند قبولیت بخش چکے ہیں لیکن اس کے باوجود مسلمان معاشرے امریکہ اور مغرب کے زیر عتاب کیوں ہیں؟

بات یہ ہے کہ ملت روم نے مختلف ادوار میں دنیا کی مختلف اقوام پر اپنا استعماری قبضہ جمایا ہے لیکن جیسی مزاحمت کا سامنا انہیں مسلمانوں کی طرف سے کرنا پڑا ویسا تجربہ ان استعماری طاقتوں کو کسی اور قوم کی جانب سے نہیں ہوا۔ مغرب کی طویل غلامی نے مسلم اقوام کو بہت حد تک ذہنی مرعوبیت کا شکار تو ضرور کیا اور مسلم معاشروں کے اہم طبقات نے مکمل طور پر استعمار کی فکری اور تہذیبی بالادستی کو نہ صرف قبول کیا بلکہ اس کے فروغ کے لیے استعمار کے دست و بازو بھی بنے لیکن ان سب باتوں کے باوجود مجموعی طور پر اسلامی معاشروں نے خود کو اپنے دینی شعائر اور اپنی تہذیب سے ناطہ توڑ کر مغرب کی تہذیبی یلغار کے ریلے میں بہنے سے روکے رکھا۔ وقتاً فوقتاً اسلامی دنیا میں ایسے افراد اور ایسی تحریکیں اٹھتی

رہیں جنہوں نے نہ صرف یہ کہ مغرب کی بالادستی کو قبول کرنے سے انکار کیا بلکہ اس بات پر مصر رہے کہ ان کا دین اور ان کی تہذیب مغرب کے "man made" نظریات اور فلسفوں سے ہر طور پر برتر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عالم اسلام کی تمام تر کمزوریوں کے باوجود استعماری طاقتوں نے ابتدا ہی سے اسلام کو اپنا طاقتور حریف جانا۔

آکسفورڈ ہسٹری آف اسلام کے مطابق:

"Islam received particularly harsh criticism from colonial rulers. Muslims resisted colonialism in Africa and South-east Asia. For this they were seen as prone to violence and less likely to be controlled, changed, or converted. Islam was therefore viewed as a challange to both colonial control and efforts to transform the local population's life and thought."[1]

(استعماری حکمرانوں نے اسلام کو خصوصی طور پر تنقید کا نشانہ بنایا۔ افریقہ اور جنوب مشرقی ایشیا کے مسلمانوں نے استعماری قبضوں کے خلاف شدید مزاحمت کی تھی۔ اسی لیے انہیں تشدد پسند کے طور پر دیکھا گیا اور یہ سمجھ لیا گیا کہ مسلمانوں پر تسلط جمانا یا انہیں ان کے عقائد سے پھیر دینا تقریباً ناممکن ہے۔ اسی لیے مسلمانوں پر استعماری تسلط قائم کرنا اور مقامی آبادی کے رہن سہن اور افکار کو بدل دینا ایک چیلنج سمجھا گیا۔)

پھر جب یورپی استعمار کا دور ختم ہوتا ہے اور نئے دور میں سامراجیت ایک نئی شکل (neo-colonialism) میں سامنے آتی ہے، دنیا بھر کی تہذیبیں مغربی تہذیب کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتی ہیں، اور مغرب کے سر پر منڈلاتی کمیونزم کی سرخ آندھی کا طوفان بھی تھم جاتا ہے تو میدان میں یہی دو روایتی حریف رہ جاتے ہیں۔ مغرب اور اسلام۔ خرم مراد

[1] "The Oxford History of Islam";pg:54

اپنی تصنیف ''مغرب اور عالمِ اسلام'' میں ہفت روزہ اکانومسٹ، لندن سے ایک اقتباس نقل کرتے ہیں:

''دنیا کی قیادت کے لیے مغربی تہذیب کا حریف ایک ہی ہوسکتا ہے: وہ ہے اسلام۔ اس سے مغرب کا تصادم ہوسکتا ہے۔ اس لیے کہ اسلام ایک آئیڈیا ہے، آج کی دنیا میں اپنی نوعیت کا واحد آئیڈیا... اسی لیے اہلِ یورپ اسلام اور مسلمانوں سے خائف ہیں۔ انہیں خطرہ ہے کہ ایک نئی سرد جنگ آرہی ہے جو غالباً 'سرد' نہ رہے گی۔''①

اس سلسلے میں ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم اپنا ایک نظریہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ امریکی بالادستی ایک اجتماعی نظام ہے جس کی تین سطحیں ہیں۔ ایک ''سیاسی سطح'' ہے، جو سیکولرازم پر مبنی ہے یعنی ریاست، حکومت اور قانون سازی میں مذہب کا کوئی کردار نہیں ہوگا اور آج یہ نظام ساری دنیا پر چھایا ہوا ہے۔ دوسری سطح ''مالیاتی سطح'' ہے۔ یہ سودی نظام پر مشتمل ہے اور یہ نظام بھی مسلم ممالک سمیت ساری دنیا کو مکمل طور پر اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے۔ تیسری سطح سماجی یا معاشرتی ہے۔ مغربی سماجی نظام مسلمان معاشروں میں جزوی طور پر تو رواج پا چکا ہے لیکن مغرب کی بے انتہا کوششوں کے باوجود مسلمانوں کا معاشرتی اور سماجی ڈھانچہ ابھی تک اسلام کی بنیادی تعلیمات پر کھڑا ہے۔ گویا مغربی اور امریکی بالادستی کی راہ سے تمام رکاوٹیں ابھی دور نہیں ہوئیں۔②

اس کی ایک وجہ لازمی طور پر یہی ہے کہ مسلمانوں میں ابھی بھی ایسے طبقات یا افراد موجود ہیں جو مغرب کے تہذیبی سیلاب کے سامنے نظریہ کا بند باندھنے میں فعال کردار ادا کر رہے ہیں۔ گویا دو قوتیں یا دو عناصر ہیں جو مسلمان معاشروں پر اثر انداز ہونے اور انہیں

---

① خرم مراد: ''مغرب اور عالم اسلام: ایک مطالعہ''، ص:19

② ڈاکٹر اسرار احمد: ''موجودہ عالمی حالات کے پس منظر میں اسلام کا مستقبل''، ص:9 تا 16

اپنی طرف کھینچنے میں کوشاں ہیں۔ایک مغرب کی معاشرتی وسماجی نظام کی کشش اور دوسری طرف وہ داعیانِ دین جو مسلمانوں کے تمام سیاسی، معاشی، اور معاشرتی مسائل کا حل ''شریعت'' میں تلاش کرنے پر مصر ہیں۔یہی وہ طبقہ ہے جس کو مغرب اور امریکہ اپنے استعماری عزائم کی راہ کی رکاوٹ سمجھتا ہے۔

مشہور امریکی تھنک ٹینک ''Rand Corporation'' نے اسلامی معاشروں کے مختلف طبقات اور رجحانات کا جائزہ لے کر یہاں کے جس طبقے کے متعلق ''تحفظات'' کا اظہار کیا ہے اسے ''Islamists'' کا نام دیا ہے[1] اور ''Islamists'' سے مراد کون لوگ ہیں اس کی وضاحت بھی اپنی سفارشات میں کر دی ہے:

"........A narrower, more useful definition identifies Islamists as those who reject the seperation of religious authority from the power of the state. Islamists seek to establish.......Sharia as the basis of law."[2]

('اسلام پسندوں' کی ایک بالکل مختصر اور جامع تعریف یوں کی جاسکتی ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو ریاستی معاملات میں مذہبی بالادستی کے عقیدے سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں۔'اسلام پسندوں' کا مقصد یہ ہے کہ شریعت کو قوانین کی بنیاد قرار دیا جائے۔)

اس ''بنیاد پرست'' طبقے کے مقابلے میں ''سیکولر'' اور ''آزاد خیال'' مسلمانوں کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کو ریاستہائے متحدہ امریکہ کے ''natural allies'' (قدرتی

---

[1] Angel Rabasa, Cheryl Benard, Schwartz, Lowel H,S Chwartz, Peter Sickle; "Building moderate Muslim Networks" ;RAND Corporation, 2007, pg:75 (RAND URL http://www.rand.org/)

[2] // // // //

حلیفوں) کا عنوان دیا گیا ہے۔① رینڈ کارپوریشن کی رپورٹ میں بار بار اس بات کو دہرایا گیا ہے کہ اسلام کے ''خطرے'' سے نپٹنے کیلئے امریکہ کو روس کے خلاف لڑی جانے والی سرد جنگ کے تجربات سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔② رپورٹ کی یہ تجویز اس لحاظ سے معنی خیز ہے کہ امریکہ کی کمیونزم کے خلاف جنگ مذہبی بنیاد پر نہیں بلکہ نظام کی بنیاد پر تھی۔ ''کمیونزم'' درحقیقت ایک سیاسی و معاشی نظام تھا جو امریکہ اور مغرب کے سیاسی و معاشی نظام کے مقابلے میں کھڑا کیا گیا تھا اسی لیے امریکہ نے اپنے تمام وسائل اس کے خاتمے کے لیے استعمال کئے تھے۔ آج اگر اسلام بھی محض چند ''مذہبی رسومات'' کا مجموعہ بن جائے تو امریکہ کو اس سے کوئی خطرہ نہیں لیکن اسلام اگر اپنا نظام ہی قائم کرنے پر ''بضد'' رہے تو امریکہ کے استعماری عزائم پر زد پڑتی ہے۔ ساری دنیا کے وسائل پر بلا شرکتِ غیرے تصرف اور تمام خلق خدا کو اپنے ''نیو ورلڈ آرڈر'' کی زنجیروں میں جکڑنے کا امریکی خواب چکنا چور ہو جاتا ہے اگر دنیا میں ''الحکم للہ الملک للہ'' کا فلسفہ ایک حقیقی نظام بن کر قائم ہو جاتا ہے۔

لہٰذا یہی وہ خطرہ ہے جس کے سدباب کے لیے آج امریکہ اور اس کے حواری ان تھک محنت کر رہے ہیں۔ اور مغرب اور عالمِ اسلام کی روایتی اور تاریخی کشاکش دورِ جدید میں پہلے سے بھی زیادہ سنگین چیلنج کے طور پر ابھر آئی ہے۔

---

① Chery Benard; "Civil, Democratic Islam: Partners, Resources and Strategies"; Rand Corporation, 2003;pg:25; (URL;http;//www.rond.org/)

② Angel Rabasa, ...; "Building Moderate Muslim Networks";pg:139

فصل دوم:

عالمِ اسلام کے خلاف نو استعماری طاقتوں کے حربے

آج مغرب میں اس موضوع پر باقاعدہ تحقیقات کر کے رپورٹیں مرتب کی جاتی ہیں کہ کن کن طریقوں اور حربوں کے ذریعے اسلامی معاشروں کو اپنے زیرِ تسلط لانا ممکن ہو سکتا ہے۔ اس مقصد کے لیے بڑے بڑے تھنک ٹینکس (Think Tanks) تشکیل دیئے گئے ہیں۔ ان کے کام کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ ان Think Tanks کے بجٹ تیسری دنیا کے ممالک کے مجموعی بجٹ سے بھی کہیں بڑھ کر ہوتے ہیں۔ ان ہی میں سے ایک نام Rand Corporation کا ہے۔ اس تھنک ٹینک نے اسلام اور مسلمانوں پر نہایت عرق ریزی اور باریکی کے ساتھ تحقیقات کر کے اپنی رپورٹیں اور سفارشات مرتب کی ہیں۔ ان کی دو رپورٹیں خصوصاً بہت اہمیت کی حامل ہیں جن میں سے ایک "Civil Democratic Islam, Partners, Resources and Strategies" کے نام سے 2003 میں شائع ہوئی جبکہ دوسری رپورٹ کو Building Moderate Muslim Networks کا عنوان دیا جاتا ہے اور یہ 2007 میں شائع ہوئی۔ ان دونوں رپورٹوں میں امریکہ کی حکومت کو یہ مشورے دیئے گئے ہیں کہ اسلامی دنیا پر اپنا اثر و رسوخ قائم کرنے اور اپنے اہداف کی تکمیل کے لیے کیا لائحہ عمل اپنایا جائے۔ ایک رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ اسلامی دنیا میں اپنے مقاصد کے حصول کے لیے "Overt" (کھلے) اور "Covert" (چھپے) دونوں طرح کے اقدامات کرنا ضروری ہیں۔ [1]

لہٰذا مسلمان اسی وقت اپنے خلاف ہونے والی استعماری سازشوں اور حربوں کو سمجھ

[1] Angel Rabasa,......;"Building Moderate Muslims Network";pg:11

سکتے ہیں جب وہ اپنی آنکھیں کھلی رکھیں۔ اسلام کے خلاف باطل جو چالیں چلتا ہے وہ کس شدت کی ہوتی ہیں اس کے بارے میں خود قرآن ہمیں خبردار کرتا ہے:

وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ ①

"اگرچہ انکی چالوں سے پہاڑ بھی ٹل جائیں۔"

آج اِن کی کوشش یہ ہے کہ دینِ اسلام کی شکل کو ہی (نعوذ باللہ) مسخ کر کے اسے ایسے قالب میں ڈھال دیا جائے جو مغرب کے ساتھ "Compatible" ہو۔ اسلام کے خلاف اپنی ان ناپاک جسارتوں کو وہ خود "religion-building" اور "to transform a major world religion" کا نام دیتے ہیں۔ ②

دور حاضر میں استعمار عالم اسلام کے خلاف جو حربے استعمال کر رہا ہے وہ اس کے گزشتہ دور کی چالوں اور حربوں کی نسبت کہیں زیادہ خطرناک اور موثر ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مغرب نے اپنے صدیوں کے استعماری "تجربے" اور کمیونزم کے خلاف لڑی جانے والی سرد جنگ سے حاصل ہونے والے اسباق کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی چالیں ترتیب دی ہیں۔ یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہنی ضروری ہے کہ عالم اسلام کے خلاف ان استعماری طاقتوں نے اپنے پہلے استعماری دور میں ہی دوراندیشی سے کام لیتے ہوئے کئی ایسے مضبوط جال بچھا دیئے تھے جو آج کے نو استعماری دور میں بھی ان طاقتوں کے مقاصد کو پورا کرنے میں مددگار ثابت ہو رہے ہیں۔

عصرِ حاضر میں عالم اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مغربی سامراجیت ریاستہائے متحدہ امریکہ کی زیر قیادت جن حربوں کو استعمال کر رہی ہے ان کا مختصر جائزہ درج ذیل ہے۔

---

① ابراہیم 46:14

② Cheryl Benard; "Civil Democratic Islam....";pg:3"

1۔ خلافت کا خاتمہ:

عالم اسلام کے خلاف مغربی استعماری تاریخ کی سب سے بڑی کامیابی ۱۹۲۴ء میں خلافت کے ادارے کا خاتمہ تھی۔ جس منصوبہ بندی اور عیاری کے ساتھ اس پورے عمل کو روپذیر کیا گیا اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ مغرب کو دنیا میں خلافت کے برائے نام اور بے اختیار ادارے کا وجود بھی گوارا نہیں تھا۔ اس سوال کے جواب میں ڈاکٹر اسرار احمد اپنی تصنیف ''خلافت کی حقیقت۔۔۔۔۔'' میں ایک واقعہ نقل کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن جب مالٹا میں اسیری کے دن کاٹ رہے تھے اس دوران ایک بار انہوں نے وہاں موجود انگریز کمانڈنٹ سے پوچھا کہ ہماری خلافت تو ایک مردہ خلافت ہے آپ لوگ اس کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں اور اس سے آپ کو کیا تکلیف ہے؟ اس پر انگریز کمانڈنٹ نے جواب دیا: ''مولانا آپ اتنے سادہ نہ بنیئے! آپ بھی جانتے ہیں اور ہم کو بھی معلوم ہے کہ یہ گئی گزری خلافت بھی اتنی طاقتور ہے کہ اگر کہیں دارالخلافہ سے جہاد کا اعلان ہو جائے تو مشرق سے مغرب تک لاکھوں مسلمان سر سے کفن باندھ کر میدان میں نکل آئیں گے''۔ [1]

استعمار کو بڑی اچھی طرح سے اس بات کا اندازہ تھا کہ خلافت صرف ایک ادارہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک 'علامت' ہے۔ یہ تمام دنیا کے مسلمانوں کے لیے ایک مذہبی جذباتی، نفسیاتی اور تاریخی مرکز ہے جو انہیں ایک وحدت اور ایک امت ہونے کا احساس دلاتی ہے اور اس 'علامت'' کو توڑنا درحقیقت اسلامی وحدت کے احساس کو توڑنے کے مترادف ہے۔

حافظ عاطف وحید بیسویں صدی کے آغاز کے عالمی حالات پر بحث کرتے ہوئے

---

[1] ڈاکٹر اسرار احمد: ''خلافت کی حقیقت اور عصرِ حاضر میں اس کا نظام''؛ مکتبہ خدام القرآن لاہور، اکتوبر 1996ء، ص:65

لکھتے ہیں:

"....استعماریت کے لیے بلادِ عرب اور مڈل ایسٹ کو تقسیم در تقسیم کے مرحلے سے گزارنا لازمی تھا لیکن اس کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ خلافت عثمانی تھی جو باوجود تہہ در تہہ کمزوریوں کے مسلمانوں کے اتحاد اور یگانگت کی علامت تھی۔"(۱)

نیز جیسا کہ محمود الحسن کے سامنے انگریز کمانڈنٹ نے "خدشے" کا اظہار کیا تھا کہ خلیفہ کی طرف سے ایک "اعلان" ایک "پکار" وہ کام کر سکتی تھی جو مقامی مسلمان راہنماؤں اور علماء کی تقریریں، وعظ اور جذباتی اپیلیں نہیں کر سکتی تھیں۔ آج جب کہ دنیا بھر میں خلافت کے ادارے کا کوئی وجود نہیں، عصرِ حاضر کی نو استعماری طاقتوں کو خلافت کے re-establish ہونے کا خوف لاحق ہے۔ عابداللہ جان کے مطابق "war on terror" کے پردے میں امریکہ کا اصل مقصد ہی یہی ہے کہ اسلامی خلافت کے قیام کے کسی معمولی امکان کو بھی پیدا ہونے سے پہلے کچل دیا جائے۔(۲)

اسلامی خلافت کی تیرہ سو سالہ تاریخ پر نظر دوڑائی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ مغرب کا خوف بے جا اور بے بنیاد نہیں ہے۔ حقیقتاً خلافت کے قیام کا مطلب ہے "مسلمانوں کا باہمی اتحاد، مغربی استعمار کا مقابلہ اور نظامِ شریعہ کا نفاذ"۔ عثمانی خلافت کے آخری سالوں میں گو کہ خلیفہ کا اقتدار عالمِ اسلام پر سے عملاً ختم ہو چکا تھا اور مسلمان مختلف استعماری طاقتوں کے زیرِ قبضہ مختلف علاقائی، لسانی، نسلی اور گروہی تقسیمات کا شکار تھے بلکہ استعمار کے آنے سے پہلے بھی مختلف بادشاہوں، نوابوں یا امراء کی حکومتوں کے ماتحت تھے لیکن یہ حد بندیاں ابھی "قومیت" کی بنیاد پر نہیں بنی تھیں۔ اس کے علاوہ خلافت کے ادارے

---

(۱) حافظ عاطف وحید؛ مضمون: "امتِ مسلمہ پر استعمار اور صیہونیت کا مشترک حملہ"؛ سہ ماہی حکمتِ قرآن، لاہور، جولائی۔ستمبر 2014؛ ص:5

(۲) Abidullah Jan; "Afghanistan.........";pg:75

میں یا خود خلیفہ کی ذات میں بھی کبھی بدعنوانی پائی جاتی یا ظلم و جور، ذاتی مفاد یا دیگر برائیاں پیدا ہوتیں تب بھی کم از کم نظری طور پر کتاب و سنت کی مکمل بالا دستی تسلیم کی جاتی تھی۔ نیز اپنے برے سے برے ادوار میں بھی خلیفہ، امراء یا سلاطین میں اتنی غیرت و حمیت بہر حال برقرار رہتی تھی کہ وہ کفار کی جارحیت اور توسیع پسندی کے خلاف کچھ مزاحمت کر سکیں۔ لہٰذا خلافت کی یہ خصوصیات آج کی استعماری دنیا کو خلافت کے دوبارہ قیام کے تصور سے ہی ڈرائے رکھتی ہیں:

"....the United States and its allies shiver to the core when Muslims refer to the concept of the Ummah and establishing... khilafah."①

(ریاستہائے متحدہ امریکہ اور اس کے اتحادی اس وقت خوف سے کانپ اٹھتے ہیں جب مسلمان ''امت واحدہ'' یا ''نظامِ خلافت'' کا نام لیتے ہیں۔)

مغرب کی کوشش ہے کہ دنیا کے سامنے ''خلافت'' کو ایک ایسے نظام کے طور پر پیش کیا جائے جو ظلم، ناانصافی اور کمزوروں کے استحصال پر مبنی ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ خود کو ایسے نجات دہندہ کے طور پر پیش کرے جو دنیا کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً ان ''مٹھی بھر انتہاپسندوں'' سے بچانے کے لیے ہر حد تک جانے کو تیار ہے جو آزاد دنیا کو خلافت کی زنجیروں میں جکڑنا چاہتے ہیں۔

ڈونلڈ رمزفیلڈ اپنی ایک تقریر میں کہتا ہے:

".......a lethal minority intent on denying freedom to others and reastablishing a caliphate."②

(ایک اقلیتی طبقہ جو نہایت خطرناک بھی ہے وہ آزادی کا دشمن ہے اور خلافت کو

---

① Abidullah Jan; "Afghanistan......"; pg:79

② // // // ; pg:82

دوبارہ قائم کرنا چاہتا ہے۔)

خلافت اور نظامِ شریعت کے قیام کے کسی بھی امکان کو ختم کرنے اور اسے دنیا کے منظر نامے سے ہمیشہ کے لیے مٹا دینے کے مغربی عزم کا اظہار برطانیہ کے سابق ہوم سیکریٹری چارلس کلارک کے اس بیان سے ہوتا ہے جو اس نے 15 اکتوبر ۲۰۰۵ کو دیا۔

"....there can be no negotation about the recreation of the Caliphate; there can be no negotiation about the imposition of shariah law....." (1)

(خلافت کے دوبارہ قیام کے بارے میں کوئی مذاکرات ممکن نہیں۔ شرعی قوانین کے نفاذ سے متعلق کوئی مذاکرات ممکن نہیں۔)

لہٰذا مغرب کے نزدیک ۱۹۲۴ء میں عثمانی خلافت کے خاتمے کے بعد بھی یہ خطرہ ابھی ٹلا نہیں ہے کیونکہ مراکش سے انڈونیشیا تک پھیلی ہوئی اسلامی دنیا میں جہاں کہیں کوئی احیائی عمل بیدار ہوتا ہے وہاں نظامِ شریعت کے نفاذ اور خلافت کے برکات کے حق میں کچھ صدائیں بلند ضرور ہوتی ہیں۔ خلافت کا خیال ابھی مسلمانوں کے دل سے "محو" نہیں ہوا، لیکن چونکہ خلافت ایک ایسا ادارہ ہے جو محض مسلمانوں کی خواہش کے زور پر عمل میں نہیں آتا بلکہ ایمان، عمل صالح اور جہاد کی خاص شرائط کی تکمیل کے بعد قائم ہوتا ہے لہٰذا خلافت کے قیام کا امکان ختم کر دینے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ اس امت کے اندر سے ایمان، عقیدہ، عمل اور جہدِ مسلسل کے سب سوتے خشک کر دیے جائیں سو اسی مقصد کے حصول کے لیے باطل کی طاقتیں مصروفِ عمل ہیں۔ اسلامی خلافت کے قیام کا خیال مغرب کی استعماری طاقتوں کو جن وجوہات کی بناء پر لرزہ براندام رکھتا ہے ان پر تبصرہ کرتے ہوئے حامد کمال الدین لکھتے ہیں:

"....(امریکی ایجنڈے میں) سرفہرست اس بات کو یقینی بناتا ہے کہ 'خلافت' کا

---

(1) Abidullah Jan; "Afghanistan......"; pg:83

امکان اس امت کے اندر ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے کیونکہ 'خلافت' ایک 'ڈراؤنا خواب' ہے جو آج اگر قائم ہو جاتی ہے تو ان کو ڈر ہے کہ کمزور قوموں کے وسائل ہڑپ کرنے اور 'تیسری دنیا' کے اندر لوٹ مچانے کی آزادیاں تو رہ گئیں ایک طرف، یہ (خلافت) ان کو بحرِ اوقیانوس کے دوسرے پار چھوڑ کر آئے گی۔ وہ بھی اگر یہ ان کے ساتھ 'پورا پورا حساب' کرنے پر نہ آئی ورنہ 'خطرہ' اس سے بھی کہیں بڑا ہے!"[1]

2۔ فلسفۂ قومیت:

اسلامی دنیا آج پچاس سے زائد "nation states" پر مشتمل ہے۔ ڈیڑھ ارب کے قریب انسان جن کا رب ایک ہے، رسول ﷺ ایک ہے، کتاب اور قبلہ ایک ہے ان کا ان پچاس ریاستوں میں منقسم ہونا کوئی قدرتی یا طبعی امر نہیں بلکہ یہ ایک ''جغرافیائی انجینئرنگ'' ہے جو استعمار کے ہاتھوں سے وقوع پذیر ہوئی ہے۔ ''قومیت'' یا ''نیشن سٹیٹ'' ایک ایسا تصور ہے جو استعمار کے یہاں آنے سے پہلے مسلمانوں کے اندر سرے سے پایا ہی نہیں جاتا تھا:

"Ethnic nationalism and its association with a nation state-.. is new to the Muslim world and has its origins in the colonial era."[2]

(نسلی بنیاد پر قومیت کا تصور اور اس کے نتیجے میں قائم ہونے والا وطن یا ریاست.... یہ اسلامی دنیا میں ایک نیا تصور تھا جو استعماری دور میں وجود میں آیا تھا۔)

''قومیت'' یا ''قومی ریاست'' کے فلسفے نے یورپ میں اس وقت جنم لیا جب

---

[1] حامد کمال الدین: ''رویہ زوال امریکن ایمپائر۔۔۔'' ص: 79

[2] "The Oxford History of Islam"; pg:54

معاشرے میں "کلیسا" کے کردار کو ختم کر دیا گیا۔ چونکہ مذہب جیسا بھی ہو اور جو بھی ہو بہر حال ایک معاشرے کے انسانوں کو وحدت اور مقصد عطا کرتا ہے لیکن جب "مذہب" کو ہی دیس نکالا مل جائے تو معاشروں کا شیرازہ بکھر جاتا ہے اور ایک خلا پیدا ہو جاتا ہے۔ چونکہ یورپی معاشروں کے پاس اپنے لوگوں کی سیاسی وحدت اور نصب العین متعین کرنے کے لیے کوئی بنیاد نہیں تھی اہلِ مغرب نے "وطنیت" کا بت تراش لیا۔ اب ان کا ہر عمل، ان کی محنتیں، جینا، مرنا اور وفاداریاں اسی نئے خدا کا حق سمجھی جانے لگیں۔ قومیت، وطنیت یا نیشنلزم ایک نظریہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ قوم کی وحدت نسل و وطن اور زبان کی بنیاد پر قائم ہونی چاہیئے۔ جبکہ اسلام وطن، نسل، نسب اور زبان کو ایک سیاسی وحدت کی بنیاد تسلیم نہیں کرتا بلکہ تمام نوعِ انسانی کو صرف دو گروہوں میں تقسیم کرتا ہے "حزب اللہ" اور "حزب الشیطان" یا "اولیاء اللہ" اور "اولیاء الطاغوت"۔ لغوی اعتبار سے تو نسل یا وطن کسی قوم کی بنیاد بن سکتا ہے لیکن اسلامی تصورِ سیاست کے اعتبار سے ایک ریاست یا جغرافیائی وحدت کی بنیاد صرف اور صرف عقیدہ ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ قرآنِ پاک میں مومنوں کو حضرت ابراہیمؑ کی مثال پر عمل کرنے کا حکم دیتے ہیں، جب ابراہیم نے اپنی "قوم" سے مخاطب ہو کر ان کے معبودوں سے برأت کا اظہار کیا تھا اور یہ اعلان کر دیا تھا کہ اگر قوم ایمان نہیں لاتی تو "ہمارے اور تمہارے درمیان عداوت اور نفرت پیدا ہو چکی ہی"۔ (1)

لہٰذا اگر "عقیدے" کے فرق کی وجہ سے "عداوت" اور "بغض" پیدا ہوتا ہے تو مختلف عقیدے کے لوگوں کا ایک سیاسی وحدت کے تحت ایک nation state میں مشترکہ مفادات اور باہم محبت اور سلوک کا پیدا ہونا کیسے ممکن ہے؟

مسلمانانِ عالم کو فلسفۂ قومیت پر ایمان نے جتنا نقصان پہنچایا ہے شائید ہی کسی اور چیز نے پہنچایا ہو۔ بیسویں صدی میں مسلم امہ کو اس کی تاریخ کا جو سب سے عظیم نقصان پہنچا

(1) الممتحنہ 4:60

وہ خلافت کا خاتمہ تھا اور خلافت کو کمزور کرنے کے لیے استعماری طاقتوں نے جو حربہ اختیار کیا تھا وہ یہی ''قومیت'' کا حربہ تھا۔ عربوں اور ترکوں میں قومیت کی بنیاد پر نفرت کے بیج بوئے گئے جس کے نتیجے میں عالم اسلام نا قابل تلافی نقصان سے دو چار ہوا۔ پھر جب مسلم خطوں نے استعمار سے آزادی حاصل کرنے کی تگ و دو شروع کی تو خلافت اور امت کی جگہ وطنیت اور قومیت کے تصورات نے لے لی۔ یہاں تک کہ اس دور میں ''آزادی'' کا مطلب ہی اپنے الگ وطن یا ریاست کا حصول قرار پایا۔ مسلم خطوں کو چھوٹی چھوٹی اکائی میں تقسیم کر کے ''آزادی'' دی گئی تا کہ مستقبل میں یہ چھوٹے چھوٹے ممالک اپنے ہر مسئلے اور جھگڑے کے حل کے لیے پھر ''بڑی طاقتوں'' ہی کی طرف ہاتھ بڑھائیں۔ جو خطہ جتنا قدرتی وسائل اور دولت سے مالا مال تھا اس کو اتنی ہی چھوٹی اکائی میں تقسیم کیا گیا۔ پھر ان ملکوں میں بھی استعماری سازشوں کے تحت نسلی، لسانی اور صوبائی عصبیتوں کی آگ بھڑکائی گئی تا کہ یہ چھوٹے چھوٹے آزاد ممالک بھی کسی قسم کی ترقی یا خود مختاری حاصل نہ کر سکیں۔

Kwame Nkrumah لکھتے ہیں:

"Neo-colonialism is based upon the principle of breaking up former large united colonial territories into a number of small non-viable states which are incapable of independent development and must rely upon the former imperial power for defence and even internal security. Their economic and financial systems are linked, as in colonial days, with those of the former colonial ruler."[1]

(جدید استعماریت کی بنیاد میں یہ اصول کارفرما ہے کہ سابقہ نوآبادیات کے وسیع اور

[1] Kwame Nkrumah; "Neo-Colonialism ....";pg:xiii (introduction)

متحد خطوں کو ایسی بے شمار چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کر دیا جائے جو اپنے بل بوتے پر قائم نہ رہ سکیں بلکہ اپنے دفاع یہاں تک کہ اندرونی استحکام کے لیے بھی اپنے سابقہ استعماری آقاؤں کی مرہونِ منت رہیں ان [نوآزاد ریاستوں] کے اقتصادی اور مالی نظام نوآبادیاتی دور کی طرح آج بھی ان کی سابق استعماری حکومتوں کے ہاتھ میں ہی ہیں۔)

امت مسلمہ کے جسدِ واحد کی نس نس میں قومیت کا زہر اس کامیابی سے اتار دیا گیا ہے کہ آج جب مغربی استعماری طاقتیں کسی ایک مسلم خطے میں ظلم اور ناانصافی کی حدود پار کرتی ہیں تو اس جسم کے کسی اور حصے کو تکلیف کا احساس نہیں ہوتا۔

عابد اللہ جان لکھتے ہیں:

"If there were an Ummah, it would be unimaginable that a part of the Islamic state would be reeling under foreign occupation, with the rest of the ummah standing on the side lines..... the United States has cut the body into pieces and feels free to attack any part of that body when it sees fit with no fear of any real opposition or resistance."(1)

(اگر ہم ایک امت ہوں تو یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی اسلامی خطہ بیرونی قبضہ کاروں کے ستم کا نشانہ بنے اور باقی امت تماشا دیکھتی رہے۔۔۔[ہماری مثال ایسی ہے گویا] ریاستہائے متحدہ امریکہ کسی جسدِ واحد کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے بعد جب چاہے اور جیسے چاہے کسی ایک ٹکڑے پر حملہ کر دے اور اسے یہ خوف نہ ہو کہ کہیں سے کوئی مخالفت یا مزاحمت سامنے آئے گی۔)

عالمی طور پر مسلمان اسی تقسیمِ قومیت کی وجہ سے ہر جگہ ناقدری اور بے حیثیتی کا شکار

(1) Abidullah Jan; "Afghanistan..... ";pg:90

ہیں۔ ۱۹۷۱ء میں پاکستان کے ٹوٹنے کی ایک بڑی وجہ یہی فلسفۂ قومیت تھا۔ اسی نظریۂ قومیت کا نتیجہ ہے کہ ایک زبان بولنے والی وسیع وعریض عرب دنیا بھی درجنوں اکائیوں میں تقسیم ہے اوران بے شمار عرب ممالک کے درمیان پوری ڈھٹائی اور کرّ وفر سے اللہ کی مغضوب قوم نا صرف عربوں کا ہی ایک خطہ ہتھیا کر بیٹھی ہے بلکہ جب چاہے ان مظلوم فلسطینیوں پر ظلم و بربریت کے پہاڑ توڑتی ہے اوران عرب قوموں کی حیثیت محض خاموش تماشائی کی سی ہوتی ہے۔ استعمار اس حقیقت سے واقف ہے کہ اسلامی دنیا میں نظریہ قومیت کا پروان چڑھنا اور مضبوط ہونا مغرب کے استعماری مقاصد کی تکمیل کے لیے بہت ضروری ہے لہٰذا مغرب کی پوری کوشش ہے کہ نظریہ قومیت کے خلاف ''امتِ واحدہ'' کے نظریے کو کہیں بھی پنپنے نہ دیا جائے اسی لیے اس سوچ اور نظریے کو انتہا پسندی کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے۔ مثلاً رینڈ رپورٹ میں لکھا ہے:

"Their (fundamentalists) unit of reference in not the nation state or the ethnic group , but the Muslim community, the Ummah...."[1]

(انتہا پسندوں کے نزدیک اصل حوالہ وطن یا نسلی گروہ نہیں بلکہ اسلامی اخوت یا امت ہے۔)

لہٰذا آج استعمار نے مسلمانوں کو وہی نسلی، لسانی اور علاقائی بت تراش کر دیئے ہیں جنہیں چودہ سو سال پہلے اسلام نے پاش پاش کر دیا تھا۔ اور مسلمان استعمار کی اس خطرناک چال سے بے خبر ان بتوں کو دل وجان سے پوج رہے ہیں۔

3۔ جمہوریت:

موجودہ جمہوری نظامِ سیاست کا آغاز مغرب سے ہوا اور وہیں اس کے خدوخال وضع کئے گئے۔ اس نظام کے وجود میں آنے کے پیچھے کچھ تاریخی عوامل اور کچھ فکری بنیادیں

[1] Chery Benard;"Civil Democratic Islam";pg:3

کارفرما تھیں۔ تاریخی عوامل میں سب سے پہلا عنصر تو یہ تھا کہ جب مغربی عوام میں کلیسا اور مذہب کے خلاف بغاوت کے جذبات پیدا ہوئے تو ساتھ ہی اس خیال نے بھی جڑ پکڑا کہ انسان اپنی زندگی سے متعلق فیصلوں میں کسی مذہبی یا شاہی قانون کے پابند نہیں بلکہ اپنی قسمت اور مستقبل کا فیصلہ خود کرنے کا اختیار رکھتے ہیں(1) اس کے بعد دوسرا اہم واقعہ امریکہ کی آزادی تھا۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں امریکہ نے برطانیہ سے آزادی حاصل کی تو جارج واشنگٹن نے ایک نیا جمہوری نظام اور عوام کے جمہوری حقوق کی فراہمی کا اعلان کیا۔ پھر اٹھارویں صدی کے ہی اختتام پر انقلاب فرانس نے بھی یورپ میں جمہوری نظام کو فروغ دیا۔(2)

جمہوری نظام کی نظریاتی اور فکری بنیادیں فرانس سے تعلق رکھنے والے تین مفکرین نے کھڑی کیں۔ سب سے پہلے اٹھارویں صدی میں ''والٹیر'' نے، اس نظریے کو فروغ دیا کہ ریاستی معاملات میں مذہب اور خدا کا کوئی کردار نہیں اور یہ کہ مذہب انسان کی ذاتی تسکین کا ذریعہ ہے لہٰذا کوئی مذہب حق یا باطل نہیں۔ یہ انسان کا ذاتی معاملہ ہے۔(3) جمہوری نظام کی صورت گری کرنے والا دوسرا اہم مفکر ''مونٹیسکو'' ہے جو یہ نظریہ پیش کرتا ہے کہ تمام اختیارات ایک حکمران کے ہاتھ میں ہونے سے ہی ساری خرابیاں پیدا ہوتی ہیں لہٰذا اس نے حکومتی معاملات میں تفریقِ اختیارات کا نظریہ پیش کیا۔(4) تیسرا مفکر ''روسو'' تھا جس نے فرد کی ''آزادی'' اور اس حق پر زور دیا کہ وہ جب چاہیں کوئی حکومت

---

(1) مفتی محمد تقی عثمانی؛ ''اسلام اور سیاسی نظریات''؛ مکتبہ معارف القرآن، کراچی، نومبر 2010؛ ص:85 .

(2) ایضاً؛ ص:89

(3) ایضاً؛ ص:84

(4) ایضاً؛ ص:86

بنائیں اور جب چاہیں ختم کر دیں۔ ①

جمہوریت کے فروغ میں ان تاریخی اور نظریاتی عوامل کے بعد ایک اور نہایت اہم عنصر معاشی بھی ہے۔ جمہوریت درحقیقت موجودہ دور کے استحصالی سرمایہ دارانہ نظام کا سیاسی جزو ہے۔ جمہوری سیاسی نظام اور سرمایہ دارانہ معاشی نظام ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ مدیر ''ندائے خلافت'' مرزا ایوب بیگ رقمطراز ہیں:

''....سرمایہ دارانہ نظام کے خالق یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ اس نظام میں معاشی تقسیم جن غیر مساویانہ بلکہ ظالمانہ بنیادوں پر قائم ہے اور جس طرح اس نظام میں سرمایہ داروں کی اقلیت اکثریتی عوام کا استحصال کرے گی وہ دنیا کو کسی صورت قابل قبول نہیں ہوگا جب تک کہ اس کے ساتھ ایک ایسا طرزِ حکومت نہ قائم کیا جائے جس سے ایک طرف تو عوام کو یہ تاثر ملے کہ وہ طاقت کا سرچشمہ ہیں اور دوسری طرف یہ طرزِ حکومت جابرانہ اور ظالمانہ سرمایہ دارانہ نظام کا تحفظ کرے.... گویا استحصالی سرمایہ دارانہ نظام جو حقیقت میں انتہائی بدصورت اور بدنما نظام ہے، اُسے جمہوری طرز حکومت کے میک اپ سے خوبصورت اور خوش نما بنانے کی ایک کوشش کی گئی ہے۔'' ②

لہٰذا ان تاریخی نظریاتی اور معاشی عوامل نے مل کر جس جمہوری نظامِ حکومت کو تشکیل دیا اس کی ایک عمومی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ یہ ایک ایسا نظام سیاست ہے جس میں عوام کی حکومت عوام کے لیے خود عوام ہی کے ذریعے قائم ہو۔ اگر ہم جمہوری نظام کی فکری بنیادوں اور فلسفوں کا اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جائزہ لیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ نظام کسی صورت اسلامی نظامِ سیاست اور حکومت سے میل نہیں کھاتا۔ سب سے پہلے تو یہ نظام

---

① مفتی محمد تقی عثمانی: ''اسلام اور سیاسی نظریات''؛ ص:89

② ایوب بیگ، مرزا، مضمون: ''خلافت اور جمہوریت'' ہفت روزہ ندائے خلافت' لاہور، 15 تا 21 مارچ 2016ء، ص:3

''فرد'' یا ''انسان'' یا ''عوام'' کو مقتدرِ اعلیٰ تسلیم کرتا ہے جبکہ اسلام کی تعلیمات اللہ رب العزت کو مقتدرِ اعلیٰ قرار دیتی ہیں۔ پھر اس نظام میں اکثریت کے فیصلوں اور رائے کا احترام کیا جاتا ہے جبکہ قرآن پاک میں کہہ دیا گیا ہے کہ اگر اکثریت کی پیروی کی جائے گی تو ''اکثریت'' ہمیں راہ راست سے بھٹکا دے گی۔ ①

پھر جمہوریت کے مبینہ مقاصد میں کہیں بھی یہ مقصد بیان نہیں ہوا کہ خیر کو پھیلایا جائے گا اور شر کو روکا جائے گا اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ جمہوری نظام حکومت میں مذہب کا کوئی عمل دخل نہیں اور خیر وشر کے پیمانے مذہب کی طرف سے تو ''متعین'' ہوتے ہیں جبکہ جمہوریت میں عوامی رائے کے مطابق تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ قبیح ترین عمل بھی اگر معاشرے میں قبولیت کا درجہ حاصل کرے تو اُسے قانونی طور پر جائز قرار دے دیا جاتا ہے۔ مثلاً ریاستہائے متحدہ امریکہ میں عوام کے ووٹوں سے حکومت نے شراب کی خرید وفروخت اور شراب نوشی کے عمل کو غیر قانونی قرار دیا مگر صرف چودہ سال بعد دسمبر 1933 میں قانونِ تحریم خمر کی باقاعدہ تنسیخ کر دی گئی کیونکہ امریکی عوام کی اکثریت اسے چھوڑنے پر تیار نہیں تھی۔ ② جمہوریت کی ''برکات'' کی ایک اور مثال ''Wolfenden committee'' ہے۔ یہ کمیٹی برطانوی پارلیمنٹ نے 1954 میں تشکیل دی تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ہم جنس پرستی اور زنا سے متعلق رائے عامہ کا جائزہ لے کر رپورٹ پیش کرے تاکہ ''عوامی امنگوں'' اور رجحانات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ان امور کے متعلق قانون سازی کی جائے اس رپورٹ کی بنیاد پر برطانیہ کے دارالعوام نے یہ فیصلہ کیا کہ ہم جنس پرستی قانونی طور پر جائز ہے مولانا تقی عثمانی لکھتے ہیں:

''اس رپورٹ میں کمیٹی نے جو باتیں کہی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم جنس پرستی

---

① القرآن؛ 116:6

② مودودیؒ، ''تنقیحات''؛ ص:38

ایک برائی ہے۔ لیکن ہماری دشواری یہ ہے کہ ہم نے اپنے پروگرام کو اچھائی یا برائی پر نہیں بلکہ اس بنیاد پر تعمیر کیا ہے کہ افراد اپنے لیے قانون طے کرنے کے لیے آزاد ہیں۔... لہٰذا ہم (ہم جنس پرستی کے) اس قانون کی حمایت میں رائے دینے پر مجبور ہیں۔"(1)

اس کے برعکس اسلامی نظام حکومت میں خیر کو پھیلانا اور شر کو روکنا اسی لیے ریاست کی ذمہ داری قرار دی گئی ہے (2) کیونکہ اسلام میں خیر و شر کی تعریف بھی متعین ہے، مذہب اور ریاست کے معاملات علیحدہ بھی نہیں ہیں اور اکثریت کی رائے کی بجائے خالقِ کائنات کی نازل کردہ وحی کا اعتبار ہے۔

لہٰذا جمہوریت اور خلافت ہر اعتبار سے دو متضاد نظام ہائے حکومت ہیں لیکن مغرب اپنے نظامِ جمہوریت کو ہی اسلامی معاشروں پر مسلط کرنے پر بضد ہے اور مسلط کر بھی چکا ہے۔ یہ بھی عالمِ اسلام کے خلاف کفر یہ نظام کا ایک حربہ ہے۔ چونکہ بیسویں صدی میں عالمِ اسلام استعماری ہتھکنڈوں کے باعث مغرب سے ذہنی اور نفسیاتی طور پر انتہائی مرعوب ہو چکا تھا اور ہمارے بااثر اور مقتدر طبقے کی تعلیم و تربیت تو یوں بھی استعماری آقاؤں کے ہاتھوں سے ہی ہوئی تھی لہٰذا ایک ''آسمانی نظام'' کی حامل امت کے معاشروں میں جمہوریت کا لادینی اور سیکولر نظام ''انسٹال'' کرنے کا چیلنج بآسانی مکمل کر لیا گیا۔ یوں اسلامی معاشروں کے قوانین وحی کی بجائے اکثریتی رائے کی روشنی میں تشکیل پانے لگے۔ یہ نظام اس لیے بھی اس امت کے لیے تباہ کن ہے کہ اکثریت کی رائے کو اپنی مرضی کی شکل دینا بھی اب مشکل نہیں رہا۔ پراپیگنڈہ اور میڈیا کے اس دور میں اسلامی معاشروں کے صدیوں سے چلے آ رہے مضبوط عقائد اور نظریات کو بدل دینا یا کم از کم ان کو مشکوک بنا دینا

---

(1) تقی عثمانی، ''اسلام اور سیاسی نظریات''، ص: 149

(2) الحج 41:22

مغرب کے لیے اب ناممکن نہیں رہا۔

جمہوریت کے اس نظام کو معاشروں میں تقدس کا ایسا درجہ حاصل ہو چکا ہے کہ مولانا تقی عثمانی کے الفاظ میں:

> ''ہمارے دور میں جمہوریت کو ہی سب سے بہتر نظامِ سیاست قرار دیا گیا ہے اور جمہوریت پر ایمان لانا آج کی سیاست کا کلمۂ طیبہ بن چکا ہے، کوئی شخص جمہوریت پر اعتراض کی زبان کھولے تو وہ سیاست کی اصطلاح میں کافر سے کم نہیں''۔ ①

''آئین'' کو آج وہ درجہ دیا جاتا ہے جو کبھی اسلامی معاشروں میں ''شریعت'' کو دیا جاتا تھا۔ اگر ہم اپنے ملک پاکستان کے تناظر میں ہی دیکھیں تو ہمیں نظر آئے گا کہ ہمارے لیڈر اور حکمران دن رات اللہ کی حدود کو توڑیں یا شعائر اللہ کا مذاق اڑائیں تو ان پر انگلیاں نہیں اٹھیں گی، مگر کوئی لیڈر اس طعنے کا متحمل نہیں ہو سکتا کہ اس نے ''آئین'' کو توڑا ہے۔ ہم پورے نظام میں کہیں نہیں سنیں گے کہ شریعت کی حدود کیا ہیں لیکن ۱۹۷۳ء کے آئین کی حدود میں رہ کر ہی تمام تنازعات کے حل کی بات کی جائے گی۔

عالمِ اسلام میں جمہوریت کا پنپنا امریکی اور مغربی استعماری عزائم کے لئے کس قدر ضروری ہے اس کا اندازہ امریکی تھنک ٹینک RAND Corporation کی ان سفارشات سے بھی ہوتا ہے جن میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ اسلامی معاشروں میں ''اسلام پسندوں'' کا زور توڑنے اور "moderate" طبقوں کو معاشرے میں اثر ورسوخ دلانے کے لیے یہاں جمہوری نظام کا فروغ بے حد ضروری ہے۔ ②

اسی رپورٹ میں یہ بات بھی وضاحت کے ساتھ بیان کر دی گئی ہے کہ کوئی اسلامی

---

① تقی عثمانی؛ ''اسلام اور سیاسی نظریات''؛ ص:80

② Angel Rabasa,........;"Building Moderate Muslim Networks;" RAND Corporation;pg:46

معاشرہ یا حکومت اگر مغرب کی متعین کردہ جمہوری حدود سے تجاوز کرے یا مغربی جمہوری نظام میں کچھ ''اسلامی ترمیمات'' کرنے کی کوشش کرے تو مغرب کے نزدیک ایسی جمہوریت قابلِ قبول نہیں ہے۔ اس کے لیے رپورٹ میں ایک کسوٹی مقرر کی گئی ہے۔ اسلامی ممالک میں کوئی گروہ یا فرد خود کو کتنا ہی جمہوریت پسند کہلائے اور جمہوری نظام کا حصہ بننے کی کوشش کرلے لیکن اگر وہ اس کسوٹی پر پورا نہیں اترتا تو اسے امریکہ کی طرف سے جمہوری ہونے کی سند نہیں مل سکتی۔ اس کسوٹی کے اہم نکات یہ ہیں کہ یہ دیکھا جائے گا کہ آیا یہ گروہ یا افراد 'انسانی حقوق' کی وہی تشریح کرتے ہیں جو بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ ہے اور دیوانی و فوجداری مقدمات میں وہ سیکولر قوانین پر عملدرآمد کرتے ہیں یا ان معاملات میں شرعی تشریحات اور قوانین پر عملدرآمد کرنے پر بضد ہیں۔ ① اسی رپورٹ کے آخر میں The Ten Commandments of Democracy from the Platform of the Democratic Muslims کے عنوان سے وہ دس جمہوری دفعات نقل کی گئی ہیں جو بنیادی طور پر ناصر خضر نامی ایک عرب سیکولر مزاج مسلمان نے ترتیب دی ہیں۔ اس کی سب سے پہلی شق ہی یہی ہے کہ اسلام اور سیاست کو علیحدہ رکھا جائے گا اور مذہب کو کبھی بھی جمہوری اقدار پر فوقیت نہیں دی جائے گی۔ ②

سو اسلامی معاشروں میں آج خلافت کی جگہ جمہوریت ہی تمام مسائل کا حل سمجھی جانے لگی ہے اور چونکہ جمہوری نظامِ سیاست بنیادی طور پر مغرب کا وضع کردہ ہے لہٰذا اس نظام کی کامیابی کے لیے اسلامی ممالک مغربی راہنمائی اور approval کے محتاج ہیں۔ ہمارے معاشروں میں ہر مشکل اور پریشانی کا حل جمہوری نسخوں میں ہی تلاش کیا جاتا ہے اور ملکی مسائل حل نہ ہونے کی وجہ بھی اکثر یہی بیان کی جاتی ہے کہ ہمارے معاشروں

---

① Angel Rabasa,.......;"Building Moderate Muslim Networks" ;pg:69

② // // // pg:149

میں جمہوری طرزِ فکر رواج نہیں پا سکا۔ جمہوریت کو اس حد تک تقدس حاصل ہے کہ اسلامی خطوں پر امریکی حملوں کا ایک جواز یہ بھی پیش کیا جاتا ہے کہ امریکہ وہاں جمہوریت کا فروغ چاہتا ہے تا کہ عوام کے مسائل حل ہوں اور پھر مسلمانوں سے یہ امید بھی رکھی جاتی ہے کہ اسلامی معاشروں میں جمہوری روایات کے فروغ کے لیے امریکی ''قربانیوں'' اور کوششوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں۔ عابد اللہ جان لکھتے ہیں:

"......Today, the Vatican believes that Muslim communities must accomodate occupation forces, so that they may plant democracy there".[1]

(آج ویٹی کن یہ سمجھتا ہے کہ مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ بیرونی قبضہ کاروں کو خوش آمدید کہیں تا کہ یہ قبضہ کاران خطوں میں جمہوریت کی آبیاری کر سکیں۔)

غرض یہ کہ اسلامی معاشروں میں جمہوری نظامِ حکومت اور سیاست کے رواج پا جانے سے مغربی استعماران گنت فوائد حاصل کرتا ہے:

1) جمہوری نظام میں عقیدۂ قومیت اور nation state خود بخود مضبوط ہوتے ہیں۔

2) اس نظام کے لیے ''راہنما اصول'' مغربی نظریات اور فلسفوں سے لیے جاتے ہیں۔

3) انتخابات کا عمل ایک مہنگا اور پیچیدہ عمل ہے۔ امیدواران کو اپنی انتخابی مہم کے لیے وسائل درکار ہوتے ہیں اور جو بھی انہیں ان کی انتخابی مہم اور تشہیر کے لیے امداد فراہم کرتا ہے وہ امیدوار منتخب ہو کر اسی ''مددگار'' کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی ہوتا ہے۔

4) انتخابی مہمات کے دوران جہالت زدہ اور پسماندہ طبقات کو جھوٹے خواب دکھا کر اور امیدیں دلا کر ان کا استحصال کیا جاتا ہے۔

---

[1] Abidullah Jan; "Afghanistan....."pg : 48

5) میڈیا جیسی قوت کے استعمال کے ذریعے عوام کو بے وقوف بنایا جاتا ہے۔

6) مرد، عورتیں، جاہل، عاقل، مسلم، غیر مسلم، نیک، بد، سب کو ایک ہی قطار میں رکھا جاتا ہے اور سب کی رائے کو برابر حیثیت حاصل ہوتی ہے۔

جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے①

لہٰذا جمہوریت کے بنیادی عناصر اسلام کے عقیدہ و شریعت کے ساتھ قدم قدم پر متصادم ہیں۔ یہ نظام اگر اسلامی معاشروں میں رائج رہتا ہے تو اس کا فائدہ مسلمانوں کو نہیں بلکہ اسلام دشمنوں کو ہی پہنچتا ہے۔

4۔ کٹھ پتلی حکمران:

عصرِ حاضر کی استعماری طاقتیں جمہوریت کا راگ الاپنے کے باوجود اس بات کو یقینی بناتی ہیں کہ تیسری دنیا کے ممالک میں وہی طبقہ برسرِ اقتدار رہے جو ان کے ہاتھوں میں کٹھ پتلیوں کی طرح ناچتا رہے۔

Kwame Nkrumah لکھتے ہیں:

In the first place, the rulers of neo-colonial States derive their authority to govern, not from the will of the people, but from the support which they obtain from their neo-colonialist masters. They have therefore little interest in developing education, strengthening the bargaining power of their workers

---

① اقبال؛ نظم: ''جمہوریت''؛ کتاب: ''ضربِ کلیم'' (کلیاتِ اقبال)؛ ص: 682

employed by expatriate firms, or indeed of taking any step which would challenge the colonial pattern of commerce and industry, which it is the object of neo-colonialism to preserve".[1]

(نو استعماری طاقتوں کے شکار خطوں کے حکمران اپنے عوام کی خواہش پر نہیں بلکہ اپنے استعماری آقاؤں کی مدد کے ساتھ مسندِ حکومت پر براجمان ہوتے ہیں لہٰذا انہیں اس امر میں قطعاً کوئی دلچسپی نہیں ہوتی کہ وہ ملک میں تعلیم کی ترقی کے لیے اقدامات کریں یا اپنے عوام کے حالات درست کریں یا تجارتی و صنعتی معاملات میں استعماری استحصال کو روکیں۔ یہی نو استعماری طاقتوں کا ہدف ہے۔)

لہٰذا مسلمان خطوں اور معاشروں میں بھی استعمار کا کوئی حربہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتا جب تک کہ اسے یہیں سے کچھ "بار بردار" میسر نہ آجائیں۔ عصر حاضر کے مسلمانوں کی ایک بدقسمتی یہ بھی رہی کہ استعمار کے براہِ راست قبضے سے آزادی حاصل کرنے کے وقت سے لے کر اب تک ان کی زمامِ کاران ہاتھوں میں رہی جن کی حیثیت محض استعمار کی کٹھ پتلیوں کی سی ہے۔ مسلمان ممالک میں طاقت اور اقتدار ہمیشہ ان ہی لوگوں کے ہاتھوں میں رہا جو نفسیاتی اور نظریاتی طور پر مغرب سے مرعوب ہیں اور اپنی کامیابی اور فلاح کے تمام تر راستے مغرب ہی کے سکھائے اور پڑھائے گئے اصولوں اور فلسفوں میں تلاش کرتے ہیں۔

مسلم خطوں پر جتنا عرصہ استعمار کا براہِ راست قبضہ رہا انہوں نے دور اندیشی کے ساتھ کام لیتے ہوئے اپنے زیر قبضہ علاقوں میں ایسے مقامی افراد کی تعلیم و تربیت اور ذہن سازی بڑی کامیابی کے ساتھ کی جو ان کے یہاں چلے جانے کے بعد بھی ان کے قائم مقام کی حیثیت سے استعماری فرائض سرانجام دیتے رہیں اور ملک وملت کے وسائل خود اپنے

[1] Kwame Nkrumah; "Neo-colonialism......"; pg: xiii (introduction)

ہاتھوں سے اپنے آقاؤں کی خدمت میں پیش کرتے رہیں۔

کسی بھی معاشرے میں تین طبقات ایسے ہوتے ہیں جن کے ہاتھ میں طاقت، اقتدار اور اختیارات ہوتے ہیں۔ یہ فوج، بیوروکریسی اور سیاسی راہنماؤں پر مشتمل ہیں اور ان تینوں طبقات کی تسلی بخش ''تعلیم و تربیت'' تو استعمار جانے سے پہلے ہی کر کے گیا تھا۔ ان کی اسی تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا کہ طاقت کا توازن جب یورپ کی بجائے امریکہ کے ہاتھ میں آیا تو ہمارے حکمرانوں کا قبلہ بھی خود بخود امریکہ قرار پایا۔ اسی حقیقت کے متعلق جناب خرم مراد پاکستان کی صورتحال کے تناظر میں لکھتے ہیں:

> ''برطانوی دور استعمار کے دوران یہاں ہمارے اہل حل وعقد نے انگریز سے یاری اس کی مکمل وفاداری، اس کی فوجوں کے لیے اپنے جوانوں کی فراہمی او راس کے دربار میں کرسی ہی سے انہوں نے اپنی قسمت کے ستارے کو چمکتے دیکھا تھا۔ چنانچہ ان کے دیرینہ ''تجربے'' اور نفسیات نے انہیں یہی سمجھایا: اب جب کہ پاکستان کی صورت میں ایک بہت بڑی جاگیر ان کے ہاتھ میں آگئی ہے، تو اس کی قسمت چمکانے کا نسخہ بھی یہی ہے۔ اسی میں اس کی سلامتی اور دفاع، اس کے قومی اہداف کے حصول، اور اس کی ترقی کا راز پوشیدہ ہے۔ چنانچہ وہ بلا جھجک امریکہ کی سرپرستی حاصل کرنے اور اس کا یار وفادار بننے کے لیے کوشاں ہو گئے۔'' (1)

یہی وجہ تھی کہ بظاہر آزادی حاصل کرنے کے بعد بھی مسلمان ممالک اپنے مغربی آقاؤں کے ہی دستِ نگر رہے۔ یہاں کے مقتدر طبقات نے اسلام پسندی، اسلامی اقدار اور معاشروں میں اسلام کے فعال کردار کو ہی ملکی اور معاشرتی مسائل کی جڑ قرار دیا اور ملکی و ریاستی معاملات چلانے کے لیے'' آزاد خیالی'' اور ''سیکولرزم'' کو ہی ترقی کا راستہ باور

(1) خرم مراد: ''مغرب اور عالم اسلام''، ص:192

کرتے اور کرواتے رہے۔ ہمارے حکمران طبقات نے مغربی مفادات کے تحفظ کے لیے جو کردار ادا کیا ہے وہ بعینہٖ وہی کردار ہے جو آج سے پانچ سو سال پہلے مسلم ہسپانیہ کے حکمران ابو عبداللہ اور اس کے حواریوں نے ادا کیا تھا۔ خرم مراد لکھتے ہیں کہ:

''ابو عبداللہ محمد نے نا کہ بندی، فاقہ مستی، احسان مندی، اور خوف وطمع کے ہاتھوں مجبور ہو کر اسپین کی عیسائی ریاست کے حکمران شاہ فرڈی ننڈ چہارم اور ملکہ ازابیلا اور اُن کی فوجوں کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے اور ''حصول امن'' کے نام پر ہتھیار ڈالنے کے معاہدے پر دستخط کر دیے۔''(۱)

اس معاہدے کے بدلے ابو عبداللہ محمد نے اپنے لیے خصوصی مراعات کی ضمانت لی تھی۔(۲) لیکن جیسے ہی الحمراء اور غرناطہ پر عیسائیوں کا قبضہ ہوا، امن کی تمام ضمانتیں مسلمانوں کی مذہبی آزادی اور جان ومال کے تحفظ کے تمام وعدے خواب وخیال ہو گئے اور سپین کے مسلمان ذلت وعبرت کی داستان بن کر رہ گئے۔

آج بھی ہمارے حکمران اپنے مغربی آقاؤں کی خوشنودی کے لیے کسی حد تک بھی جانے کو تیار رہتے ہیں۔ آزادی کے فوراً بعد سے ہی کسی کا قبلہ واشنگٹن اور کسی کا ماسکو ٹھہرا۔ اپنے مغربی آقاؤں کو خوش کرنے کے لیے جب بھی ان حکمرانوں نے قومی اور ملی غیرت کا سودا کیا تو اس کے لیے ''قوم کے وسیع تر مفاد'' کا ہی بہانہ گھڑا۔ یہ علیحدہ بات کہ کوئی فائدہ، کوئی ترقی اور کوئی امن قوم اور عوام کو کبھی نصیب نہیں ہوا۔

ان حکمرانوں نے مسلم عوام میں قوم پرستی کے جذبات کو فروغ دینے میں بھی بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ یوں دنیا بھر میں پھیلے ہوئے مسلمانوں میں ایک امت اور جسدِ واحد ہونے کے احساس کی حوصلہ شکنی کر کے ان حکمرانوں نے استعمار کی ایک بہت بڑی خدمت

---

(۱) خرم مراد؛ ''مغرب اور عالمِ اسلام''؛ ص:95

(۲) ایضاً؛ ص:96

سرانجام دی ہے۔ دورِ جدید کی مسلم امہ میں ایسی شرمناک مثالیں بھی موجود ہیں جہاں مسلم ممالک کے حکمرانوں نے دوسرے مسلم ممالک یا خطوں پر سامراجی حملوں پر نہ صرف یہ کہ مجرمانہ خاموشی اور بے حسی سے کام لیا بلکہ اپنے ہی مسلمان بھائیوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑنے میں سامراجی قوتوں کے دست و بازو بنے۔ اس کی ایک مثال افغانستان پر امریکی حملے کی ہے جس میں پاکستانی حکومت نے امریکہ کو نہ صرف یہ کہ ہر طرح کا تعاون فراہم کیا بلکہ قوم کو یہ یقین بھی دلایا کہ اپنے مسلمان بہن بھائیوں پر آگ اور خون کی بارش برسانے میں اگر ہم امریکہ کی مدد کریں گے تو گویا ہمارے سارے دلدّر دور ہو جائیں گے اور ملک ترقی، فلاح اور معاشی بہتری کی راہ پر گامزن ہو جائے گا۔ اس کے لیے ''سب سے پہلے پاکستان'' کا نعرہ لگایا گیا اور بلا چون و چرا امریکہ کے مطالبات کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا گیا۔ قرآن پاک میں اللہ کی طرف سے کیے گئے نصرت و تائید کے وعدوں اور یہود و نصاریٰ کی خواہشات پر چلنے کی صریح ممانعت کے باوجود ہمارے حکمران ''زمینی حقائق'' کا رونا روتے رہے اور آسمانی مدد کے دروازے اپنے ہاتھوں سے قوم پر بند کر دیئے۔

امت مسلمہ کے مسائل اور تکالیف پر ہمارے حکمرانوں کا کیا رویہ اور احساسات ہیں اس کا ایک چھوٹا سا نمونہ پرویز مشرف کے اس اعلان سے سامنے آتا ہے جو اس نے ۱۲ جنوری ۲۰۰۱ء میں اپنے ایک بیان میں کیا:

''ہم کوئی اسلام کے ٹھیکیدار تو نہیں''۔(1)

اسی طرح عرب ممالک کے قلب میں یہودیوں کا پورے کر و فر کے ساتھ اپنی ریاست قائم کرنا، عراق کے کویت پر حملے کا بہانہ کر کے ارضِ مقدس میں امریکی فوجوں کا اتر آنا، شدید مصائب اور استعماری حملوں کا شکار ہونے والے مہاجرین کے لیے مسلم

(1) Abdullah Jan; "Afghanistan......";pg:92

ممالک کا اپنی سرحدوں کو بند کر دینا یہ سب مسلم حکمرانوں کی بے حسی اور سنگدلی کے علاوہ اس بات کا بھی ثبوت ہیں کہ یہ حکمران اپنے استعماری آقاؤں کے ہاتھوں میں محض کٹھ پتلیاں ہیں۔ ان حکمرانوں کی ناعاقبت اندیشی کا یہ عالم ہے کہ بار بار اپنے استعماری آقاؤں کی وعدہ خلافیوں اور دھاندلیوں کے باوجود ان کا دامن چھوڑنے پر تیار نہیں۔ عالم اسلام نے اپنے جن مسائل کے حل کے لیے بھی امریکہ سے امید لگائی مایوسی ہی کا سامنا کیا۔ فلسطین و کشمیر پر غاصبانہ قبضہ ہو یا بوسنیا، چیچنیا اور برما کے مسلمانوں پر توڑے جانے والے انسانیت سوز مظالم ہوں کہیں تو امریکہ کا براہِ راست ہاتھ ان کے پیچھے ہوتا ہے اور کہیں امریکہ کی شہ اور تعاون ہوتا ہے جبکہ ہمارا یہ حال ہے کہ سب کچھ جانتے بوجھتے بھی ہمارے حکمران اپنے مسائل کے حل کے لیے امریکہ کو ہی مشکل کشا سمجھتے ہیں۔

ان حکمرانوں کا اپنے دین سے کتنا تعلق ہے اس کا ایک نمونہ صدر جنرل پرویز مشرف کے اس بیان میں نظر آتا ہے جو انہوں نے ۴ مارچ ۲۰۰۱ء کو نیوز ویک میں دیا جس میں انہوں نے فخریہ اعلان کیا کہ وہ نمازیں نہیں پڑھتے۔ (۱) پھر کئی عرب ممالک کے حکمرانوں میں خدا پرستی کی بجائے قوم پرستی کا یہ عالم رہا کہ مصر کے جمال عبدالناصر نے اپنے ریاستی دستور سے اسلام کو کھلم کھلا خارج کر کے عرب سوشلزم کو سرکاری مذہب کے طور پر اختیار کیا۔ (۲) اسرائیل کے خلاف جنگ میں اپنی قوم کو اسلام کے نام پر نہیں بلکہ عرب قومیت کے نام پر میدان میں اتارا اور قوم پرستی میں اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ فرعونی تہذیب سے مصر کے تعلق پر فخر کیا اور کھلم کھلا اس بات کا فخریہ اعلان کیا کہ "ہم فرعون کی اولاد ہیں"۔ (۳) ان حکمرانوں نے اپنے مغربی آقاؤں کو خوش کرنے کے لیے اپنی قوم کے

---

(1) Abdullah Jan; "Afghanistan......";pg:39

(۲) خرم مراد؛ "مغرب اور عالم اسلام"؛ ص: 88

(۳) ایضاً؛ ص: 89

مصلحین اور مجاہدین کو بے دریغ پھانسی پر چڑھایا۔ اخوان المسلمین کو عرب قومیت اور سوشلزم کے بجائے اسلام کی طرف دعوت دینے پر وحشیانہ ظلم وستم کا نشانہ بنایا۔ (1) حد تو یہ ہے کہ مغربی استعماری آقاؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ہمارے حکمرانوں نے قوم کی بیٹیوں تک کو کفار کو حوالے کیا۔ برادر ملک کے سفیر مُلا ضعیف کو گرفتار کر کے دشمن کے حوالے کر دیا گیا جبکہ سفیر پر ہاتھ ڈالنا تاریخ کے ہر دور، ہر ملک اور ہر مذہب میں شدید عار کی بات سمجھی جاتی ہے۔

مسلمان حکمرانوں کی کبھی یہ جرأت نہ ہو سکی کہ دنیا کے مظلوم مسلمان خطوں مثلاً کشمیر، فلسطین، بوسنیا، برما وغیرہ کے حق میں مضبوط اور دلیرانہ مؤقف اپنا سکیں۔ اس کے برعکس جب ہم اُس دور کا جائزہ لیتے ہیں جب خلافت موجود تھی تو ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف مسلمان امراء گورنروں اور خلفاء نے اپنی ذاتی کمزوریوں اور خامیوں کے باوجود کبھی دینی غیرت پر سمجھوتہ نہیں کیا تھا۔ حجاج بن یوسف ایک طرف تو ظلم میں اس حد تک بڑھ گیا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین بھی اس کے ظلم سے محفوظ نہ رہے لیکن دوسری طرف اس کی دینی غیرت اور احساس ذمہ داری کا عالم یہ تھا کہ سندھ میں مسلمان قیدیوں کی حالت کا سُن کر باوجود اس کے کہ اسلامی افواج سپین اور وسطی ایشیا کے محاذوں پر برسرِ پیکار تھیں اس نے سندھ کے حکمران کے خلاف اعلانِ جہاد کیا اور لشکر کشی کی۔ اسی طرح خلافتِ عثمانیہ کے آخری ادوار میں جب عثمانیوں کی حکومت شدید مالی بحران اور مشکلات کا شکار تھی تو خلیفہ سلطان عبدالحمید کو بھاری مالی امداد اور تمام قرضے اتار دینے کی پیشکش کی گئی۔ یہ پیشکش یہودیوں کی طرف سے کی گئی اور بدلے میں فلسطین کا مطالبہ کیا گیا۔ خلیفہ نے ایک لمحہ توقف کیے بغیر اس پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ (2) لیکن دینی غیرت کی یہ روشن مثالیں اب محض تاریخ کا حصہ ہیں

---

(1) خرم مراد: ''مغرب اور عالمِ اسلام''، ص: 89

(2) مریم خنساء: ''مسلمانوں کا فکری اغواء''، دار الکتب السلفیہ، لاہور، س ن، ص: 143

مسلمان خطوں کے موجودہ حکمرانوں کے نزدیک اپنے اقتدار، طاقت اور دنیا کی چند روزہ زندگی کی عیاشیوں سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں اور اپنے اقتدار کی مضبوطی اور قیام کے لیے وہ اپنے مغربی آقاؤں کا ہر حکم بجالانے کو تیار ہیں۔

مسلمان ممالک کے حکمران اگر اتحاد اور اتفاق سے کام لیں اور متحد ہو کر مغربی و امریکی استعماری عزائم کے سامنے ڈٹ جائیں تو کسی بڑی سے بڑی طاقت میں بھی یہ جرأت نہ ہوگی کہ وہ اسلامی اتحاد کے سامنے ٹھہر سکے۔ مسلمانوں کے پاس بہترین افواج، قدرتی وسائل اور قابل دماغ موجود ہیں لیکن برا ہو اس احساسِ مرعوبیت کا کہ ہمارے حکمرانوں کے نزدیک عزت، ذلت، موت، زندگی، رزق اور اقتدار اللہ کے ہاتھ میں نہیں (نعوذ باللہ) بلکہ امریکہ کے ہاتھ میں ہے۔

پاکستان کے ایک سابق وزیر اعظم حسین شہید سہروردی دسمبر ۱۹۵۶ء کو قومی اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

”....امریکہ اور برطانیہ جیسی بڑی طاقتوں کے ساتھ بندھنے کی بجائے ہم مسلمان ملکوں کے ساتھ متحد کیوں نہیں ہوتے؟ میرا جواب ہے کہ صفر+صفر+صفر بہرحال صفر ہی رہے گا۔“[۱]

جبکہ ۲۲ فروری ۱۹۵۷ کو انہوں نے بیان دیا:

”یہ ہماری بڑی خوش قسمتی ہے کہ ہماری پشت پر ایک طاقتور ملک ہے جو ہماری سالمیت اور سیاسی آزادی کی ضمانت دے رہا ہے۔“[۲]

ایک اور جگہ اپنی وفاداری کا دم بھرتے ہوئے یوں گویا ہوئے:

”وہ یہ یاد رکھیں کہ ہم دل و جان سے ان کے ساتھ ہیں۔ اگرچہ ہم چھوٹے ہیں۔

---

[۱] خرم مراد: ”مغرب اور عالم اسلام“، ص: 205

[۲] ایضاً

ان کو ہم سے زیادہ بڑا وفادار دوست نہیں ملے گا۔"①

جب ہمارے حکمران اغیار کی دوستی و وفاداری کا یوں دم بھرنے لگیں اور برملا اپنی ذلت و پستی کا اعلان و اعتراف کرنے لگیں تو ان کی ذات سے اپنی قوم اور عوام کو نہیں بلکہ ظاہر ہے کہ دشمنانِ دین کو ہی فائدہ پہنچے گا۔

5۔ عالمگیریت:

آج کی دنیا کو ایک "عالمی گاؤں" یا global village کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جدید ٹیکنالوجی نے فاصلوں کو سمیٹ دیا ہے۔ تیز رفتار ذرائع مواصلات کے ذریعے افراد، ساز و سامان، سرمائے، خبریں اطلاعات اور معلومات کی نقل و حرکت ناقابلِ یقین حد تک آسان ہو چکی ہے۔ لہٰذا دنیا کے لوگ، معاشرے، معیشتیں، نظریات اور خیالات تیزی کے ساتھ ایک دوسرے سے جڑتے جا رہے ہیں اور ایک دوسرے کو متاثر کرنے اور ایک دوسرے پر اثر انداز ہونے کی صلاحیتیں بڑھ رہی ہیں۔

سرسری نظر سے دیکھا جائے تو تیز ذرائع مواصلات و نقل و حرکت اور باہمی رابطوں میں آسانی عصرِ حاضر کی ایک نہایت مفید پیش رفت محسوس ہوتی ہے لیکن اگر اس "عالمگیریت" کا جائزہ پوری گہرائی میں جا کر لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ جدید استعماری حربوں میں سے ایک بے حد اہم اور کارآمد حربہ ہے کیونکہ اس "عالمی گاؤں" (global village) کا ہر باشندہ براہِ راست عالمی طاقتوں کی نظریاتی، معاشی، ثقافتی اور عسکری یلغار کی زد میں ہے۔ پلوٹو پریس، برطانیہ کے مینجنگ ڈائریکٹر روجروان زوانن برگ اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

"آج ہمارا استعماری نظام عالم گیر ہے اور دنیا کے ہر شخص پر اثر انداز ہوتا ہے"۔②

---

① خرم مراد؛ "مغرب اور عالمِ اسلام"؛ ص: 206

② روجروان زوانن برگ؛ عصرِ حاضر کی استعماریت اور عالمگیریت" (مترجم ثروت جمال اصمعی)؛ ص: 18

لہٰذا دنیا میں عالمگیریت کا موجودہ نظام بڑی حد تک استعماریت یعنی نو آبادیاتی نظام کی ہی توسیع ہے۔

''عالمگیریت'' کے نظام کا جوہری عنصر سائنس، ٹیکنالوجی اور ذرائع ابلاغ کی ترقی ہے لہٰذا قدرتی امر ہے کہ عالمگیریت کے اس دور میں وہی اقوام سب سے زیادہ فائدے میں رہیں گی جن کی ترقی ان شعبہ ہائے جات میں مسلم ہے۔ عالمگیریت کے اس سامراجی پھیلاؤ سے اصل فائدہ ان ہی اقوام کو پہنچ رہا ہے جو ٹیکنالوجی میں دوسروں سے آگے ہیں اور وہ ممالک جو سائنس، ٹیکنالوجی، معیشت اور سیاست کے میدانوں میں بہت پیچھے ہیں وہ نظامِ عالمگیریت کے ہاتھوں مزید استحصال کا شکار ہیں۔ عالمگیریت ایک ایسی چابی ہے جس نے دنیا کی ترقی یافتہ اقوام خصوصاً امریکہ کو اپنے استعماری مقاصد کی تکمیل کے لیے نئی نئی راہیں کھول کر دی ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد اپنے ایک مضمون ''امریکی سامراجیت اور مسلمان'' میں لکھتے ہیں:

> ''آج عالمگیریت کے زیرِ عنوان سینکڑوں ہزاروں میل دور بیٹھ کر بھی امریکی سامراجی طاقت قوت، دھونس اور دھمکی کے بل پر کسی بھی ملک پر سیاسی طور پر قبضہ کرنے اور اس کی معیشت، سیاست، معاشرت اور ثقافت کو اپنے رنگ میں رنگنے کو نہ صرف جائز بلکہ انسانیت کی خدمت قرار دینے میں شرم محسوس نہیں کرتی۔''[1]

عالمگیریت کے اس نظام کا سب سے بڑا شکار آج اسلامی دنیا ہے۔ مسلمان نہ صرف سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں مغرب سے بہت پیچھے ہیں بلکہ خلافت کی عدم موجودگی

---

[1] پروفسر ڈاکٹر انیس احمد، مضمون: ''امریکی سامراجیت اور مسلمان''؛ مجلة: ''مغرب اور اسلام''، رسالہ: 30، جنوری۔ دسمبر 2006؛ ص:3

اور لا تعداد قومیتوں اور جغرافیائی حد بندیوں میں تقسیم ہونے کی وجہ سے کسی ایک مؤثر مرکزی طاقت سے محروم اور سیاسی و معاشی پسماندگی اور ابتری کا شکار ہیں۔ ان کے برعکس مغربی دنیا نہ صرف سائنس و ٹیکنالوجی کے نت نئے جہاں تسخیر کر چکی ہے بلکہ اسلام دشمنی میں امریکی پرچم تلے متحد ہو کر سرگرم عمل ہے۔ اگر عالمِ اسلام کے موجودہ حالات کے پسِ منظر میں ''عالم گیریت'' کا جائزہ لیا جائے تو اس کی یہی شکل نظر آتی ہے کہ ساری دنیا کی اسلام دشمن قوتیں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایک عالمی اتحاد بنا کر میدان میں اتر آئی ہیں۔ اور اس کی وجہ پھر وہی ہے کہ اسلام ہی وہ واحد نظریہ ہے جس کی ''عالمگیریت'' اور ''آفاقیت'' مغرب کے استحصالی اور استعماری نظامِ عالمگیریت کے مقابلے میں پیش کی جا سکتی ہے۔

آج مغرب نے اپنی بیش بہا طاقت کے ذریعے اپنے نظریات وعقائد کو عالمگیریت کے نام سے ہی دنیا پر مسلط کر رکھا ہے۔

پروفیسر خورشید احمد اپنے مضمون ''عالمگیریت: چند زمینی حقائق اور اسلامی طرزِ عمل'' میں لکھتے ہیں:

> ''امریکہ اور یورپ....کی فوجی طاقت... سیاسی اثر و رسوخ، معاشی قوت، ٹیکنالوجی پر عبور اور ذرائع ابلاغ پر مکمل کنٹرول۔ حتیٰ کہ فکر و خیال تک کی عملاً حد بندی نے عالمگیریت کو نمایاں امریکی یورپی شناخت دے دی ہے۔''[1]

''عالمگیریت'' کے عنوان کے تحت مغرب نے جن بنیادی امور کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے، وہ عالمی معیشت، عالمی سیاست اور عالمی ثقافت (اخلاقیات) کے شعبہ جات ہیں۔ ان میں معیشت کو سب سے اہم مقام حاصل ہے۔ جبکہ یہ معاشی عنصر عالمگیریت کے پورے

---

[1] پروفیسر خورشید احمد؛ مضمون: ''عالمگیریت: چند زمینی حقائق اور اسلامی طرزِ عمل''؛ مجلہ: ''مغرب اور اسلام''، رسالہ: 34، 2010؛ ص: 108

عمل کے لیے قوتِ محرکہ کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔

اس ''گلوبل ویلیج'' کی عالمی طاقتوں نے جو معاشی نظام اپنی طاقت کے بل بوتے پر رائج کر رکھا ہے وہ سرمایہ داری کا نظام ہے۔ اور یہ نظام دنیا پر امریکی بالادستی کا ایک اہم ستون ہے۔ اسی نظام کی حفاظت کے لیے امریکہ نے تقریباً اسی سال اشتراکیت کے خلاف سرد جنگ لڑی اور سوویت روس کے خاتمے کے بعد سرمایہ دارانہ نظام دنیا کے واحد کامیاب معاشی نظام کے طور پر سامنے آیا اور اسلامی ممالک سمیت دنیا کے ایک وسیع رقبے پر آج یہی نظام رائج ہے۔

نوید صادق خان، نامہ نگار روزنامہ ''انصاف'' لکھتے ہیں:

''اس وقت دنیا میں سرمایہ دارانہ نظام اپنے پورے عروج پر نظر آرہا ہے.... یہ نظام انتہائی تیزی سے اپنی جڑیں مضبوط کرتا جا رہا ہے۔ امریکہ میں فنانس کی ماہر انتونیا جوبار کی نئی کتاب 'دی بُش ایجنڈا' کے مطابق پوری دنیا میں سرمایہ دارانہ نظام کی مکمل اور سخت گرفت ہی امریکا کے بہترین مفاد میں ہے۔ انتونیا جوباز اس عمل کو کارپوریٹ عالمگیریت یا گلوبلائزیشن کا نام دیتی ہیں، ان کے مطابق امریکہ کی دہشت گردی کے خلاف نام نہاد جنگ درحقیقت کارپوریٹ عالمگیریت کو ترقی دینے کیلئے ہے اور آزادانہ تجارت اس جنگ ہی کا ایک ہتھیار ہے۔''[1]

یہ مسلم ممالک کی ایک بہت بڑی بدقسمتی ہے کہ آج وہ اسلام کے دیئے گئے بہترین معاشی نظریات اور اصولوں کو پس پشت ڈال کر اس سرمایہ دارانہ نظام کے پنجوں میں جکڑے جا چکے ہیں جو استعمار کی ہی ایک شکل ہے۔ نیز جو اپنی بنیاد اور تعمیر کی ہر سطح پر اسلام کے بنیادی معاشی اصولوں سے متصادم ہے۔

---

[1] نوید صادق خان؛ مضمون: ''دہشت گردی کی آڑ میں سرمایہ دارانہ ایجنڈے کی تکمیل''؛ ص: 45

سرمایہ داری کے نظام کی بنیاد ہی خودغرضی کے نظریئے پر قائم ہے وہ یہ کہ ہر شخص اپنے کمائے ہوئے مال کا تنہا مالک ہے۔ وہ اپنے مال میں جس طرح چاہے تصرف کرے۔ چاہے تو کسی حاجتمند غریب کی مدد کرے نہ چاہے تو نہ کرے۔ چاہے تو اپنی اولاد میں سے کسی ایک کو یا سب کو وراثت میں حصہ دار بنائے اور چاہے تو اولاد کو محروم رکھ کر ساری دولت کتوں یا بلیوں کی ''فلاح و بہبود'' کی خاطر وصیت کر جائے۔ اس کے برعکس دین اسلام کا معاشی فلسفہ ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ دولت مندوں کے اموال میں غرباء اور مساکین کا بھی حصہ ہے اور اولاد اور رشتہ دار کے حق میں وصیت بھی کی جائے گی۔ پھر غرباء، مساکین، اولاد، ماں باپ، بہن، بھائی اور دیگر رشتہ داروں کا کتنا حصہ ہوگا یہ بھی شریعت نے طے کر دیا۔ سرمایہ دارانہ نظام کے نتیجے میں دولت معاشرے کے چند افراد کے ہاتھ میں سمٹ جاتی ہے اور معاشرہ امیر و غریب کے دو واضح طبقات میں تقسیم ہو جاتا ہے جبکہ اسلامی معاشی نظام کا مقصود یہ ہے کہ دولت محض چند افراد کے ہاتھوں میں ہی نہ رہے بلکہ معاشرے میں گردش کرے۔

سرمایہ داری نظام کا سب سے اہم عنصر سود ہے۔ سود کے بغیر اس نظام کا وجود ہی قائم نہیں رہ سکتا جبکہ قرآن اس بات کا واضح اعلان کرتا ہے کہ سود کا کاروبار کرنے والوں کے خلاف اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا اعلان جنگ ہے۔[1] گویا آج اسلامی دنیا نے مغربی سودی نظام کو اپنے معاشروں میں رائج کر کے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے خلاف کھلم کھلا بغاوت کا اعلان کیا ہے۔

عالمگیریت کے معاشی پہلو میں ''آزاد تجارت'' بھی ایک بہت بڑا استعماری حربہ ہے۔ ان طاقتوں کی کوشش ہے کہ دنیا کو ایک عالمی منڈی میں تبدیل کر دیا جائے جہاں بغیر کسی سرحدی روک ٹوک کے تجارتی سرگرمیاں جاری ہوں۔ بظاہر اس کا مقصد یہ بتایا جاتا

---

[1] البقرہ 279:2

ہے کہ اس کے ذریعے عالمی معیشت بے انتہا تیز رفتاری سے ترقی کرے گی لیکن حقیقت میں اس کا فائدہ صرف ان طاقتوں کو ملے گا جو پہلے ہی دنیا کی معیشت پر قابض ہیں، پوری دنیا میں جہاں سے چاہیں مطلوبہ خام مال حاصل کر سکتے ہیں، بھاری رقوم کی سرمایہ کاری اور جدید ٹیکنالوجی کا استعمال کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد اپنے لیکچر ''عالمی مالیاتی نظام'' میں ہفت روزہ نیوز ویک کی ایک رپورٹ کا حوالہ دیتے ہیں جس میں ماہرین یہ کہتے ہیں کہ معاشی عالمگیریت یا globalization درحقیقت gobbalization ہے جس کا مقصد یہی ہے کہ دنیا بھر کی دولت کو چند بڑے gobble (ہڑپ) کر سکیں۔ لہٰذا سرمایہ داروں کو اپنے سرمائے کو بڑھانے اور سرمائے کے بلا روک ٹوک بہاؤ کے لیے آزاد اور عالمی منڈیاں درکار ہیں۔ [1]

عالمگیریت کے سیاسی پہلو کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اسلامی خطوں کو قومی ریاستوں میں بانٹ دینے کے بعد اب جدید استعمار کی کوشش یہ ہے کہ یہ قومی ریاستیں بھی مضبوط نہ ہونے پائیں۔ کچھ ایسے عالمی اور بین الاقوامی ''ضابطے'' ہوں جن کی پابندی کرنا ہر ملک پر لازم ہو۔ ایک مضبوط قومی ریاست جو اپنے فیصلے کرنے میں آزاد ہو استعمار کی راہ میں بڑی رکاوٹ ہے مثلاً ایسی ریاست بیرونی سرمائے کے بہاؤ پر روک ٹوک عائد کر سکتی ہے یا اپنے دفاعی منصوبوں کو پروان چڑھا سکتی ہے لہٰذا کچھ بین الاقوامی گلوبل پابندیاں، قوانین اور ضابطے نافذ کیے جاتے ہیں۔

عبدالرشید ارشد اپنی تصنیف ''آخری صلیبی جنگ'' میں ''گلوبلائزیشن'' کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ گلوبلائزیشن کا مقصد ہے کہ ریاستیں اپنی خارجہ پالیسی، معاشی پالیسی اور دفاعی پالیسی کی تشکیل کے اپنے حق سے دستبردار ہو جائیں اور ان ذمہ داریوں کو

---

[1] ڈاکٹر اسرار احمد؛ لیکچر: ''عالمی مالیاتی نظام''؛ www.tanzeem.org

امریکی استعمار اور اس کی گماشتہ آلہ کار تنظیموں، منصوبوں اور معاہدوں کو منتقل کر دیں۔ (۱)
ظاہر ہے کہ ایک ایسی ریاست کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوں گے اور وہ استعمار کے کسی منصوبے کی مخالفت کرنے یا اس کے خلاف اپنا دفاع کرنے کے قابل نہیں رہے گی۔

''عالمگیریت'' کا تیسرا اہم پہلو تہذیبی، ثقافتی اور اخلاقی پہلو ہے۔ اسلامی تہذیب واخلاقیات کا منبع قرآن وسنت اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی زندگیاں ہیں لیکن ''عالمگیریت'' کا تقاضا یہ ہے کہ دنیا کی تمام اقوام ایک ایسی عالمی تہذیب اور اخلاقی ضابطے کو اپنا لیں جو ایک بالادست گروہ کی طرف سے باقی دنیا پر مسلط کیا جائے اور جس کو UNO کی سندِ قبولیت بھی حاصل ہو۔ یہ ''گلوبلائزیشن'' کی ہی برکات ہیں کہ اسلامی معاشروں میں آج کفریہ تہوار بھی نہایت جوش وخروش سے منائے جاتے ہیں۔ ہمارے حکمران اور لیڈر حضرات کرسمس کے کیک کاٹتے ہوئے پائے جاتے ہیں، ویلنٹائن ڈے پر شرم وحیا اور عفت وناموس کی دھجیاں بکھیری جاتی ہیں، نیو ائر نائٹس مذہبی تہوار کی سی عقیدت کے ساتھ منائی جاتی ہیں۔ ہمارے ہادی برحق نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو روزہ رکھنے کے معاملے میں بھی اہل کتاب کی تقلید گوارا نہ کی، سر کی مانگ نکالنے میں بھی مشرکین کے طریقے کو اختیار نہ کیا لیکن آج کے مسلم معاشروں میں عصرِ حاضر کی global تہذیب نے ایسی نقب لگائی ہے کہ ہمارا پہنا اوڑھنا، کھانا پینا، ہمارے حلیے یہاں تک کہ ہمارے تہوار بھی مغرب کے رنگ میں رنگتے جا رہے ہیں۔ اس گلوبل بستی میں شہریت پانے کے لیے اسی گلوبل تہذیب کو برضا ورغبت اپنانا ضروری ہے جس کی بنیاد میں انسان کی نفسانی خواہشات کی بے لگام آزادی کا اصول کارفرما ہے۔ اس تہذیب کے چند اہم مقاصد یہ ہیں کہ معاشروں سے خاندانی نظام کی اہمیت کو کم کیا جائے، اخلاقی ضوابط کا ماخذ ومحور انسان کی انفرادی پسند ناپسند ہو۔ وہ شادی کرنا چاہے یا شادی کے بغیر کسی کے ساتھ رہنا چاہے یہ اس کی مرضی ہے یہاں

(۱) عبد الرشید ارشد: ''آخری صلیبی جنگ'': النور ٹرسٹ، جوہر پریس بلڈنگ، جوہر آباد؛ ص:164

تک کہ ہم جنس پرستی کو بھی قانونی اور اخلاقی حیثیت حاصل ہو اور مذہب کو انسانی زندگی کے کسی پہلو پر روک ٹوک کی اجازت نہ ہو۔

عالمگیریت کے عنوان کے تحت ان معاشی، سیاسی اور تہذیبی ایجنڈوں کی تکمیل کے لیے استعمار نے کچھ ادارے تشکیل دے رکھے ہیں۔ جان مک لیڈ کے مطابق وہ یہ ہیں:①

1) عالمی مالیاتی ادارے
2) کثیر الاقوامی کمپنیاں
3) غیر ریاستی تنظیمیں
4) میڈیا

پروفیسر خورشید احمد کے مطابق:

''یہ سب (ادارے) مل کر ایک ایسے نظام کو وجود میں لانے کے لیے فیصلہ کن کردار ادا کر رہے ہیں جسے مہیب تر سامراجیت کہا جا سکتا ہے مگر جسے عالمگیریت کا بے ضرر نام دے دیا گیا ہے۔''②

آج کا استعمار اپنی بڑی بڑی ملٹی نیشنل کمپنیوں کی شکل میں تیسری دنیا کے قدرتی اور افرادی وسائل پر اپنے دانت گاڑے بیٹھا ہے۔ دنیا کے وہ ممالک جو خاص طور پر کفر کی سرپرستی اور اسلام دشمنی و تعصب میں باقاعدہ سرغنہ کی حیثیت رکھتے ہیں ان کی کمپنیوں کا خاص طور پر مسلمان ممالک میں جال پھیلا ہوا ہے۔ یہ کمپنیاں اپنی مصنوعات کی تیاری کے لیے خام مال زیادہ تر مقامی کمپنیوں سے حاصل کرتی ہیں پھر وہیں کی افرادی قوت کی خدمات کو ارزاں معاوضوں پر حاصل کر کے مصنوعات کی تیاری اور مارکیٹنگ کرتی ہیں، پھر جو کثیر منافع حاصل ہوتا ہے انہیں اپنے اکاؤنٹ میں منتقل کرتی ہیں۔ دنیا کے چند امیر ترین ملکوں کو چھوڑ کر کثیر القومی کارپوریشنیں دنیا کے بیشتر سرمائے کی مالک ہیں۔

انسانی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس کے لیے یہ کمپنیاں مصنوعات تیار نہ کرتی

---

① John Mcleod;"Beginning Post Colonialism";pg:304

② پروفیسر خورشید احمد؛ مضمون: ''عالمگیریت، چند زمینی حقائق اور اسلامی طرز عمل''؛ ص:108

ہوں۔ روزمرہ کی گھریلو اشیاء سے لے کر اخبارات و جرائد کی اشاعت اور ذاتی نیٹ ورکس بھی ان کی ''مصنوعات'' میں شامل ہیں۔ یہ کمپنیاں انسانی ضروریات اور نفسیات پر باقاعدہ ریسرچ کر کے اپنے کاروبار چلاتی ہیں۔ یہ معاشروں کے پورے طرز زندگی کو بدل دینے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ ذرائع ابلاغ کے ذریعے اپنی مصنوعات کو لوگوں کی زندگیوں کی اہم ضرورت باور کروانا پھر انہیں اس کا عادی بنا دینا ان کمپنیوں کے لیے بہت آسان ہے۔ یہ جن معاشروں میں اپنے کاروبار چلاتی ہیں وہاں کی خوبیوں، خامیوں اور ثقافت پر نظر رکھ کر اپنی مصنوعات کی تشہیر کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر ہمارے معاشرے میں ان ملٹی نیشنل کمپنیوں کی کئی مصنوعات ایسی تھیں جنہیں گھروں کے بزرگ عام طور پر آسانی سے قبول نہیں کرتے تھے جیسے ڈبوں میں بند دودھ یا پیکٹ والی خوراکیں۔ اس کا حل یہ نکالا گیا کہ ایسی مصنوعات کی تشہیری مہمات میں بزرگ ''ماڈل'' کو سامنے لایا گیا اور انہیں ہنستے مسکراتے، اچھلتے کودتے ان مصنوعات کا استعمال کرتے اور خوش ہوتے دکھایا گیا۔ لہٰذا اس کا فوری اثر یہ ہوا کہ گھر گھر ان ڈبہ بند خوراکوں اور مصنوعات کا استعمال عام ہے اور انہیں اب بزرگوں کی "approval" بھی حاصل ہے۔

یہ کمپنیاں معاشرے میں پہلے سے موجود مقامی کمپنیوں کو آسانی کے ساتھ اکھاڑے سے باہر کرنے پر بھی قادر ہوتی ہیں کیونکہ ان کے پاس بے تحاشا سرمایہ اور طاقت ہے۔ مقامی حکومتیں کمزور سیاسی و معاشی حالات اور مسائل کی بدولت ان کو آزادانہ سرگرمیوں کی اجازت دینے اور ان کی طرف سے قوانین کی خلاف ورزی کو برداشت کرنے پر مجبور ہوتی ہیں۔

یہ کمپنیاں اپنی بے تحاشا دولت اور اثر ورسوخ کے باعث ملکوں کے حکومتی اور قانون سازی کے معاملات میں بھی دخیل ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر ادریا مقبول جان اپنے ایک کالم میں کہتے ہیں کہ فرانس میں مسلمان خواتین کے حجاب پر پابندی اور دنیا بھر میں ان کے

سکارف اور پردے کے خلاف نفرت انگیز مہم کے پیچھے بڑی حد تک ان کمپنیوں کا ہاتھ ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اگر دنیا بھر کی مسلمان عورتیں حجاب اور پردے کا ارادہ کرلیں تو ان کمپنیوں کے ہیئر کلر، شیمپو، کنڈیشنر اسپرے وغیرہ کی فروخت کو شدید دھچکا لگتا ہے۔ اوریا مقبول جان کے مطابق ان کمپنیوں کی 80 فیصد مصنوعات بیکار ہو جائیں اگر مسلمان عورت پردے کو اپنا شعار بنا لے۔(1)

غرض یہ کہ ان کمپنیوں نے اپنے معاشی مفادات کے لیے اسلامی معاشروں کی شکل بڑی حد تک تبدیل کر دی ہے۔ سادگی و کفایت شعاری کی جگہ دکھاوا، فضول خرچی، قرض اور کریڈٹ کلچر ہماری زندگیوں کا حصہ بن چکے ہیں۔ صحت مند طرزِ زندگی ختم ہوتا جا رہا ہے۔ بے جا ضرورتوں اور نمائش کی عادت زیادہ محنت کا تقاضا کرتی ہیں جس کی وجہ سے ذہنی و جسمانی تھکن اور بیماریاں بڑھتی جا رہی ہیں۔ مصنوعات کو متعارف کرانے کے لیے خواتین کا بازاری جنس کی حیثیت سے استحصال معاشرتی اقدار کے اسلامی ڈھانچے کو تیزی سے پامال کر رہا ہے۔ اور اس سارے ایجنڈے کی تکمیل کے لیے جو ادارہ ان کمپنیوں کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے وہ ''میڈیا'' کا ادارہ ہے۔

میڈیا عالمگیریت کا ایک اہم ستون ہے۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ عالمگیریت کی پوری عمارت درحقیقت میڈیا اور ذرائع ابلاغ کے ستونوں پر ہی کھڑی ہے اور چونکہ فی زمانہ مغرب اور امریکہ ٹیکنالوجی کے میدان میں اسلامی دنیا سے ناقابل یقین حد تک آگے ہیں لہٰذا ذرائع ابلاغ اور میڈیا پر بھی ان ہی مغربی قوتوں اور ان کی ملٹی نیشنل کمپنیوں کی اجارہ داری ہے۔

اوریا مقبول جان لکھتے ہیں:

''1983ء میں دنیا بھر کا میڈیا 50 کارپوریشنوں کی ملکیت تھا۔ خرید و فروخت

---

(1) اوریا مقبول جان؛ کالم: ''انڈسٹری''؛ حرف راز 1۔؛ ص:157

شروع ہوئی اور 2002ء میں یہ نو کارپوریشنوں کی ملکیت ہو گیا اور 2007ء میں سارے کا سارا میڈیا پانچ کارپوریشنوں نے خرید لیا اور اسی سال جون میں روپوٹ مرڈوچ نے اعلان کیا کہ جلد دنیا کا میڈیا صرف تین کمپنیوں کی ملکیت ہو جائے گا جن میں ایک ان کی ہوگی۔ یہ تین لوگ نوے فیصد میڈیا کے مالک فیصلہ کریں گے کہ کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ"۔ (۱)

میڈیا سے بڑا کوئی ہتھیار شائید ہی استعمار کو اپنی پوری تاریخ میں کبھی ملا ہو۔ نفسیاتی اور ذہنی محاذوں پر کسی قوم کو زیر کر لینا عسکری اور سیاسی قبضے سے زیادہ موثر اور پائیدار قبضہ ہے۔ "پراپیگنڈہ" عصرِ حاضر کے استعماری حربوں میں سب سے زیادہ نتیجہ خیز حربہ ہے۔ اور میڈیا اور پراپیگنڈہ کی اسی طاقت کے ساتھ مغرب آج ایک نہیں بلکہ بیک وقت کئی کئی سطحوں پر اسلام اور مسلمانوں پر حملہ آور ہے۔ اسلام کو خبروں اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے ایک ایسے عقیدے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جس کی تعلیمات مغرب کے اخلاقی نظام سے متصادم ہیں اور جو انسانی حقوق خصوصاً حقوق نسواں کے تصور سے عاری، علم دشمن، پسماندہ اور جاہلیت پر مبنی معاشرے کے قیام کے لیے کوشاں ہے۔ مغربی استعماری طاقتوں نے اپنے میڈیا کے ذریعے اسلام کے متعلق بعینہ وہی پراپیگنڈہ کیا ہے جو فرعون نے حضرت موسیٰؑ کی دعوت کے متعلق کیا تھا کہ یہ لوگ ہماری "مثالی" تہذیب وتمدن کے دشمن ہیں۔ (۲)

ذرائع ابلاغ نے انسانی دنیا میں ایسی نئی اصطلاحات متعارف کروائی ہیں جن کے پیچھے خاص مغربی مفہومات اور تصورات ہی سننے اور دیکھنے والے کے ذہن میں آتے ہیں اور ان کا مقصد صرف اور صرف دنیا کے سامنے اللہ کے دین کو ایک ہوّا بنا کر پیش کرنا ہے۔ مثلاً کسی بھی ملک کا کوئی بھی چینل اپنی کسی خبر میں لفظ "terrorist" استعمال کرے گا

(۱) اوریا مقبول جان؛ کالم: "لوٹ پیچھے کی طرف"؛ حرف راز 4۔؛ ص:39

(۲) طٰہٰ 63:20

تو لامحالہ سننے والے کے ذہن میں پگڑی اور داڑھی والے مسلمان کا تصور ہی ابھرے گا۔ اس کے علاوہ حقوقِ نسواں، انسانی حقوق، آزادیٔ اظہار رائے، مذہبی رواداری، نیو مین ازم، جمہوریت جیسی کئی ایسی اصطلاحات ہیں جو کچھ ایسی ''شاندار'' روایات اور اخلاقیات کی طرف اشارہ کرتی ہیں جن کو دنیا میں متعارف کروانے کا سہرا گویا مغرب کے سر ہی ہے اور ان اعلیٰ اقدار کو چند مٹھی بھر انتہا پسند دہشت گردوں کے ہاتھوں پامال ہونے سے بچانے کے لیے امریکہ سر دھڑ کی بازی لگا رہا ہے۔ عالمی طاقتیں میڈیا کے ہتھیار کو صرف مسلمانوں کے خلاف ہی استعمال نہیں کرتیں بلکہ خود اپنے عوام کی ذہن سازی کے لیے اور ان کے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لیے بھی اسی حربے کا سہارا لیتی ہیں۔

ہیمپٹن یونیورسٹی، ورجینیا سے تعلق رکھنے والے پروفیسر سیٹون جے روز تھل اپنے مضمون ''امریکی خارجہ پالیسی اور مشرقِ وسطیٰ'' میں لکھتے ہیں:

> ''امریکہ میں تمام ذرائع ابلاغ متفقہ طور پر پورے اخلاص کے ساتھ حکومتی پالیسیوں کے مقاصد کے حصول کے لیے کام کرتے ہیں۔ اور مسلسل اس بات کے لیے کوشاں ہیں کہ امریکی عوام کا ایک بڑا حصہ درست معلومات تک رسائی اور ان کی حکومت جو کچھ مشرقِ وسطیٰ اور باقی دنیا میں کر رہی ہے اس کی صحیح نوعیت جاننے سے محروم رہے۔''[1]

نوم چومسکی لکھتے ہیں کہ مغربی پراپیگنڈہ اس قدر طاقتور ہے کہ محض پراپیگنڈہ کے زور پر وہ دنیا میں کہیں بھی اپنے کوئی بھی مقاصد حاصل کر سکتا ہے۔ جہاں چاہے بغاوت کرا دے، جس خطے کا چاہے امن تباہ کر دے پھر دنیا بھر کو جارحیت کا نشانہ بنانے والے مغربی ممالک پراپیگنڈہ کے زور پر خود کو امن کے داعی اور علمبردار بنا کر پیش کرتے ہیں اور

---

[1] روز تھل، سیٹون جے، مضمون: ''امریکی خارجہ پالیسی اور مشرق وسطیٰ''، ص:26

لوگ ان کے اس دعوے پر ایمان بھی لے آتے ہیں۔(۱)

اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہرزہ سرائی صرف مغربی میڈیا ہی کے ذریعے نہیں ہوتی بلکہ خود اسلامی ممالک کے ذرائع ابلاغ بھی دانستہ یا نادانستہ استعماری مقاصد کی تکمیل کر رہے ہیں۔ اس کی ایک اہم وجہ تو یہ ہے کہ دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ کی ملکیت اور کنٹرول اکثر صورتوں میں انہی چند ہاتھوں میں مرتکز ہے اور دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ میڈیا سے وابستہ لوگ اکثر ذہنی ونفسیاتی طور پر خود مغرب سے مرعوب ہیں اور ان کے نزدیک سچ صرف وہی ہے جو مغربی دانشوروں کے قلم یا زبان سے نکلتا ہے۔ ہمارے مقامی میڈیا پر دکھائے جانے والے سیاسی مباحث ہوں یا دینی موضوعات پر نشستیں ہوں، کہیں کوئی مقصدیت یا سنجیدہ کام نظر نہیں آتا بلکہ ہر طرف ایسی بھانت بھانت کی بولیاں سنائی دیتی ہیں جن سے کوئی تعمیری بات کم ہی اخذ کی جا سکتی ہے۔

رینڈ کارپوریشن کی رپورٹوں میں بھی اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ مسلمانوں کے جدیدیت پسند، سیکولر مزاج اور مغرب پرست طبقات کو ان ممالک کے مقامی میڈیا پر زیادہ سے زیادہ اہمیت دی جائے اور میڈیا کے ذریعے انہیں اپنے خیالات ونظریات کی ترویج کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کیے جائیں۔(۲)

آج ہمارے میڈیا کا یہ حال ہے کہ معاشرے میں اللہ کی حدود کو پامال کیا جائے یا کھلم کھلا فحاشی و بے حیائی کے مظاہرے کیے جائیں ان پر کبھی آواز بلند نہیں کی جائیگی لیکن فروعی مسائل اور بے مقصد مباحث پر گھنٹوں گفت وشنید اور مذاکرات پیش کیے جائیں گے۔ جبکہ مغربی میڈیا کی ''غیر جانبداری'' کا عالم یہ ہے کہ کہیں کسی مسلمان خطے پر ناجائز

---

(۱) Noam Chomsky and Andre Vltchek;"On Westren Terrorism";pg:37

(۲) Angel Rabasa,.........;"Building Moderate Muslim Networks";pg:82

اور ظالمانہ قبضہ ہو اور وہاں کے مسلمان اپنی آزادی اور اپنے حق کے لیے عسکری جدوجہد پر مجبور ہو جائیں تو میڈیا ''ظالم'' اور ''مظلوم'' دونوں کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دے گا۔ یوں خبریں دی جائیں گی گویا فریقین میں جنگ یا لڑائی ہو رہی ہے اور ایسے تبصرے اور تجزیے کیے جائیں گے گویا قبضہ کاروں کے خلاف مزاحمت کرنے والے اگر ''شرافت'' کے ساتھ اپنے پاؤں میں بیڑیاں ڈلوا لیتے تو دنیا کا ''امن'' خراب نہ ہوتا۔ اسرائیل کے خلاف فلسطینیوں کی مزاحمت کی خبریں اسی انداز میں دی جاتی ہیں۔

ہٹلر کے نازی وزیر خارجہ گوئبلز کا کہنا تھا کہ جھوٹ اتنا زیادہ بولو اور اتنے تسلسل سے اور زوردار انداز میں بولو کہ سچ اس کے سامنے دب جائے۔(1) آج کی استعماری طاقتیں اور ان کی کثیر الاقوامی کمپنیاں میڈیا کے ذریعے گوئبلز کے اسی اصول پر کاربند ہیں۔ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جھوٹ اتنا زیادہ اور اتنے تسلسل سے بولا گیا ہے کہ ساری دنیا میں اسلام کی اصل تصویر دُھندلا دی گئی ہے۔ پھر اسی میڈیا کے ذریعے کثیر الاقوامی کمپنیوں نے اپنی مصنوعات کو اس طرح عام لوگوں کی بنیادی ضروریات باور کروا دیا ہے کہ سادگی، اعتدال، لحاظ، ایثار اور شرم و حیا کی اقدار کی جگہ نمود و نمائش، اسراف، خود غرضی، بے حیائی اور عریانی ہماری معاشروں میں وباؤں کی طرح پھیلتی جا رہی ہیں۔

ایک اور ادارہ جو ''عالمگیریت'' کے استعماری مقاصد میں اہم کردار ادا کر رہا ہے وہ NGOs پر مشتمل ہے۔ رینڈ کارپوریشن کی سفارشات میں اس بات پر بے حد زور دیا گیا ہے کہ اگر امریکہ مسلمان ممالک کے عوام کی اسلامی سوچ کو بدل کر ''عالمی معیار'' کے مطابق ''اعتدال پسند'' بنانا چاہتا ہے تو اسے چاہیے کہ ان خطوں میں NGOs اور سول سوسائٹیز کو مضبوط کرے۔(2)

---

(1) ایوب بیگ مرزا؛ مضمون: ''جہالت جدیدہ بمقابلہ جہالتِ قدیمہ''؛ ماہنامہ میثاق، لاہور، نومبر 2014؛ ص: 7

(2) Angel Rabasa,......;"Building Moderate Muslim Networks";pg: 48,49

یہاں تک کہ اس رپورٹ میں امریکی حکومت کو خبردار کیا گیا ہے کہ وہ ان NGOsاور سول سوسائٹیز کی امداد اور سرپرستی خفیہ طریقے سے کرے۔(۱) تاکہ مقامی آبادیوں میں ان اداروں کی credibility مشکوک نہ ہو۔

یہ غیر ریاستی تنظیمیں اور سول سوسائٹیز بنیادی طور پر معاشرے میں حقوقِ نسواں اور اقلیتوں کے حقوق کی آڑ میں اسلامی شرعی قوانین اور روایات پر حملہ کرتی ہیں۔ یہ ان کا نظریاتی اور تہذیبی محاذ ہے۔ ان کے علاوہ کچھ NGOs زیر ہدف ممالک کے وسائل کا جائزہ لے کر اپنی رپورٹس مرتب کرتی ہیں۔

یہ این جی اوز حقوق انسانی کے نام پر اسلامی حدود و تعزیرات کا مذاق اڑاتی اور انہیں بے اثر کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر لاہور کی ایک NGO ''شرکت گاہ'' کا سلوگن ہے ''خواتین زیر اثر مسلم قوانین''۔ اس NGO نے اپنے سہ ماہی مجلہ ''خبرنامہ'' جلد اول شمارہ اول 1990 کے صفحہ 20 پر کسی شاعرہ ریحانہ توفیق کی ایک طنزیہ نظم شائع کی۔ یہ نظم سورۂ بقرہ آیت 282 کے تناظر میں لکھی گئی تھی جس میں اللہ تعالیٰ نے لین دین کی تحریر میں دو مرد گواہ یا ایک مرد گواہ اور دو عورتوں کی گواہی کا حکم دیا ہے۔ نظم ''کیوں تیری گواہی آدھی ہے'' کے عنوان سے شائع کی گئی ہے اس کے دو اشعار یوں ہیں:

محبوبِ خدا خود جس سے کہے جنت ہے تیرے قدموں تلے
اے عقل کے اندھو! سوچو ذرا کیا اس کی گواہی آدھی ہے
جس روز پکارے جاؤ گے تم نام سے اپنی ماؤں کے
اس روز انہیں بھی کہہ دینا جا تیری گواہی آدھی ہے(۲)

---

(۱) Angel Rabasa,......;"Building Moderate Muslim Networks";pg 79

(۲) عبدالرشید ارشد؛ ''آخری صلیبی جنگ''؛ ج:1؛ ص:49

ان دو اشعار سے ہی ان NGOs کا ایجنڈا سامنے آجاتا ہے۔ اسلامی معاشروں کی نظریاتی و تہذیبی بیخ کنی کا کام ان کے ہاتھوں سے لیا جارہا ہے اور اس مقصد کے لیے ان تنظیموں کو بھاری مالی امداد مغربی استعماری ممالک سے فراہم کی جارہی ہے۔ یہ NGOs اپنے بے پناہ وسائل اور میڈیا کی مدد سے معاشرے میں اپنا اثر ورسوخ قائم کرتی ہیں پاکستان میں ان این جی اوز کے کردار کے متعلق جناب سلیم منصور خالد لکھتے ہیں:

> ''اگر معاملات کی یہی رفتار رہی اور اہلِ سیاست اور اہلِ اقتدار نے اپنی آنکھوں پر بدستور ذاتی مفادات کی پٹی باندھے رکھی تو اب سے (کچھ) سال بعد کا پاکستان نہ اقبال کا پاکستان ہوگا نہ قائدِ اعظم کا پاکستان....وہ مجبور ومقہور پاکستان این جی اوز کا پاکستان ہوگا جہاں بظاہر چہرے پاکستانیوں کے ہوں گے لیکن دل اور دماغ عالمی این جی اوز مافیا کی گرفت میں ہوں گے۔''[1]

عالمگیریت کا ایک اور اہم ستون عالمی ادارے ہیں۔ بین الاقوامی ادارے مثلاً اقوامِ متحدہ، ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف بھی عالمگیریت کے ذریعے مسلمانوں کے استحصال میں اپنا کردار ادا کررہے ہیں۔ بظاہر ان اداروں کے قیام کا مقصد یہی بتایا جاتا ہے کہ ان کے ذریعے دنیا میں امن وامان، معاشرتی ومعاشی عدل اور انصاف کو ممکن بنایا جائے گا لیکن حقیقت میں یہ ادارے استعماری طاقتوں کے آلۂ کار ہیں جو تیسری دنیا خصوصاً مسلم ممالک کے خلاف کیے جانے والے استعماری اقدامات میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔

گذشتہ سات دہائیوں کی تاریخ گواہ ہے کہ اقوام متحدہ کا ادارہ مسلم ممالک کے مسائل حل کرنے کی بجائے انہیں مزید الجھانے کی پالیسیوں پر گامزن ہے۔ مسئلہ کشمیر ہو یا فلسطین، بوسنیا و چیچنیا کے مظلوم مسلمانوں کی فریاد ہو یا برما و روہنگیا کے مسلمانوں کی درد

---

[1] سلیم منصور خالد، مضمون: ''روشن خیال تعلیم''؛ ماہنامہ ترجمان القرآن، جون 2005ء، منصورہ، لاہور؛ ص: 85

ناک صورتحال، اقوامِ متحدہ ٹس سے مس نہیں ہوتی۔ مظلوم مسلمانوں کے حق میں صرف زبانی جمع خرچ اور قرار دادیں جبکہ مشرقی تیمور کے عیسائیوں کا مسئلہ ہو تو اسے فوراً آزادی دلوا کر یو این او کا ممبر بھی بنالیا جاتا ہے۔ جن مسلم خطوں میں مسلمان ظلم کی چکی میں پس پس کر آخر خود ہی جہادی وعسکری کاروائیوں پر اتر آئیں ان کے لیے فوراً امن مذاکرات کا ڈول ڈال دیا جاتا ہے یا امن فوج بھیج کر ''جنگ بندی'' کروادی جاتی ہے۔

مسلم اور تیسری دنیا کے ممالک عالمی مالیاتی اداروں کے شکنجوں میں بھی بری طرح جکڑے ہوئے ہیں۔ استعماری طاقتیں ان ممالک میں معاشی بحران برپا کرواتی ہیں، پھر یہ ممالک ان طاقتوں کی امداد اور قرضے حاصل کر کے ان کے احسان مند ہوتے ہیں، پھر سود در سود کے گرداب میں پھنس کر ملک کی معیشت بد سے بدتر ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ ادارے اپنے قرضوں اور سود کی اقساط کے بدلے حکومتوں سے من مانی شرائط بھی منواتے ہیں، عوام پر بھاری ٹیکس بھی عائد ہوتے ہیں پھر زیادہ تر اس امداد اور قرضوں کے ذریعے قرض مہیا کرنے والے ممالک کی مصنوعات ہی کی خریداری کی جاتی ہے۔ یوں ایک دائرۂ سو ہے جس میں سے نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ عصرِ حاضر کے یہ عالمی مالیاتی استعماری ادارے تیسری دنیا کے ممالک کو جس طرح اپنے شکنجے میں کستے ہیں اس متعلق Kwame Nkrumah لکھتے ہیں کہ عالمی مالیاتی ادارے مثلاً آئی ایم ایف یا ورلڈ بینک کسی ملک کو aid فراہم کرتے ہیں تو ان سے ذلت آمیز شرائط منواتے ہیں مثلاً:

" ....the conclusion of commerce and navigation treaties,..right to meddle in internal finances..... to lower trade barriers in favour of the doner country's goods and capitals.... determination of how the funds are to be used..... to supply raw materials to the doner; and use of such funds to buy goods from the donor

nation. These conditions apply to industry, commerce, agriculture, shipping and insurance, apart from others which are political and military."①

(جن ممالک کو امداد فراہم کی جارہی ہے ان کے تجارتی، داخلی و معاشی معاملات میں امداد دینے والے ممالک کی دخل اندازی ہوتی ہے۔ امداد فراہم کرنے والے ملک کے لیے تجارتی و کاروباری مفادات کا حصول یقینی بنایا جاتا ہے۔ یہ امداد کہاں اور کیسے استعمال ہوگی اس کا فیصلہ بھی یہ ادارے کریں گے۔ امداد دینے والے ملک کو امداد لینے والا ملک خام مال بھی فراہم کرے گا اور امدادی رقوم کا بڑا حصہ مدد فراہم کرنے والے ملک کی مصنوعات خریدنے کے لیے استعمال کرے گا۔ یہ تمام شرائط صنعت وحرفت، تجارت، زراعت، جہاز رانی اور انشورنس کے معاملات کے علاوہ دیگر شعبوں میں بھی لاگو ہوں گی اور سیاسی اور عسکری شعبوں میں بھی۔)

تیسری دنیا کے ممالک کا ہر شعبے میں استحصال کرنے والی ان عالمی مالیاتی ایجنسیوں اور اداروں کی پشت پر ریاستہائے متحدہ امریکہ کا ہی سرمایہ ہی کام کر رہا ہوتا ہے۔②

یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ جدید دور میں استعمار کے تمام تر حربوں کے لیے جو عنصر بنیادی ''پاور پلانٹ'' کا کام کر رہا ہے وہ یہی عالمگیریت کا عنصر ہے۔ میڈیا اور عالمی و بین الاقوامی ادارے اور ایجنسیاں استعمار کے دیگر تمام حربوں کو روبہ عمل لانے اور کامیاب بنانے میں نہایت فعال کردار ادا کرتی ہیں۔ پروفیسر خورشید احمد اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ عالمگیریت جس پر امریکی اور یورپی قوتوں کی چھاپ نمایاں ہے آج انتہائی طاقتور قوموں کی جانب سے دنیا کے نظام کو نئی شکل میں ڈھالنے کے لیے بنیادی ڈھانچے کے طور پر

①Kwame Nkrumah; "Neo-Colonialism.....";pg:243

② سلیم منصور خالد؛مضمون:''روشن خیال تعلیم''؛ص:242

سرگرم عمل ہے۔①

6۔توہینِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم:

جب سے اسلام کی روشنی عرب کی سرحدوں سے نکلی ہے اور اسلام اور عیسائیت کا آمنا سامنا ہوا ہے اس وقت سے عیسائیت اور یورپ نے اسلام کے خلاف اپنی جنگ کا مرکز اور ہدف نبی اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی ذات کو اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کو بنا رکھا ہے۔

اسلام کے ابتدائی سالوں میں دمشق سے تعلق رکھنے والے سینٹ جان (م ۷۵۳ء) اور خلیفہ مامون کے ایک عیسائی درباری ابن اسحٰق عبدالمسیح الکندی (م ۸۰۷ء) نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ اقدس پر الزامات لگا کر اپنے دل کا بغض نکالا اور انہی دونوں کی غلیظ تصنیفات نے آگے آنے والی صدیوں میں متعصب عیسائی پادریوں اور دانشوروں کی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف ہرزہ سرائی کے لیے مواد اور بنیاد فراہم کی۔② آج بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ گرامی مغرب کے حملوں کا ایک بڑا ہدف ہے۔ بلکہ اب اس میں اور زیادہ تیزی اور شدت آ گئی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ آج مسلمانوں کے خلاف عیسائیوں کی دشمنی کی نوعیت میں کچھ مزید عناصر کا اضافہ ہو گیا ہے۔

اسلام کے شروع کے ادوار میں جب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام لیواؤں نے دیکھتے ہی دیکھتے دنیا کے ایک بڑے حصے پر اسلامی فتوحات کے جھنڈے لہرائے تو ان کے مفتوحہ خطوں میں کئی ایسے تھے جو عیسائیت کے گڑھ تھے مثلاً فلسطین، مصر، شام، لیبیا، تیونس اور الجیریا۔ یہ علاقے نہ صرف جغرافیائی طور پر مسلمانوں کے زیرِ حکومت آئے بلکہ آبادیوں کی آبادیاں دلی رضا و رغبت کے ساتھ رسولِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عربی کے لائے ہوئے پیغام پر ایمان لے آئیں۔ غلامانِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی بے سروسامانی اور قلت کے باوجود جس طرح عیسائی

① پروفیسر خورشید احمد؛ مجلۃ: ''مغرب اور اسلام''؛ رسالہ:34، 2010؛ ص:16 (تعارف)

② خرم مراد؛ ''مغرب اور عالمِ اسلام''؛ ص:14-13

سطوت و سلطنت کو زیر کر لینے میں کامیاب ہوئے اس پر مسیحی پادری و علماء متحیر، شکست خوردہ اور غیض و غضب کا شکار تھے۔ انہوں نے جب مسلمانوں کی ان غیر معمولی کامیابیوں کی توجیہہ تلاش کرنی چاہی تو ان کو یہی نظر آیا کہ ان صحرا نشینوں کی قوت کا راز نبی ﷺ کی رسالت پر غیر متزلزل ایمان اور آپ کی ذات سے والہانہ محبت، عقیدت اور وابستگی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنا سارا زور یہ ثابت کرنے میں لگا دیا کہ (نعوذ باللہ) حضور ﷺ کا دعویٰ صداقت پر مبنی نہیں اور قرآن آپ ﷺ کی تصنیف ہے جو آپ ﷺ نے یہودیوں اور عیسائیوں کی مذہبی کتابوں سے مختلف مضامین لے کر ترتیب دی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے آپ ﷺ کے ذاتی کردار پر انتہائی رکیک الزامات لگائے۔

عیسائی علماء اور دانشوروں کی ان مذموم کوششوں کے باوجود بھی جب نبی ﷺ کے جانثاروں کی تعداد میں اضافہ ہی ہوتا رہا اور ہزار سال تک مسلمانوں کے عروج کا سورج نصف النہار پر چمکتا رہا تو ان کے بغض میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ استعمار کے اولین دور میں اس کے باوجود کہ مسلم امت ان گنت اندرونی کمزوریوں کا شکار ہو چکی تھی، قبضہ کاروں کو مسلمانوں کی طرف سے جتنی شدید مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑا اس نے ان پر واضح کر دیا کہ صدیوں پہلے ان کے نبی ﷺ کے سکھائے ہوئے سبق ابھی بھی ان کے ذہنوں سے محو نہیں ہوئے۔ عام مسلمان ابھی بھی کفر کا غلام بننے سے زیادہ لڑ کر جان دے دینے کو بہتر سمجھتا ہے۔ اپنے پیغمبر ﷺ کی محبت کا وہ سرچشمہ ابھی بھی خشک نہیں ہوا جہاں سے مسلمانوں کے جذبۂ حریت اور جرأت کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ پھر عصرِ حاضر میں تو جدید استعمار کے تمام تر مادی اور نفسیاتی حربوں کے باوجود آج بھی عام مسلمان نے اپنا تعلق کسی نہ کسی درجے میں اپنے نبی صلی اللہ علیہ والہ وسلم سے جوڑ کر رکھا ہوا ہے۔ اسی لیے آج مغرب نے پیغمبر ﷺ اسلام کی شان میں گستاخیوں اور شرارتوں کا ایک نیا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔

ڈنمارک، سویڈن، فرانس اور دنیا کے دیگر یورپی ممالک میں شائع ہونے والے توہین آمیز خاکوں اور نبی ﷺ کی ذات پر بنائی جانے والی پراپیگنڈہ فلموں کے پس منظر میں ایک مخصوص استعماری ذہنیت کارفرما ہے جس سے کئی مقاصد کا حصول مقصود ہے۔ سب سے پہلا مقصد تو یہی ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں ان کے پیغمبر ﷺ کی عظمت کو گھٹایا جائے۔ لیکن اس ضمن میں مغرب انشاء اللہ منہ کی کھائے گا کیونکہ کمزور سے کمزور عقیدے اور کم سے کم دینی علم رکھنے والا مسلمان بھی آپ ﷺ کی شان میں گستاخی کو اپنی غیرت پر حملہ تصور کرتا ہے۔

مغرب کا ایک اور مقصد یہ بھی ہے کہ جس رفتار سے خود مغرب میں اسلام مقبول ہوتا جا رہا ہے اور آئے روز اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد بڑھ رہی ہے اس سے نپٹنے کے لیے اپنے عوام کے دل و دماغ میں پیغمبر ﷺ اسلام کے خلاف (نعوذ باللہ) حقارت اور غیر سنجیدگی کے جذبات کو فروغ دیا جائے۔ کیلیفورنیا سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر رابرٹ موری (Robert A. Morey) کی اسلام کے خلاف لکھی جانے والی کتاب (Islamic Invasion) کی تشہیری مہم میں اس کے پبلشر لکھتے ہیں کہ اسلام دنیا میں تیزی کے ساتھ پھیل رہا ہے۔ اس کے آگے بند باندھنے اور مسلمانوں کو عیسائی بنانے کے لیے ضروری ہے کہ مسلمانوں کے دین کی بنیادوں کو ہلا دیا جائے اور اسلام کے تین بنیادی عقائید کے پرخچے اڑا دیے جائیں اور دنیا کو باور کرایا جائے کہ

1۔ اللہ انجیل کا خدا نہیں ہے۔

2۔ محمد ﷺ خدا کے رسول نہیں تھے۔

3۔ قرآن کلامِ الٰہی نہیں۔[1]

لہٰذا نبی ﷺ کی ذات پر مغرب کے رکیک حملے اور قرآن کو نبی ﷺ کی

---

[1] ڈاکٹر سعید احمد ملک: ''خونِ مسلم ارزاں ہے''، جاوید پبلشرز، لاہور، مئی 2003ء، ص: 225

تصنیف ثابت کرنے کی کوشش درحقیقت مغرب کے اس خوف کا آشکار کرتی ہیں جو انہیں اسلام کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے باعث لاحق ہے۔

مغرب کی ایک کوشش یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کے جذبات کو مشتعل کر کے انہیں متشدد کارروائیوں پر ابھارا جائے۔ نیز یہ بھی ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ کسی بھی برائی کو بار بار دہرایا جائے تو آہستہ آہستہ اس کے ''برائی'' ہونے یا قابل اعتراض ہونے کا تصور معدوم ہو جاتا ہے۔ ان گستاخانہ جسارتوں کو وقتاً فوقتاً دہرانے میں ایک یہ مقصد بھی پوشیدہ ہے۔ اور پھر سب سے اہم مقصد تو وہی قدیم مقصد ہے کہ آپ ﷺ کی سچائی اور دعویٰ نبوت کے برحق ہونے کو ہی مشکوک ٹھہرا دیا جائے تاکہ آپ ﷺ کی سنت کی اِتباع کا جذبہ مسلمانوں میں سرد پڑ جائے۔

توہینِ رسالت کے قوانین پر مغربی ممالک کا اعتراض اور شور شرابہ بھی اسی مقصد کے لیے ہے تاکہ مسلمانوں کو ایک ''پسماندہ'' اور ''وحشی'' قوم ثابت کیا جائے اور یہ ثابت کیا جائے کہ مسلمان اور اسلام آزادیٔ اظہار رائے کے خلاف ہیں۔ لیکن مغرب کی ''آزادی اظہارِ رائے'' کی اعلیٰ اقدار اس وقت مضحکہ خیز نظر آتی ہیں جب خود مغرب میں ہی یہودیوں کے جذبات کو ''ٹھیس پہنچانا'' ایک قابل سزا جرم بن جاتا ہے اور جب مغربی میڈیا اسلامی ممالک پر لگنے والی پابندیوں اور برسنے والے بموں کے نتیجے میں روتے، سسکتے مسلمان مردوں عورتوں اور بچوں سے ''صرفِ نظر'' کر لیتا ہے۔

غرض یہ کہ ''آزادیٔ اظہار رائے'' کے ''حق'' کا استعمال کرتے ہوئے دنیا کے ڈیڑھ ارب باشندوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچانا اور دنیا کی سب سے محترم اور مقدس ہستی کو استہزاء کا نشانہ بنانا، یہ آج کے استعمار کا ایک بے حد سوچا سمجھا منصوبہ ہے۔ یہ ان کے خبثِ باطن کا اظہار ہے۔ جس تہذیب کے ساتھ تصادم کے خوف نے مغرب کی نیندیں حرام کر رکھی ہیں اس تہذیب کا سرچشمہ نبی آخر الزماں ﷺ کی تعلیمات ہی ہیں۔ اسی لیے آپ ﷺ

کی ذات مبارکہ کے خلاف آج کی باطل تہذیب کے علمبرداروں کا بغض چھپائے نہیں چھپتا۔

7۔ مغرب پرست مسلمان دانشور:

مغربی استعمار کی خوش قسمتی کہ ہمارے ہاں ''دانشوروں'' کا ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو اسلام اور مسلمانوں سے زیادہ مغرب اور امریکہ کا خیر خواہ ہے۔ یہ وہ طبقہ ہے جو قرآن و سنت سے اسلامی عقیدہ پڑھے اور سمجھے بغیر اور اس کی روشنی میں یہود و نصاریٰ کا اصل چہرہ دیکھے اور سمجھے بغیر اور پھر اپنی تاریخ کو عین قرآنی نظر سے پڑھے بغیر محض مغرب کی مادی ترقی اور مصنوعی چمک دمک کو دیکھ کر ہی مرعوب ہو گیا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی تحریروں، تقریروں اور بیانات کے ذریعے مغرب کے استعماری مقاصد کو پورا کرتے ہیں۔ ہر مسلمان ملک کے اندر استعمار کو ڈھیروں کے حساب سے ایسے دانشور دستیاب ہو جاتے ہیں جو بڑے خلوص کے ساتھ اپنی قوم کو یہ سبق پڑھاتے ہیں کہ مذہب کو ''دین'' سمجھنے کے زمانے لد گئے۔ اب ترقی خوشحالی اور کامیابی کے لیے آسمان کی طرف نہیں بلکہ مغرب کی طرف دیکھنا ضروری ہے۔

نبی ﷺ نے قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ بیان فرمائی تھی کہ جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ بتایا جائے گا اور ''رویبضہ'' بات کریں گے۔ آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ ''رویبضہ'' کون ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا ''گھٹیا لوگ جو لوگوں کے اہم معاملات پر بولا کریں گے''۔ (1)

ایسے دانشور ہمیں سیاسی، علمی اور مذہبی ہر سطح پر نظر آئیں گے۔ کبھی نظامِ خلافت کے مقابلے میں جمہوریت اور قومیت کے راگ الاپتے ہوئے اور کبھی عقیدۂ الولاء والبراء

---

(1) ابنِ ماجہ، ابی عبداللہ محمد بن یزید القزوینی، حافظ؛ ''سنن ابنِ ماجہ''؛ کتاب الفتن، باب: شدۃ الزمان

کے خلاف مذہبی ہم آہنگی اور رواداری کو اپنی مرضی کے معنی پہناتے ہوئے۔ ان ہی دانشوروں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو مغربی استعمار کے خلاف جدوجہد کرنے والوں کو ناعاقبت اندیش قرار دیتے ہوئے زمینی حقائق کا سبق پڑھاتے ہیں اور مغرب کی آواز سے آواز ملاتے ہوئے ان باغیرت حریت پسندوں کو 'انتہاء پسند' یا 'دہشت گرد' قرار دیتے ہیں۔

مذہبی سطح پر بھی ایک پورا منظم گروہ ہے جس نے بڑے علمی انداز میں اسلام کے فقہی ورثے پر ہاتھ ڈالنے کی جسارت کی ہے۔ ان میں ایک بڑا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو منکرینِ حدیث کہلاتے ہیں۔ برصغیر میں سب سے پہلے تشکیک فی الحدیث کی آواز بلند کرنے والے سر سید احمد خان تھے۔[1] ان کے بعد غلام احمد پرویز نے اس فتنے کی آبیاری کی اور حدیث وسنت کو قانون اسلامی کا مصدر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔[2] اور یوں منکرینِ حدیث کا گروہ پیدا ہوا۔ جنہوں نے صدیوں کے اسلامی فقہی سرمائے کو بے مول کرنے کی کوشش کی۔

مغربی استعمار کے ہاتھ مضبوط کرنے والا یہ دانش ور گروہ استعمار کے ہر دور میں موجود رہا ہے۔ اور انہیں استعمار کی مدد اور سرپرستی حاصل رہی ہے۔ برصغیر پر انگریز کے قبضے کے دور میں قادیانی فتنہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی جب مرزا غلام احمد نے جہاد کو متروک قرار دے کر گویا بیرونی استعمار کے خلاف کسی بھی مزاحمت کو روک دینے کی کوشش کی۔ آج بھی ذرائع ابلاغ پر اپنے علم ودانش اور فہم وبصیرت کے موتی بکھیرتے ہوئے یہ حضرات کبھی سودی نظام کے حق میں علمی دلیلیں دیتے ہیں اور کبھی اسلامی حدود اور تعزیرات پر انگلیاں اٹھاتے ہیں اور دین، قرآن اور حدیث سیکھنے اور سکھانے والے مدارس کو دہشت گردی کے

---

[1] مریم خنساء: ''مسلمانوں کا فکری اغواء''، ص: 53

[2] ایضاً

گڑھ قرار دیتے ہیں۔

ان سب سے بڑھ کر وہ لوگ ہیں جو مسلمان گھرانوں میں پیدا ہو کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر کیچڑ اُچھال کر مغربی ایجنڈے کو پورا کرتے ہیں مثلاً بھارتی نژاد شاتم رسول سلمان رشدی اور بنگالی نژاد تسلیمہ نسرین جن کو پیغمبر اسلام اور دین توحید کے خلاف ہرزہ سرائی کرنے پر مغرب نے سر آنکھوں پر بٹھایا ہوا ہے۔

کسی معاشرے کے ایسے دانشور حضرات جو اپنے علمی، تہذیبی، سیاسی یا مذہبی ورثے سے متعلق سوالات اٹھا کر تشکیک پیدا کریں اور یوں دانستہ یا نادانستہ طور پر امریکی ایجنڈے کی تکمیل میں مدد کریں انہیں رینڈ کارپوریشن کی رپورٹ میں Reformers کا نام دیا گیا ہے۔(۱) رپورٹ میں امریکہ کو اسلامی معاشروں کے ان Reformers کی مدد کرنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کا مشورہ دیا گیا ہے۔(۲)

اُمت کی ایک بہت بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ ان ہی مغرب پرست ''دانشوروں'' میں نام نہاد علماء کا ایک طبقہ بھی شامل ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی موجودہ تباہ حالی کی ایک علت حقیقی جو تمام علل و اسباب پر حاوی ہو وہ یہی ہے کہ ''علماء حق و مرشدین و صادقین کا فقدان اور علماء سوء مفسدین دجالین کی کثرت''۔(۳)

ایسے علماء سوء آج بہت ملیں گے جو چند دنیاوی مفادات کی خاطر کتمانِ حق کے مرتکب بھی ہوتے ہیں اور اللہ کی آیات کی ایسی تاویلات کرتے ہیں جو سراسر اسلام دشمنوں کو ہی فائدہ پہنچاتی ہیں۔ عبدالمنعم مصطفی کی تالیف ''طاغوت'' کے ناشر لکھتے ہیں:

''افسوس کہ آج علمائے سوء کا غلبہ ہے۔ یہ علماء سوء ان طواغیت کا دفاع کر رہے ہیں

(۱) Angel Rabasa,.......;"Building Moderate Muslim Networks"; pg:32

(۲) // // //pg:53

(۳) مولانا ابوالکلام آزاد: بحوالہ: ہفت روزہ ندائے خلافت، 16 تا 22 ستمبر 2014؛ ص:1

جو مسلمانوں سے ایسی جنگ کرتے ہیں جس میں وہ اسلام اور اہل اسلام کے لئے ذرا بھی نرمی نہیں رکھتے اور وہ علماء حقہ کو قتل کرتے، داعیانِ حق کو پھانسی دیتے اور توحید پر ثابت قدم رہنے والے نوجوانوں کو تاریک کوٹھریوں میں قید کر کے بدترین تشدد کرتے ہیں اور یہ علماء سو علمائے حقہ کو توحید اور حاکمیتِ الٰہی کی دعوت دینے پر بے وقوف، خارجی، تکفیری اور گمراہ قرار دے رہے ہیں''۔ [1]

8۔ اسلامی قوانین اور معاشرتی اقدار پر حملہ:

عصرِ حاضر کے استعمار نے اسلامی قوانین اور اسلامی معاشرتی اقدار کو مسلسل اپنے تنقیدی حملوں کا ہدف بنا رکھا ہے۔ اس کی ایک اہم وجہ تو یہ ہے کہ یہ قوانین اور اقدار مغرب کے استعماری اور طاغوتی ایجنڈے کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہیں۔ مغرب کی تمام تر کوششوں اور محنتوں کے باوجود وہ اسلامی معاشروں کو مکمل طور پر اپنی خدا بیزار اور مادر پدر آزاد تہذیب کے رنگ میں نہیں رنگ سکا اور اس کا ذمہ دار وہ ان ہی اسلامی قوانین اور معاشرتی اقدار کو سمجھتا ہے۔ گو اب یہ قوانین اپنی مکمل شکل اور اصل روح کے ساتھ کسی جگہ نافذ ہیں اور نہ ہی اسلام کی معاشرتی اقدار کو اب پہلے جیسی بلند حیثیت حاصل رہی ہے لیکن صدیوں تک اسلامی سلطنت میں ان کا نفاذ کسی نہ کسی حد تک رہا ہے جس کے نتیجے میں مسلمان معاشروں کے لاشعور میں ہی کچھ ایسے ''افعال و اعمال'' کی کراہت بیٹھ چکی ہے کہ مغرب کے لاکھ سر پٹخنے کے باوجود ہماری ''روشن خیالی'' کچھ بنیادی حدود کو پار کرنے کے لیے تیار نہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ عالمِ اسلام میں وقتاً فوقتاً کچھ ایسی سوچیں یا تحریکیں سر اٹھاتی رہتی ہیں جن کی کوششوں کا مقصد و محور یہی ہوتا ہے کہ اسلامی ممالک میں مکمل شرعی نظام کا نفاذ کیا

---

[1] سید ابو ابراد عبد السلام انبالوی؛ عرضِ ناشر، کتاب: ''طاغوت''؛ منبر التوحید و السنۃ، لاہور، 2010؛ ص:8

جائے۔ اگر ان لوگوں کی کوششیں رنگ لے آتی ہیں تو نہ صرف ایسے مسلمان خطے مغرب کی غلامی کا جوا اتار پھینکیں گے بلکہ باقی دنیا بھی اپنی آنکھوں سے اسلامی قوانین اور شرعی نظام کی برکات کا مشاہدہ کر کے مغرب کی بجائے اسلام کے دامن میں اپنے مسائل کا حل تلاش کرے گی۔

ڈاکٹر حافظ محمد زبیر لکھتے ہیں:

''بلاشبہ مغرب میں موجود قانون کی جمیع اقسام اور صورتوں کا مصدر رومی قانون (Roman Law) ہے جبکہ مشرق میں اسلامی قانون کو ایک بنیادی ماخذ کی حیثیت حاصل رہی ہے، جس کی وجہ سے مغرب اسلامی قانون کو اپنا حریف خیال کرتا ہے۔ پس مستشرقین کی ایک جماعت نے اسلامی قانون کو خاص طور پر اپنی تحقیقات کا موضوع بنایا تا کہ اس کے بارے میں تشکیک و شبہات وارد کر کے اس کی اہمیت کو کم کر سکیں۔'' [1]

ساتھ ہی ساتھ ایک اور اہم خطرہ یہ بھی ہے کہ اسلامی شریعت اور قوانین واضح طور پر مسلمانوں کو یہود و نصاریٰ سے دوستی نہ کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ قرآن یہود و نصاریٰ مشرکین اور منافقین کے پول اور چالوں کی حقیقت کھول کھول کر مسلمانوں کے سامنے رکھتا ہے سو مسلمان اگر اپنے دین کے ان بنیادی مصادر کی طرف پلٹ آتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ دشمن کے بچھائے ہوئے جال میں پھنسنے سے انکار کرتے ہیں۔

لہٰذا ان خطرات سے نپٹنے کے لیے مغرب نے یہ لائحہ عمل اپنایا ہے کہ ایک طرف تو اسلامی اور شرعی قوانین کے مصادر ''قرآن'' ''اور سنت'' پر حملہ کیا جائے، قرآن کو الہامی کتاب کی جگہ (نعوذ باللہ) محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی اپنی تصنیف ثابت کیا جائے اور

[1] حافظ ڈاکٹر محمد زبیر؛ مضمون: ''فقہ اسلامی اور مستشرقین''؛ سہ ماہی: حکمت قرآن، لاہور، جولائی۔ ستمبر 2014؛ ص:67

آپ ﷺ کی نبوت و رسالت کو مشکوک ٹھہرایا جائے نیز ذخیرۂ احادیث کی صحت سے متعلق عام مسلمان کو شکوک و شبہات میں مبتلا کرنے کے ساتھ ساتھ سرے سے حدیث اور سنت رسول ﷺ کی ضرورت سے ہی انکار کا رویہ اپنانے کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

اسلامی مصادر سے متعلق تشکیک کا بیج بونے کے علاوہ مغرب کا ایک اور حربہ یہ ہے کہ اسلامی قوانین اور معاشرتی اقدار کو ظالمانہ، وحشیانہ اور پسماندہ ثابت کیا جائے۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے ایک طویل عرصے سے استشراق کا ایک پورا گروہ ہے جو سرگرم عمل ہے اور اب میڈیا کی طاقت کا سہارا لے کر اسلامی قوانین کے خلاف ایک پوری پراپیگنڈہ مہم چلائی جا رہی ہے۔

اسلامی قوانین کے اولین مصدر "قرآن حکیم" سے متعلق مستشرقین کی کوشش ہے کہ اقوامِ عالم کے سامنے قرآن کا لٹریچر ایسی شکل میں پیش کیا جائے کہ وہ اس کے متعلق تذبذب کا شکار ہو جائیں مثلاً ایک مشہور مستشرق منٹگمری واٹ اپنی کتاب میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ قرآن کریم انسانی ذہن کی اختراع ہے اور کلام الٰہی نہیں ہے۔ (1)

رینڈ رپورٹ 2003 میں بھی مصنفہ نے "دعویٰ" کیا ہے کہ چونکہ قرآن کو نبی ﷺ کی وفات کے بعد مصحف کی شکل دی گئی تھی لہٰذا:

"...It is widely accepted that at least two suras were lost in that process . Modernists point out that some may also have been falsely or inaccurately recorded. (2)

(یہ عام طور پر تسلیم شدہ ہے کہ کم سے کم دو سورتیں اس سارے عمل [تدوین

(1) Mantgomery Watt; "Muhammad: Prophet and Statesman"; Oxford University Press, Oxford,1961;pg:17

(2) Cheryl Benard; "Civil Democratic Islam......."; pg:24

قرآن] کے دوران گم ہوگئی تھیں۔[مسلمانوں کے] ماڈرن طبقات کہتے ہیں کہ قرآن میں کچھ جھوٹی اور غلط [سورتوں کا] شامل کر دیا جانا بعداز قیاس نہیں ہے۔)

انا للہ و انا الیہ راجعون

اسی طرح اسلامی قوانین کے دوسرے عظیم مصدر "سنتِ رسول ﷺ" کے متعلق تشکیک پھیلانا بھی مغربی ایجنڈے کا حصہ ہے۔

ایک مغربی مستشرق جوزف شاخت لکھتا ہے۔:

"We shall not meet any lagal tradition from the prophet which can be considered authentic."[1]

(فقہی مسائل سے متعلق ہمیں پیغمبر سے کوئی ایک بھی ایسی حدیث نہیں ملی جسے ہم صحیح حدیث قرار دے سکیں۔)

اسی طرح رینڈ رپورٹ 2003 میں کہا گیا ہے:

"......objectively speaking, there is little doubt that hadith is at best a dubious, flawed instrument."[2]

(غیر جانبداری سے جائزہ لیں تو اس میں کوئی شک نہیں کہ 'حدیث' ایک مشکوک اور ناقص ذریعۂ قانون سازی ہے۔)

اسی رینڈ رپورٹ کی مصنفہ آگے جا کر یہ سفارش یا مشورہ پیش کرتی ہیں کہ مسلمانوں کے وہ طبقات جو باہمی رواداری، اخوتِ انسانی اور جمہوری روایات پر مشتمل معاشروں کی تعمیر کے خواہاں ہیں لیکن 'اسلام' ان کی راہ میں "رکاوٹ" ڈالتا ہے ایسے طبقات کی مدد کے لیے مغرب کو چاہیے کہ حدیث کو بے اثر کرنے کے لیے اقدامات

---

[1] Joseph Schacht; " Origins of Muhammadan Jurisprudence"; Oxford University Press, London,1967;pg:149

[2] Cheryl Benard; "Civil Democratic Islam......."; pg:51

کرے۔① اسی رپورٹ میں قانونِ ''حد'' کو بھی نشانہ بنایا گیا ہے اور اسے ایک ''غیر مہذب'' سزا قرار دے کر شرعی قوانین کا تمسخر اڑایا گیا ہے۔② ''حجاب'' کے متعلق اس رپورٹ میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ حجاب کا حکم عام مسلمان عورتوں کے لیے قرآن سے ثابت نہیں ہے اور یہ حکم صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کے لیے مخصوص تھا۔③ حالانکہ قرآن کی آیات اس ضمن میں واضح ہیں کہ پردے کے احکامات تمام مومنات کے لیے اتارے گئے ہیں۔④ مرد کے لیے چار شادیوں کی اجازت پر بحث کرتے ہوئے اس رپورٹ میں سوال اٹھایا گیا ہے کہ جن وجوہات کی بنا پر مرد کو چار شادیوں کی اجازت دی گئی ہے ان ہی وجوہات کی بنا پر عورتوں کو ایک سے زیادہ شوہروں کی اجازت کیوں نہیں دی جا سکتی۔⑤

اسلام کے احکامات و قوانین کے ساتھ ساتھ اسلام کی معاشرتی اقدار کو بھی بین الاقوامی سطح پر ہدف بنایا گیا ہے۔ ۱۹۹۴ء میں قاہرہ میں منعقد ہونے والی بہبود آبادی کانفرنس، ۱۹۹۵ء میں بیجنگ کانفرنس اور جون ۲۰۰۰ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے تحت منعقد ہونے والی بیجنگ پلس فائیو کانفرنس ان سب کا ایجنڈہ اور مقصد یہی تھا کہ شرم وحیا، عفت و عصمت اور خاندانی نظام کے تصورات کو ختم کیا جائے۔⑥

ان تمام کوششوں اور اقدامات کا مقصد یہی ہے کہ اسلامی قوانین اور اقدار کو ''غیر مہذب'' اور ''پسماندہ'' ثابت کیا جائے۔ مسلمانوں کو ان کے عقائید اور فقہی مسلمات سے

---

① Cheryl Benard: "Civil Democratic Islam.......”; pg:54

② // // // pg:19

③ // // // pg:21

④ الاحزاب 55:33

⑤ Cheryl Benard; "Civil Democratic Islam.......'; pg:17

⑥ ڈاکٹر اسرار احمد: ''موجودہ عالمی حالات کے تناظر میں اسلام اور پاکستان کا مستقبل''؛ مکتبہ خدام القرآن لاہور، نومبر 2013: ص:17

برگشتہ کیا جائے۔ مغرب کا فلسفہ یہی ہے کہ آج کے جدید دور کا انسان اتنا ''باعلم''، ''بااختیار'' اور ''ترقی یافتہ'' ہو گیا ہے کہ اب اپنے معاملات اور فیصلوں کے لیے اسے آسمانی راہنمائی کی ضرورت نہیں رہی اور یہ کہ اس جدید دور میں بھی جو شخص اور معاشرے اپنے اصول و قوانین کے لیے مابعد الطبعیاتی ذرائع کی طرف رجوع کریں تو یہ ان کی جہالت اور پسماندگی کی علامت ہے۔ لیکن یہ امت مسلمہ پر اللہ کا ایک بہت بڑا کرم ہے کہ اس نے ہمارے اندر ایسے علماء پیدا فرمائے جنہوں نے مستشرقین کے پراپیگنڈے کا منہ توڑ جواب دیا اور مسلمانوں کو اپنے دین کے ساتھ جوڑ کر رکھا۔

9۔ حرث ونسل کی تباہی:

قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ ایک ایسے گروہ کا ذکر فرماتے ہیں جن کی باتیں دنیاوی لحاظ سے بڑی متاثر کن محسوس ہوتی ہیں لیکن درحقیقت وہ ایسے مفسد لوگ ہیں کہ اگر انہیں دنیا میں طاقت اور اقتدار میسر ہو جائے تو وہ کھیتیاں اور نسلیں تک برباد کر دیتے ہیں۔[1] قرآن کی یہ مثال عصرِ حاضر کی استعماری طاقتوں کی مکمل تصویر کشی کرتی ہے۔ ان استعماری طاقتوں کے دعوے، نعرے اور سلوگن بھی بڑے ہی خوش کن نظر آتے ہیں کہ وہ دنیا میں ''جمہوریت''، ''امن'' اور ''علم'' کا فروغ چاہتے ہیں، قرآن کے الفاظ میں ان طاقتوں کے دعوے کا بیان کیا جائے تو وہ ہے ''نحن مصلحون''۔[2] لیکن ان کے دعووں کی قلعی کھل جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ کس طرح سے دنیا میں حرث ونسل کی تباہی کا سامان کر رہے ہیں۔

کاروبارِ دنیا کے تسلسل کے ضمن میں قدرت نے ایک مکمل اور جامع نظام ترتیب دے رکھا ہے۔ ایک بیج سے نکلنے والا پودا اور کئی پودوں کے لیے بیج فراہم کرتا ہے۔ اسی طرح

---

[1] البقرہ205:2

[2] البقرہ11:2

نسل انسانی کے پھیلاؤ اور بقا کے ذرائع اور وسائل بھی خالق کائنات نے توازن کے ساتھ عطا کر رکھے ہیں لیکن عصرِ حاضر کے استعمار نے سائنس اور ٹیکنالوجی کی طاقت کے زعم میں قدرت کے اس نظام کے ساتھ چھیڑ چھاڑ شروع کر رکھی ہے تاکہ اپنے استعماری مقاصد کو پورا کر سکیں۔

ساٹھ کی دہائی میں راک فیلر فاؤنڈیشن کے امریکی سائنسدانوں نے گندم اور چاول کے نئے بیج ''ایجاد'' کیے۔ یہ بیج پورے پاکستان میں فوری طور پر سبز انقلاب کے نام پر پھیلا دیئے گئے۔ چونکہ ان بیجوں کی فصلوں کے خوشوں میں زیادہ دانے ہوتے ہیں اس لیے پہلے سال ستر فیصد پیداواری اضافہ ہوا لیکن دو سال میں یہ حقیقت سامنے آئی کہ یہ دونوں بیج دوسرے بیجوں کی نسبت بہت زیادہ پانی مانگتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ عام دیسی بیج کے برعکس ان بیجوں کے لیے دیسی کھاد کی بجائے کیمیائی کھاد کی ضرورت پڑتی ہے۔ تیسرا مسئلہ یہ سامنے آیا کہ دونوں بیج اپنے اندر طرح طرح کے کیڑے مکوڑوں اور بیماریوں کو کھینچنے میں کمال رکھتے ہیں۔ لہٰذا کیمیائی کھاد اور جراثیم کش ادویات کا اضافی مالی بوجھ کسانوں پر پڑا۔ آبپاشی کے لیے جابجا ٹیوب ویل لگانے کی ضرورت پیش آئی۔ پھر امریکی حکومت نے پاکستان کو مجبور کر دیا کہ تم غریب ملک ہو اس لیے ان سب چیزوں کے لیے ہمارے مالیاتی اداروں سے قرضہ لو۔ اور اس ''سبز انقلاب'' کا جو فوری نتیجہ سامنے آیا وہ یہ تھا کہ اُسی ساٹھ کے عشرے میں لاکھوں ٹن گندم بھی اسی امریکہ اور اس کے حواریوں سے درآمد کرنی پڑی جس نے ہمیں اس بیج کا تحفہ دیا تھا۔ [1]

یہی حال ہماری کپاس کے ساتھ ہوا۔ پاکستانی کپاس ساری دنیا میں اپنے بہترین معیار کی وجہ سے مشہور تھی۔ لیکن جب امریکہ سے درآمد شدہ بیج بویا گیا تو ''امریکن سنڈی'' کا تحفہ ملا جس نے ہماری کپاس کا معیار اور مقدار اتنی کم کر دی کہ ہمارے کپڑے

---

[1] اوریا مقبول جان؛ کالم: ''امریکی سنڈی''؛ حرفِ راز 1۔؛ ص: 71، 72

کے کارخانوں کو کپاس باہر سے منگوانا پڑی۔① اس سارے المیے کا سب سے دردناک پہلو یہ تھا کہ پاکستانی حکومت کی طرف سے دیسی گندم اور دیسی چاول کا بیج رکھنا جرم قرار دے دیا گیا اور اسے قومی ترقی اور خوشحالی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھ کر تلف کر دیا گیا۔②

آج ساری دنیا میں مغرب کے ایجاد کردہ بیجوں، اور دیگر زرعی ٹیکنالوجی کا ہی اعجاز ہے جس کا بھگتان تیسری دنیا خصوصاً مسلمان خطوں کی زراعت کو بھگتنا پڑ رہا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جدید ٹیکنالوجی نے زراعت کے شعبوں میں کئی آسانیاں بھی پیدا کی ہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مسلمان ملکوں کی زرعی پیداوار کو تباہ کرنے کے لیے ایسی ٹیکنالوجی اور ایسا بیج یہاں جانتے بوجھتے متعارف کروایا گیا ہے جس کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ کھاد اور ادویات وغیرہ کا فاضل بوجھ ہمارے کسانوں اور عوام پر پڑا بلکہ ایک تباہ کن نتیجہ یہ بھی نکلا کہ جن زمینوں میں یہ بیج بویا گیا وہ کسی دوسرے بیج سے فصل اگانے کے قابل نہ رہیں نیز کیمیائی کھاد کے بیس پچیس سال کے استعمال کی تاثیر یہ ہے کہ کھیت بنجر اور بانجھ ہو جاتے ہیں۔

جدید استعمار نے نسلِ انسانی کی ہلاکت و بربادی کے لیے بھی بڑے بڑے منصوبوں کے جال بنے ہیں۔ مغرب کی اپنی آبادی مختلف وجوہات کی بنا پر سکڑتی جا رہی ہے اور مغرب نے اس خطرے کے بو بہت پہلے ہی سونگھ لی تھی کہ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی عددی قوت ان کے استعماری مقاصد کی راہ میں رکاوٹ کھڑی کر سکتی ہے۔ لہٰذا ''خاندانی منصوبہ بندی'' ''خوشحالی'' ''ترقی'' وغیرہ کے خوش کن پردوں کے پیچھے اُمت مسلمہ کی نسلوں کو تباہ کرنے کا گھناؤنا عمل شروع کیا گیا۔

---

① اوریا مقبول جان؛ کالم: ''امریکی سنڈی''؛ حرف راز ۱۔؛ ص: 71، 72

② ایضاً؛ ص: 73

جنوری ۱۹۹۳ء میں واشنگٹن پوسٹ میں ایک مضمون نگار نے لکھا:

''مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد روسی امپریلزم سے بھی بڑا خطرہ ہے لہٰذا اس کا خاتمہ ضروری ہے۔ اس معرکے میں حصہ لینے والے ہر شخص کو حکومت کی طرف سے مالی امداد دی جائے۔۔۔ مسلمانوں کی صفوں میں گھس کر ان کی آبادی کم کرنے کے لیے کام کیا جائے۔ حتیٰ کہ ان کی شرحِ آبادی کم ہو کر صفر کی سطح تک پہنچ جائے۔''(۱)

لہٰذا مسلمانوں کی آبادی پر قابو پانے کے لیے کئی منصوبے روبہ عمل ہیں۔ ضبط ولادت کے لیے مسلمان ممالک میں جگہ جگہ مراکز کا جال بچھایا گیا ہے۔ دلفریب نعرے اور سلوگن (جیسے کم بچے خوشحال گھرانہ) تخلیق کیے گئے ہیں۔ مادی ترقی، خوشحالی اور آزادی نسواں کے عنوانات کے تحت عورت کو گھر سے نکال کر کمائی کرنے میں جوت دیا گیا تا کہ وہ خود حمل، پیدائش اور بچوں کی تربیت کے ''جھنجھٹ'' سے گھبرانے لگے۔

رہا ستہائے متحدہ امریکہ ایشیا اور افریقہ کے ممالک کی آبادی کو کنٹرول کرنے کے لیے کثیر سرمایہ خرچ کرتا ہے۔ اس مقصد کے لیے بے شمار ہتھکنڈے استعمال کیے گئے ہیں۔ اوریا مقبول جان لکھتے ہیں:

''...سی آئی اے، محکمہ دفاع اور اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی قومی سلامتی کی یاداشت NSSM200 میں شرحِ آبادی اور امریکی سلامتی پر بحث کی گئی۔۔۔۔ کہا گیا کہ امداد کے ساتھ بڑے بڑے لیڈروں، دانشوروں، سکالروں کو خریدنے کا پروگرام بنایا جائے، امداد، خوراک، اور دوا اُس کو دی جائے جو آبادی کم کرے۔۔۔''(۲)

لہٰذا مختلف مسلمان ممالک میں آبادی کے ''خطرے'' سے نپٹنے کے لیے اقدامات

---

(۱) مریم خنساء؛ ''مسلمانوں کا فکری اغواء''؛ ص:299 (بحوالہ ترجمان القرآن۔ فروری 1998)

(۲) اوریا مقبول جان؛ کالم: ''بچے کم۔۔۔۔ خوشحال امریکہ''؛ حرف راز۔1؛ ص:177

کیے گئے ہیں۔مریم خنسا دنیا کے مختلف مسلمان ممالک میں آبادی کو کنٹرول کرنے کے ضمن میں اٹھائے جانے جن والے اقدامات کا ذکر اپنی تصنیف ''مسلمانوں کا فکری اغواء'' میں کرتی ہیں اُن کا بیان مختصراً درج ذیل ہے۔①

'' اردن میں اس مقصد کے لیے خاندانی منصوبہ بندی کے لٹریچر میں اسلامی اصطلاحات کا بکثرت استعمال کیا گیا۔فلسطین میں تعلیمی نصاب میں منع حمل کی تعلیمات کے لیے اقوام متحدہ نے ۷۵۲ ملین ڈالر مختص کیے جبکہ لبنان میں اس مقصد کیلئے ۱۹۹۳ میں ۱۰۳ بلین ڈالر کی رقم مختص کی گئی اور وہاں فی گھرانہ بچوں کی پیدائش میں کمی ہوئی۔انڈونیشیا میں علماء کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوششیں کی گئیں کہ وہ ضبطِ ولادت اور منع حمل کے لیے اسلامی جواز پیدا کریں۔انڈونیشی مسلمانوں پر اس سلسلے میں جبر بھی کیا گیا۔انڈونیشی فوجی مسلمان عورتوں کو بندوق کی نوک پر نظر بندی کیمپوں میں لے جاتے جہاں ان کی نسل بندی کی جاتی۔تعلیمی اداروں میں نوجوان بچیوں کو اس مقصد کے لیے ٹیکے لگائے جاتے اور وہاں بھی شرح آبادی کی اوسط میں کمی ہوئی ہے۔مصر میں قاہرہ کانفرنس مسلم ممالک میں فیملی پلاننگ کی ترویج کے لیے سنگِ میل ثابت ہوئی۔بنگلہ دیش میں ۱۹۹۲ میں ۶۵ ہزار عورتیں بانجھ کی گئیں، علماء کی ایک بڑی تعداد کو اپنا ہم نوا بنایا گیا، نسل بندی کروانے والی عورتوں کو بہبود آبادی کے محکمے کی طرف سے ریشمی ساڑھیاں تحفے میں دی جاتی تھیں۔پاکستان میں فیملی پلاننگ کا آغاز ۱۹۵۳ء میں ایک NGO نے کیا۔اس وقت بہت سی سرکاری اور غیر سرکاری تنظیمیں، ذرائع ابلاغ اور ادارے اس ضمن میں مصروفِ کار ہیں۔دیہاتوں کے امام مسجدوں اور مولویوں کو بھی ان مقاصد کے تکمیل کیلئے استعمال کیا جا رہا ہے۔غرض یہ کہ ساری اسلامی دنیا میں اس مقصد کے لیے بڑے منظم انداز میں اقدامات کیے جا رہے ہیں۔''

① مریم خنساء؛ ''مسلمانوں کا فکری اغواء''، ص: 230 تا 233

مسلمانوں کی نسلوں کی تباہی کے لیے صرف آبادی کنٹرول کرنے کا طریقہ ہی نہیں اپنایا گیا بلکہ مسلمان آبادیوں اور ملکوں پر سفاکانہ حملوں کے ذریعے بھی یہ مقصد پورا کرنے کی کوشش کی گئی۔ بوسنیا میں جس وحشت اور درندگی کے ساتھ مسلمان آبادی کو نشانہ بنایا گیا، مردوں کا قتل بچوں کو معذور اور عورتوں کی عصمت دری کی گئی اور وہ بھی تہذیب کے علمبرداروں کے ہاتھوں، پھر جس طرح اقوام متحدہ اور دنیا میں امن وانصاف کی علمبردار قوم امریکہ نے اس درندگی پر آنکھیں بند کر رکھیں اس سے ان طاقتوں کے مقاصد سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آنی چاہیئے۔ پھر افغانستان اور عراق پر امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے حملے، کشمیر، برما اور فلسطین میں مسلمانوں پر ہونے والے مظالم پر ان کی خاموشی، اس بات کا ثبوت ہے کہ مسلمانوں کی نسل کشی ان طاقتوں کے ایجنڈے کا حصہ ہے۔

نسلوں کی تباہی کا ایک اور طریقہ بھی عمل پذیر ہے اور وہ یہ ہے کہ معاشروں میں فحاشی، عریانی اور شہوت پرستی کو فروغ دیا جائے اور اس مقصد کے حصول کے لیے بھی شیطان کے کارندے پوری محنت اور جانفشانی سے مصروفِ عمل ہیں۔ کمپیوٹر، ٹی وی اور دیگر ذرائع ابلاغ کے ذریعے ہر اس عمل کو رواج دیا جا رہا ہے جو معاشروں میں بے حیائی کو عام کرے۔ ثقافت اور آرٹ کے نام پر کھلی بے حیائی، روشن خیالی کے نام پر مخلوط ماحول اور آزادیٔ نسواں کے نام پر عورتوں کو دفتروں اور بازاروں میں لا کر بھی ہماری نسلوں کو تباہی کے دہانے پر پہنچا دیا گیا ہے۔ ''آزادی نسواں'' کا نسلوں کی بربادی سے کتنا گہرا تعلق ہے اس کا اندازہ ایک سیاسی فلسفی John Rawls کی ایک تحریر سے ہوتا ہے جس میں اس نے لکھا ہے کہ چائنہ اپنی آبادی کو کنٹرول کرنے کے لیے جو سخت ظالمانہ اقدامات کر رہا ہے اسے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ چائنہ اس ضمن میں بھارتی ریاست، کیرالہ سے سبق سیکھ سکتا ہے جہاں 1970ء کے آخر میں عورتوں کیلئے ووٹ، تعلیم، سیاسی سرگرمیوں، ذاتی کاروبار وغیرہ کے شعبوں میں کھلی آزادی کا اعلان کیا گیا۔ 1979 میں کیرالہ میں شرحِ پیدائش 3.0 تھی

اور چائنہ میں 2.8۔ حکومت کے ''آزادی نسواں'' کے اعلان کے کچھ سالوں کے اندر اندر 1991 میں کیرالہ میں شرح پیدائش 1.8 ہو گئی جب کہ اسی سال چائنہ میں یہ شرح 2.0 تھی کیونکہ کیرالہ کی خواتین نے ''آزادی'' کے ثمرات سے مستفید ہونے کی خاطر ضبطِ ولادت کا طریقہ اپنی خوشی سے اپنا لیا تھا۔ ①

10۔ دھونس اور دھاندلی:

دھونس اور دھاندلی امریکہ کا ایک بہت بڑا وطیرہ ہے جو تیسری دنیا کے خلاف بالعموم اور مسلم دنیا کے خلاف بالخصوص استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک طرف تو امریکہ خود کو انسانی حقوق کا چیمپئن باور کرتا ہے اور دوسری طرف اس کی رعونت کا یہ عالم ہے کہ تمام انسانی، اخلاقی اور بین الاقوامی قوانین اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ نے واضح اعلان کیا کہ وہ اقوام متحدہ کے کسی چارٹر، قانون یا جنیوا کنونشن کی خلاف ورزی کے ضمن میں بین الاقوامی عدالتِ انصاف کے کٹہرے میں کھڑا نہیں ہوگا۔ ② امریکہ وہ واحد ملک ہے جس نے بچوں کے عالمی حقوق کے قانون (CRC) پر دستخط کرنے سے صاف انکار کیا ہے۔ ③ امریکہ دنیا کا واحد ملک ہے جس نے ایٹمی حملوں کے ذریعے دو ہنستے بستے شہروں کو کھنڈر بنایا ہے۔ اس کی فیکٹریاں ہر سال اربوں ڈالر کا اسلحہ بنا کر بیچتی ہیں۔ اور امریکہ کا واضح اعلان ہے کہ وہ جس ملک کو اپنے لیے خطرہ ''تصور'' کرے گا اس پر حملہ کرے گا۔ صدر کلنٹن کے دورِ حکومت میں امریکی وزیرِ خارجہ میڈیلین البرائٹ نے

---

① John Rawls;"The Law of People with the Idea of Public Reason Revisited";Harvard University Press, U.S.A, 2003; pg:110

② Naom Chomsky and Andre Vltchek; "On Western Terrorism.....";
pg:26

③ اوریا مقبول جان؛ کالم: ''دہرا معیار''؛ حرفِ راز 1۔؛ ص: 83

اعلان کیا تھا:

''ہمیں طاقت استعمال کرنی پڑتی ہے اس لیے کہ ہم امریکہ ہیں۔ ہم نوع انسانی کے لیے ایک ناگزیر قوم ہیں۔ ہم بلند ہیں، ہم مستقبل میں دور تک دیکھتے ہیں''۔[1]

اور آج تک امریکہ کے ہر غیر انسانی وغیر اخلاقی عمل، دھونس اور دھاندلی کے پیچھے یہی ''جواز'' کارفرما ہے کہ ''ہم امریکہ ہیں''۔ عراق پر لگائی جانے والی پابندیوں کے نتیجے میں لاکھوں مسلمان بچوں کا بھوک اور بیماری سے تڑپ تڑپ کر مر جانا، افغانستان اور عراق پر جھوٹے اور خود ساختہ الزامات کے تحت حملہ کر کے وہاں آگ برسا دینا، ابوغریب اور گوانتاناموبے میں جنیوا کنونشن کی دھجیاں اڑا دینا، افغانستان اور عراق میں شادیوں کی تقریبات پر، جنازوں پر اور ہسپتالوں پر بم برسا دینا، آزادئ اظہار رائے کے نام پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کی ذاتِ بابرکت پر کیچڑ اچھالنے کی حمایت کرنا اور پھر بھی یہ دعویٰ کرنا کہ ہماری جنگ اسلام کے خلاف نہیں ۔۔ یہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کا دوغلا پن اور دھاندلی نہیں تو اور کیا ہے؟ ''حقوقِ نسواں'' کے عالمی چیمپئن کی طرف سے ڈاکٹر عافیہ صدیقی کے ساتھ جو غیر انسانی سلوک کیا گیا ہے اس کو کس کھاتے میں لکھا جائے؟ قرآن پاک کی بے حرمتی کے واقعات پر مذہبی رواداری اور برداشت کا سبق ساری دنیا کو پڑھانے والوں کی خاموشی کو کیا نام دیا جائے؟

دنیا میں جمہوری روایات کے فروغ کو بھی امریکہ اپنی ایک مقدس ذمہ داری قرار دیتا ہے لیکن یہاں بھی امریکہ کا دوغلا پن اور منافقت واضح ہو جاتی ہے جب امریکہ ان مسلمان ممالک میں جمہوری روایات اور نظام کی پامالی کو بڑے آرام سے نظر انداز کر دیتا ہے جہاں جمہوری کی آواز اس کے مفادات سے ٹکراتی ہو۔

---

[1] میر بابر مشتاق: ''امریکی دہشت گردی۔۔۔''، ص: 269

مشہور مغربی تجزیہ کار Manuel Volanzuela لکھتے ہیں کہ امریکہ تو مشرقِ وسطی میں آزادی اور جمہوریت کی اجازت دینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا کیونکہ وہ عوام کی قوت اور جمہور کی آواز سے لرزتا ہے اور اسے اسلام اور اس کے مؤقف سے خوف آتا ہے۔(۱) یہی تجزیہ نگار آگے چل کر مثال پیش کرتا ہے کہ جب فلسطین میں عوام نے امریکی اور اسرائیلی حامی جماعت کی بجائے حماس کو جتوادیا تھا تو ''امریکہ اور اسرائیل دونوں فلسطین کے عوام کو اجتماعی سزا دینے پر تل گئے۔''(۲)

غرض یہ کہ امریکہ کی منافقت، دھونس اور دھاندلی کی مثالوں سے گزشتہ کچھ عشروں کی تاریخ بھری پڑی ہے اور اس کی گواہی خود مغربی اور امریکی مبصرین اور تجزیہ نگار بھی دیتے ہیں۔ امریکہ کے لیے اپنی ہر بے انصافی، زور زبردستی اور ظلم کے لیے محض ایک جواز کافی ہے اور وہ یہ ہے کہ ''ہم امریکہ ہیں''! گویا کہ ''انا ربکم الاعلیٰ''۔

امریکہ سے شائع ہونے والی جوائس ڈیوس کی کتاب Between Jihad and Salaam میں مصنفہ نے پاکستان کی سابقہ سفیر سیدہ عابدہ حسین کی جنرل پاول کے ساتھ ہونے والی ایک گفتگو کا احوال نقل کیا ہے۔ اس گفتگو کا موضوع پاکستان کی ایٹمی طاقت تھا۔ جنرل پاول بضد تھے کہ پاکستان اپنے جوہری پروگرام کو لپیٹ کر رکھ دے۔ عابدہ حسین نے کہا کہ جنرل صاحب آپ خود ہزاروں ایٹمی بم رکھیں گے لیکن آپ چاہتے ہیں کہ ہمارے جو چند برے بھلے زمین میں دفن ہیں ہم ان سے بھی فارغ ہو جائیں۔ آپ تو ہم سے خودکشی کرنے کے لیے کہہ رہے ہیں۔ ہم ایک جوہری ریاست کے پڑوس میں ہیں۔ کیا اگر کینڈا اور میکسکو کے پاس بم ہوں تو آپ اپنے بم ختم کر دیں گے؟ اس پر جنرل پاول نے

---

(۱) مینوَل وینز ویلا؛ مضمون: ''امریکہ میں دہشت گردی کے نام پر قید ایک عرب مسلمان بچے کے نام''؛ مجلّہ: ''مغرب اور اسلام''، رسالہ:30، جنوری۔دسمبر 2006: ص:98

(۲) ایضاً

جواب دیا:

''دیکھیے سفیر صاحب، میں اخلاقیات کی بات نہیں کر رہا ہوں، میں آپ سے صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ ہم ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور آپ پاکستان ہیں۔''①

سو ریاست ہائے متحدہ امریکہ سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد سے واحد سپر پاور ہونے کی رعونت میں مبتلا ہے اور ساری دنیا کو اپنے زیر اثر لانے کے لیے ہر طرح کا ناجائز اور غیر انسانی ہتھکنڈہ آزمانے میں اسے کوئی عار نہیں۔

11۔فرقہ واریت:

"Divide and Rule" استعمار کا پرانا، آزمودہ اور سنہری نسخہ ہے اور آج کا استعمار بھی مسلمانوں کے خلاف اس حربے کو کامیابی سے استعمال کر رہا ہے مختلف گروہوں میں تفرقہ پیدا کرنا اور پہلے سے موجود فرقہ وارانہ اختلافات کو ہوا دینا استعمار کا ایک کامیاب ہتھکنڈہ ثابت ہو رہا ہے۔

کئی صدیوں سے مسلمان مختلف فرقوں اور مسالک میں منقسم ہیں لیکن ان اختلافات کی بنیاد پر جتنی نفرت اور خونریزی عصرِ حاضر کے مسلمانوں میں نظر آتی ہے وہ ماضی میں نہیں تھی۔اور اس کی ایک وجہ یہی ہے کہ استعمار کے خفیہ ہاتھ ان تفرقات کی آگ کو ہوا دیتے ہیں۔ان کے اعلیٰ دماغ بڑی محنت کے ساتھ مسلمانوں میں موجود مختلف فرقوں، مسالک اور مختلف نقطۂ ہائے نظر رکھنے والے طبقات سے متعلق تحقیقات کرتے ہیں پھر مسلمانوں کی صفوں میں گھس کر ان کے مابین اختلافی امور کو ہوا دیتے ہیں اور نفرتوں اور عداوتوں کے بیج بوتے ہیں۔ رینڈ کارپوریشن کی ایک رپورٹ میں یہ سفارش پیش کی گئی ہے کہ ہمیں مسلمانوں کے ایک مسلک کی حمایت کر کے اسے دوسرے مسلک کے خلاف کھڑا کرنا چاہیے تاکہ ہمارے حمایت یافتہ مسلک کے لوگ دوسرے مسلک کے خلاف فتوے جاری

① میر بابر مشتاق: ''امریکی دہشت گردی: تاریخ اور اثرات''؛ ص: 271

کریں اور اسے کمزور کریں۔①

شیعہ سنی اختلافات کو خونریزی کی حد تک پہنچا دینا بھی استعماری چالوں کا ہی نتیجہ ہے۔عراق میں شیعہ سنی فسادات کے پیچھے استعماری ہاتھ ہی کارفرما تھا۔

حافظ عاطف وحید رقمطراز ہیں:

''شیعہ سنی منافرت کا یہ مسئلہ بظاہر ایک علاقائی اور حالیہ معاملہ نظر آتا ہے مگر اس کی جڑیں اس سے کہیں گہری اور وسیع ہیں۔وسعت کے اعتبار سے اگر یہ کہا جائے کہ اس بحران کے اصل محرک اسکرپٹ رائٹر اور اصل کھلاڑی استعماری پلیئرز ہیں تو ہرگز غلط نہ ہو''۔②

کسی خطے میں فرقہ وارانہ تشدد کو ہوادی جائے تو بدامنی، خوف اور بے اعتمادی کی فضا پیدا ہو جاتی ہے پھر ایسے خطے میں استعمار کو اپنے قدم جمانے اور وہاں کے عوام پر قابو پانے میں زیادہ دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔عصر حاضر کی استعماری طاقتوں نے خصوصاً عرب ممالک میں یہ کھیل بڑی کامیابی کے ساتھ کھیلا ہے۔انسٹی ٹیوٹ آف اسٹریٹجک اسٹڈیز اسلام آباد کے ڈائریکٹر جنرل تنویر احمد خان کہتے ہیں کہ مغرب نے سعودی عرب کو اس خوف میں مبتلا کر رکھا ہے کہ اگر سعودی عرب کے تیل پیدا کرنیوالے مشرقی حصے میں کوئی شیعہ انقلاب آ گیا تو سعودی عرب کے استحکام خصوصاً اس کے تیل کے ذخائر کو خطرہ لاحق ہو جائے گا۔③

تنویر احمد خان اسی مضمون میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

''اسی طرح کا خوف مغربی میڈیا نے ایک پالیسی کے تحت پیدا کر رکھا ہے جو کہ برسہا برس سے اس شیعہ سنی عنصر کے ذریعے رخنہ پیدا کرنے کے لیے کوشاں

---

①Cheryl Benard;"Civil Democratic Islam";pg:xii (summary)

② حافظ عاطف وحید؛مضمون:''امتِ مسلمہ پر استعمار اور صہیونیت کا مشترک حملہ''؛ص:4

③ تنویر احمد خان؛''ایران کے معاملات پر ایک نظر''؛ص:52

ہے۔امریکہ نے رخنہ پیدا کرنے والے اس عنصر کو بہت پہلے سے نوٹ کر رکھا تھا چنانچہ اس نے عراق میں اسے بڑے برے انداز میں استعمال کیا جس کے نتیجے میں ہزاروں کی تعداد میں اندوہناک اموات ہوئیں، حتیٰ کہ مقدس بارگاہوں پر حملوں کے واقعات رونما ہوئے''۔ [1]

سو مسلمانوں کے مذہبی، مسلکی اور فرقہ وارانہ اختلافات کو بدترین انتشار میں بدلنے سے استعمار اپنے مقاصد آسانی کے ساتھ حاصل کر سکتا ہے۔حافظ عاطف وحید لکھتے ہیں کہ مشرق وسطیٰ اور عرب ممالک میں یہی اختلافات امریکہ کو اس بندر بانٹ کا موقع فراہم کر سکتے ہیں جس کے ذریعے مشرق وسطیٰ کی جغرافیائی سرحدوں کو گریٹر اسرائیل کی تشکیل کے لیے نرم کیا جا سکتا ہے۔ [2]

فرقہ وارانہ فسادات استعمار کا ایک نہایت خوفناک حربہ ہے۔ایک ذرا سا شعلہ بھڑک جائے تو یہ فسادات جنگل کی آگ کی طرح خود بخود پھیل جاتے ہیں۔عراق میں اہل تشیع اور اہل سنت کے مابین ان فسادات کو بھڑکا کر بے شمار مسلمانوں کا خون بہایا گیا۔

ایوب بیگ مرزا لکھتے ہیں:

''(امریکہ نے) عراق کی عوام کو تقسیم کرنے کے لئے یہی طریقہ واردات اختیار کیا کہ کبھی اہل تشیع کی زیارت گاہوں اور امام بارگاہوں پر حملے کرائے تو کبھی اہل سنت کی مساجد میں بم دھماکے کرا دیے۔'' [3]

یہی خوفناک کھیل اب ہر اس مسلمان خطے میں کھیلا جا رہا ہے جہاں پر بدامنی اور انتشار کی فضا کے ساتھ امریکی مفادات وابستہ ہوں۔

---

[1] تنویر احمد خان؛ ''ایران کے معاملات پر ایک نظر''؛ ص:52

[2] حافظ عاطف وحید؛ ''امت مسلمہ پر استعمار اور صہیونیت کا مشترک حملہ''؛ ص:7

[3] مرزا ایوب بیگ؛ مضمون: ''فرقہ وارانہ دہشت گردی؛ پشتیبان کون اور کیوں؟''؛ ماہنامہ میثاق، لاہور، مارچ 2015؛ ص:5

12۔ نظامِ تعلیم:

ہر قوم اپنی کامیابی اور ناکامی کے متعلق ایک خاص فلسفہ اور نظریہ رکھتی ہے اور اس ملت کی بقاء اور ترقی کا راز اسی میں ہے کہ اس کے افراد اس فلسفے اور نظریئے کو سمجھتے ہوں اور ان کی زندگیاں اس نظریئے کی عملی تفسیر ہوں پھر یہ کہ وہ قوم اس فلسفے اور نظریئے کو پوری روح کے ساتھ اپنی نئی نسل کے قلب و ذہن میں اتار دینے کی صلاحیت بھی رکھتی ہو تا کہ اس قوم کی بقاء اور ترقی کا سفر جاری رہے۔ اس فلسفے، نظریئے اور نصب العین کو جس عمل کے ذریعے ایک نسل اپنی اگلی نسل کو منتقل کرتی ہے وہی اس معاشرے کا ''نظامِ تعلیم'' کہلاتا ہے۔

مسلمان اس لحاظ سے نہایت خوش قسمت قوم ہیں کہ ترقی فلاح اور کامیابی کا نظریہ انہیں خود خالق کائینات کی طرف سے وحی کیا گیا ہے۔ ان کے پاس علم کا حقیقی منبع و سرچشمہ ہے لیکن اس قوم کی بدقسمتی کی انتہا ہے کہ علم و حکمت کے حقیقی سرچشمے سے مستفید ہونے کی بجائے تعلیم و تعلم کے لیے ''مغضوب'' اور ''ضآلین'' اقوام کی راہنمائی کی محتاج ہے۔

مغرب نے اپنے پہلے دورِ استعمار میں اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے جو حربے اور ہتھکنڈے استعمال کیے ان میں سب سے زیادہ کامیاب اور دور رس نتائج کا حامل ان کا نظام تعلیم تھا۔ لارڈ میکالے نے 1835 میں برطانوی پارلیمنٹ میں جو مشہور تقریر کی اس میں اس نے اعتراف کیا تھا کہ ہندوستان کے سفر کے دوران اسے کوئی بھکاری یا چور نظر نہیں آیا۔ ملک کی اخلاقی حالت بہت بلند ہے اور اقدار کا معیار بہت اعلیٰ ہے۔ ہم اس ملک کو اس وقت تک فتح نہیں کر سکتے جب تک ہم اس کی ریڑھ کی ہڈی نہ توڑ دیں۔ یہ ریڑھ کی ہڈی اس کی روحانی اور معاشرتی میراث ہے اور یہ میراث ان کا غیر رسمی نظامِ تعلیم منتقل کر رہا ہے۔[1]

چنانچہ مغرب کی استعماری طاقتوں نے اس گُر کو گویا اپنے پلو سے باندھ لیا کہ اپنے

[1] اوریا مقبول جان؛ کالم: ''ریڑھ کی ہڈی''؛ حرف راز۔2، 2010؛ ص: 29

زیر قبضہ خطوں کے لوگوں کو جسمانی طور پر غلام بنانے سے زیادہ فائدہ ذہنی طور پر مرعوب کرنے اور غلام بنانے میں ہے اور یہ مقصد ایک خاص قسم کا نظامِ تعلیم ترتیب دے کر بآسانی حاصل کیا گیا۔

جدید استعمار نے بھی اس حربے کا بخوبی استعمال کیا ہے۔

خالد بیگ اپنے مضمون ''مروجہ نظامِ تعلیم اور مسلم تناظر'' میں لکھتے ہیں:

''اس وقت پورے عالم اسلام میں جو غالب نظام تعلیم رائج ہے وہ سامراجی طاقتوں کا رائج کردہ مغربی نظام تعلیم ہے....ان سامراجی طاقتوں نے باقاعدہ ایک منصوبے کے تحت اپنے مقبوضہ ممالک کے تعلیمی نظام کو تباہ و برباد کرانے کیلئے کام کیا، اور اس کی جگہ رائج کیے ہوئے اپنے تعلیمی نظام کو جاہ ومنزلت کا مورد ٹھہرایا''۔ [1]

آج پوری اسلامی دنیا میں کوئی تعلیمی ادارہ، کوئی کالج یا کوئی یونیورسٹی ایسی نہیں جسے عالمی معیار کا حامل قرار دیا جا سکے اور یہ اس قوم کا حال ہے جس کی بغداد اور سپین کی یونیورسٹیوں میں علم وحکمت کے موتی چننے کے لیے پورے یورپ سے متلاشیانِ علم ذوق وشوق سے آیا کرتے تھے۔ ہمارے موجودہ علمی زوال کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ ہمارے تعلیمی نظام سے آج ہمارے نظریے اور دینی فلسفے کی روح مفقود ہے اور اس کی جگہ مغربی نظریات وخیالات نے لے لی ہے۔

مغربی نظام تعلیم نے آج مسلمان نسلوں میں جو سب سے بڑی خرابی پیدا کی ہے وہ دین اور دنیا کو الگ خانوں میں بانٹ دینا ہے۔ صدیوں تک رائج اسلامی نظام تعلیم میں تدریس کا مرکز مساجد اور مدارس ہوا کرتے تھے وہیں پر قرآن، حدیث اور فقہ کے ساتھ

---

[1] خالد بیگ/ عارف الحق عارف؛ مضمون: ''مروجہ نظامِ تعلیم اور مسلم تناظر''؛ مجلۃ: ''مغرب اور اسلام''، رسالہ:40، 2014؛ ص:171

ساتھ علم طب، علم جغرافیہ، کیمیا وغیرہ پڑھایا جاتا تھا کیونکہ تب تعلیم کا مقصد صرف کائنات کے چھپے راز جاننا ہی نہیں تھا بلکہ کائینات اور اس کے مظاہر کے خالق کی پہچان اور معرفت بھی تھی جبکہ آج استعمار کے زیر اثر مسلمان ممالک میں دنیاوی تعلیم کے لیے اسکول اور دینی تعلیم کے لیے مدارس علیحدہ علیحدہ ہیں ان میں بھی دنیاوی تعلیم حاصل کرنے والوں کا معاشرے میں رتبہ دینی تعلیم حاصل کرنے والوں سے بلند سمجھا جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مغرب میں تعلیم حاصل کرنے کا اہم مقصد صرف اعلیٰ مقام پر فائز ہونا اور اچھی نوکری حاصل کرنا ہے اور یہی مقاصدِ تعلیم آج مسلمان معاشروں میں بھی در آئے ہیں۔ تعلیم کا مقصد اچھے مسلمان نہیں بلکہ قابل ڈاکٹر، انجینئر اور سائنسدان وغیرہ پیدا کرنا ہے۔

اسلامی ممالک کے نظام ہائے تعلیم میں ایک اور سنگین مسئلہ ذریعۂ تعلیم بھی ہے۔ جو ملک جس استعماری طاقت کے زیر نگین رہا اسی کی زبان وہاں عزت و سر بلندی کی علامت سمجھی جانے لگی اور کسی بھی ملک کی زبان کو کامیابی اور عزت کا معیار بنا لیا جائے تو اسی ملک اور معاشرے کی تہذیب و اقدار بھی زبان کے ساتھ ہی ہمارے معاشروں میں جگہ بنا لیتی ہیں۔ اس کے علاوہ عالمگیریت کا ایک ''تحفہ'' یہ بھی ہے کہ کوئی بھی اچھا تحقیقی کام اس وقت تک پذیرائی حاصل نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ انگریزی میں نہ شائع کیا جائے یوں نظامِ تعلیم میں مقامی زبانیں اور اقدار ثانوی حیثیت حاصل کر لیتی ہیں۔

ہمارے معاشروں میں ایک ہی وقت میں کئی نظام ہائے تعلیم رائج ہونے کی اصل وجہ بھی یہی ہے کہ انگریزی زبان اور مغربی تعلیم والے ادارے مہنگے ہیں اور معاشرے کے چند طبقات کی ہی پہنچ میں ہیں جبکہ غریب طبقات کے لیے سرکاری سکول ہیں جن کا کوئی پرسان حال نہیں۔ تیسرا نظام مدارس کا نظام ہے جن میں دنیاوی تعلیم کا خاطر خواہ بندوبست نہیں۔ نتیجہ یہ کہ معاشرے کے مختلف طبقات کے مابین باہمی رنجش اور کشاکش جاری رہتی ہے۔

مسلمان ممالک کے نظام تعلیم میں مغرب کی ''دلچسپی'' کا یہ عالم ہے کہ اس کو اپنی مرضی کے مطابق کرنے اور رکھنے کے لیے کروڑوں ڈالر خرچ کیے جاتے ہیں اور ہمارے نصاب پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ روزنامہ ڈیلی ٹائم، لاہور کے واشنگٹن میں متعین نمائندے خالد حسن کا کہنا ہے کہ مسلم دنیا میں تعلیم امریکہ کی اولین ترجیح ہے۔① امریکہ کے دفتر خارجہ نے Brookings Institute کو لاکھوں ڈالر دے کر اس پراجیکٹ کی تکمیل پر لگایا کہ مسلمان ملکوں میں تعلیم کے نظام کو کیسے ''درست'' کیا جا سکتا ہے۔② اس تحقیق کی ضرورت غالباً اس لیے پیش آئی کہ مغرب کی صدیوں کی محنت کے باوجود عام مسلمانوں میں سے ابھی بھی ''اسلام'' کو مکمل طور پر نکالا نہیں جا سکا۔ ابھی بھی مسلمانوں میں حریت اور دینی غیرت رکھنے والے ''انتہا پسندوں'' کی کمی نہیں۔

اس انسٹیٹیوٹ نے جو رپورٹ پیش کی وہ مغربی استعماری ذہنیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اس نے کہا کہ مسلمان ملکوں کے نظام تعلیم میں سے ان کے اسلاف کے کارناموں کا ذکر نکالنا پڑے گا۔ اس کے علاوہ ان کی اقدار جن میں انصاف، اخلاق، شرم وحیا، عدل اور حاکمیت الٰہی شامل ہیں اُن کی جگہ حقوق نسواں، عالمی برادری، جینڈر بیلنس (gender balance)، انسانی حقوق اور مذہبی جبر کے خلاف تحریک کو شامل کرنا اور لبرل ازم کا نعرہ دینا ضروری ہے۔③

اس پالیسی کے نفاذ کے لیے امریکہ کی بین الاقوامی ترقیاتی ایجنسی (USAID) کے ذریعے پاکستان کو سو ملین ڈالر کی امداد کا اعلان کیا گیا تا کہ تعلیمی میدان میں ''اصلاحات'' کی جائیں۔ یونیسکو کے ایک اہم رکن اور ٹاسک فورس کے چیئرمین ہینری روسکی کو اس کام

---

① سلیم منصور خالد؛ مضمون: ''روشن خیال تعلیم''؛ ص: 85

② اوریا مقبول جان؛ کالم: ''تری بربادیوں کے مشورے ہیں''؛ حرف راز 1۔؛ ص: 153

③ ایضاً؛ ص: 154

کے لیے مخصوص کیا گیا اور ورلڈ بینک کی رپورٹ PAK-23916 میں مدرسوں کو کنٹرول کرنے کا راستہ دکھایا گیا۔ اسی رپورٹ میں یہ مشورے بھی دیئے گئے کہ امریکہ ایسی تمام این جی اوز اور پرائیویٹ تعلیمی اداروں کو امداد دیکر اس مقصد کے لیے استعمال کرے جو مذہب سے بیگانہ ہیں۔ نیز یہ کہ جن تعلیمی اداروں میں مذہبی لوگ موجود ہیں ان کی حکومت کے ذریعے معاشی ناکہ بندی کروائی جائے اور انہیں غیر فعال کیا جائے۔ تعلیمی اداروں کو پرائیویٹ سیکٹر میں دیا جائے تاکہ ان کے بورڈوں کو مالی امداد کے ذریعے ہم اپنی مرضی کا نظامِ تعلیم سکولوں میں رائج کروا سکیں۔ (۱)

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ امریکہ کی یہ ساری محنتیں اور بھاگ دوڑ جو وہ ہمارے نظام تعلیم کی خاطر کر رہا ہے کیا اس لیے ہے کیونکہ وہ مسلمانوں کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنا چاہتا ہے؟ ظاہر ہے کہ امریکہ کا مقصد یہی ہے کہ مالی امداد دے کر ہمیں اپنی مرضی کے ''اسباق'' پڑھائے اور ہماری عزت نفس اور وقار کو اس طرح کچل دیا جائے کہ ہم اپنے اسلاف اور اپنی روایات پر فخر کرنے اور انہیں اپنا ''آئیڈیل'' بنانے کی ''احمقانہ'' غلطی کبھی نہ کریں۔ ہمارے تعلیمی ادارے آج دانستہ یا نادانستہ استعمار کے انہی مقاصد کی تکمیل میں مددگار ثابت ہو رہے ہیں۔ ایس ایم محمد ادریس (چیف ایڈیٹر تھرڈ ورلڈ، ریسر جینس پینانگ، ملائیشیا اور چیئر پرسن سٹیزنز انٹرنیشنل) کے مطابق:

> ''ہماری جامعات سامراجی تصورات کی پرورش گاہیں ہیں، وہ اپنے تعلیمی نمونوں کے ذریعے مغربی بالادستی کو دوام بخشتی ہیں جو کہ ہماری تہذیب، زبان، طرزِ زندگی، نظامِ تعلیم اور عظمت کے لیے تباہ کن ہے۔'' (۲)

---

(۱) اوریا مقبول جان؛ کالم: ''تری بربادیوں کے مشورے ہیں''؛ حرف راز 1-؛ ص:154

(۲) ایس ایم محمد ادریس؛ مضمون: ''ہماری جامعات: سامراجی نقطہ نظر کی پرورش گاہیں''؛ مجلہ: ''مغرب اور اسلام''، رسالہ:40؛ ص:21۔

یہی وہ حقیقت ہے جس کا ادراک مولانا مودودی نے کئی عشرے پیشتر کر لیا تھا اور اپنی ایک تقریر میں تعلیمی اداروں کو "قتل گاہیں" قرار دیا تھا۔ (۱) انہوں نے کہا: "موجودہ نظامِ تعلیم میں ملت اسلام کے نونہالوں کی تعلیم و تربیت کے لیے جو انتظام کیا جاتا ہے وہ دراصل ان کو اس ملت کی پیشوائی کے لیے نہیں بلکہ اس کی غارت گری کے لیے تیار کرتا ہے"۔ (۲)

لہٰذا جب تک استعمار مسلم خطوں پر براہِ راست قابض رہا اس نے یہاں ایسے نظام تعلیم کو رائج کیا جو سراسر ان ہی کے مطلب اور ان ہی کے کام کی "مصنوعات" تیار کرتا تھا۔ استعمار کے یہاں سے چلے جانے کے بعد ہم نے بھی اس ضمن میں انقلابی اقدامات کرنے کی بجائے اسی نظام کو جاری رکھا۔ تعلیم کا مقصد صرف ڈگری حاصل کر کے اچھی نوکری کا حصول ٹھہرا اور اس کو بازار کی جنس بنا دیا گیا۔ نظام تعلیم کے علاوہ نصاب تعلیم کو بھی اعلیٰ اسلامی قدروں سے ہم آہنگ کرنے کی اول تو کوئی سنجیدہ کوشش کبھی نہیں کی گئی اور اگر کبھی ایسا کوئی قدم اٹھایا بھی گیا تو "بیرونی آقاؤں" کا ہماری حکومتوں پر ہمیشہ یہ دباؤ رہا کہ نصاب میں کوئی ایسا مواد شامل نہ ہونے پائے جو طلبہ کے اندر شاندار اسلامی روایات و احکامات اور اقدار کی محبت و عظمت کا احساس روشن کر دے۔

کراچی یونیورسٹی کے شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ سے منسلک جناب سید خالد جامعی لکھتے ہیں:

> "جدید اسکول ہمیں وہ سانچے مہیا کرتے ہیں جس کے ذریعے ہم استعمار کی غلامی قبول کرتے اور اس کی پیدا کردہ مقاصدِ زندگی کو الحق سمجھتے ہیں۔ یہ تعلیمی ادارے مغرب کے بَلّے بٹے پر ہماری سیاسی عسکری شکست کو تہذیبی شکست میں بدلتے ہیں اور نوکری اور ترقی کو زندگی کا اصل مقصد بنا کر انسان کی تخلیقی صلاحیتوں کو

---

(۱) مودودیؒ: "تعلیمات"؛ اسلامک پبلی کیشنز لاہور، فروری 2014ء: ص: 37

(۲) ایضاً؛ ص: 43

مسلسل و مکمل رہنمائی اور بھاری بھر کم نصاب کے ذریعے کچل کر رکھ دیتے ہیں۔ سوچنے، جانچنے، پرکھنے کے تمام فطری پیمانوں کو توڑ کر صرف ایک طریقے سے سوچنا سکھاتے ہیں۔"①

اسی نظام تعلیم سے "پڑھ لکھ" کر جو نسل نکلتی ہے اس کی فکری صلاحیتیں یوں محدود ہوتی ہیں کہ اپنی عقل صرف دین پر تنقید یا دین کی ایسی جدید تعبیریں کرنے میں لگا دیتے ہیں جو انہیں مغرب میں "قابل قبول" بنا دے۔ ہمارے تعلیمی ادارے ایسی ہی نسل کی "صنعت سازی" کر رہے ہیں جو رسوم و رواج اور چند مظاہر کی سطح پر تو چاہے مسلمان ہو لیکن ذہنی، قلبی، اور عقلی طور پر مغربی مادیت پرستی اور خدا بیزاری کا منہج رکھتی ہو۔

پاکستان کا نظام تعلیم خاص طور پر استعمار کا ہدف ہے کیونکہ پاکستان کو اسلام کا ایک مضبوط قلعہ کہا جاتا ہے۔ یہاں کے عوام میں سیکولر دانشوروں کی ہزار کوششوں اور میڈیا کے زبردست پراپیگنڈوں کے باوجود اس بات کا احساس موجود ہے کہ پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے جس کی بنیاد اسلام کے نام پر رکھی گئی تھی لہٰذا ہماری نوجوان نسل کے اندر پاکستان کی نظریاتی اساس کے شعور کو بے اثر کرنے کا اہم ترین ذریعہ نصابِ تعلیم اور نظام تعلیم ہے۔ اسی مقصد کے لیے کی جانے والی استعماری کوششوں کے متعلق سلیم منصور خالد لکھتے ہیں:

"پاکستان کے قومی نظامِ تعلیم کے جسدِ ملی میں روح محمد ﷺ کی بچی کھچی رمق کو نچوڑ کر رکھ دینا امریکی سامراج کا ہدف ہے اس کے لیے انہوں نے پاکستان کی وزارتِ تعلیم کو بے دست و پا بنا کر ٹکڑوں میں بانٹ دیا ہے اور ہر ٹکڑے پر چار چار عالمی این۔جی۔اوز کو بٹھا دیا ہے جن کی وفاداریوں کا مرکز پاکستان میں نہیں بلکہ

---

① سید خالد جامعی؛ مضمون: "اسلامی اسکولوں میں ہم بچوں کو کیا پڑھا رہے ہیں"؛ سہ ماہی حکمتِ قرآن، لاہور، جنوری۔ مارچ 2015ء؛ ص: 64

سات سمندر پار ہے۔ ان این جی اوز کی حکمرانی وزارت ہائے تعلیم اور ادارہ ہائے نصابیات سے لے کر اساتذہ کی تربیت اور انہیں دفتری اور انتظامی گر سکھانے تک پھیلی ہوئی ہے۔" (۱)

لہٰذا ان این جی اوز کے زیر سایہ ہمارے تعلیمی اداروں میں مخلوط ماحول، محافل موسیقی، غیر اسلامی تہوار، ناچ گانے وغیرہ "صحت مند غیر نصابی" سرگرمیوں کے عنوان سے فروغ پا رہے ہیں۔ نصابِ تعلیم کے ذریعے ہماری نوجوان نسل کے ذہنوں سے اسلامی تہذیب کی عظمت کے احساس کو ختم کرنے اور جاہلی تہذیب کی محبت کا بیج بونے کی باقاعدہ منصوبہ بندی کی گئی ہے۔

رینڈ رپورٹ کی تجویز ہے کہ:

"Facilitate and encourage an awareness of their pre-and non-Islamic history and culture, in the media and the curricula of relevant countries". (۲)

(مسلمان ملکوں کے میڈیا اور تعلیمی نصاب کے ذریعے ان خطوں کی ماقبل اسلام تاریخ اور ثقافت کو فروغ دیا جائے۔)

تعلیمی اداروں کی شکل کاروباری اداروں سے بدلتی جا رہی ہے۔ انگریزی زبان کی آڑ میں انگریزی ثقافت پرورش پا رہی ہے۔ استعمار ہمارے نظام تعلیم کو جس طرح اپنی زد پر رکھے ہوئے ہے اس کا ایک بے حد دردناک پہلو یہ ہے کہ ہماری دینی تعلیم کے مراکز یعنی 'مدارس' استعمار کا ایک خصوصی ہدف ہیں۔ برصغیر میں انگریزوں کے استعماری حربوں میں ایک یہ بھی تھا کہ انہوں نے مدارس اور مکتب کا نظام درہم برہم کر دیا تھا۔ آج بھی دینی مدارس مغرب کو اپنی راہ کی رکاوٹ نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ خرم مراد یوں بیان کرتے ہیں:

---

(۱) سلیم منصور خالد، مضمون: "روشن خیال تعلیم"، ص:84

(۲) Cheryl Benard;"Civil Democratic Islam";pg:xi (summary)

''مغرب مدارس کو ایک خطرۂ عظیم اس لیے سمجھتا ہے کہ اس کی نظر میں اس کے تہذیبی غلبے اور قیادت عالم کی بقا اور تہذیبی جنگ میں اسلام کے اوپر فتح کی راہ میں یہ دینی مدارس ایک بہت بڑی رکاوٹ ہیں۔ کیونکہ دینی تعلیم ہی سے مسلمانوں کے اندر کائنات میں 'الحق' کے وجود اور قرآن اور رسالتِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے الحق ہونے پر یقین چودہ سو سال سے زندہ اور قائم ہے اور ''الحق'' کے ساتھ ربط بھی۔ ملت کی وحدت، قوت اور توسیع کا راز اس یقین میں پوشیدہ ہے۔ جب کہ اس یقین کی قوت کا کوئی جواب مغرب کے پاس نہیں۔''(۱)

سو دینی مدارس کے خلاف مغرب کی مہم، دونوں اقوام کے مابین جاری تہذیبی جنگ میں کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔ مدارس شرع محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم کے مراکز ہیں۔ شرع محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم کے متعلق مغربی جذبات کا ایک اندازہ ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کی کتاب "The Indian Musalmaans" کے اس اقتباس سے ہوتا ہے جسے جناب خرم مراد نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے۔ ہنٹر لکھتا ہے:

''شرع محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہرگز تعلیم کا مقصد نہیں بنانا چاہیے کیونکہ شرع محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مطلب ہے مسلمانوں کا مذہب اور مذہب بھی اس زمانے کا جب اس کے پیرو تمام دنیا کو اپنی جائز شکارگاہ سمجھتے تھے، اور انہوں نے زمانہ حال کی مسلمان آبادیوں کی طرف عیسائیوں کے ساتھ اتحاد کر کے یا ان کی رعایا بن کر رہنا نہ سیکھا تھا۔''(۲)

یہی وجہ ہے کہ مغرب کی طرف سے مدارس میں 'اصلاحات' کرنے پر زور دیا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مدارس میں اصلاحات کی ضرورت ہے لیکن ان کی نوعیت اور طریق کار کا تعین کرنا علماء کرام کا کام ہے نہ کہ مغرب کے تھنک ٹینکس کا۔

---

(۱) خرم مراد: ''مغرب اور عالم اسلام''، ص:62

(۲) ایضاً

فصل سوم:

استعماری حملوں سے بچاؤ کے لیے مجوّزہ لائحہ عمل

اسلام اور مسلمانوں کے خلاف باطل کی جنگ تو روزِ اول سے ہی جاری ہے لیکن آج اس جنگ کا دائرہ اس قدر پھیل چکا ہے کہ ہماری زندگیوں کا کوئی بھی شعبہ دشمن کی سازشوں اور چیرہ دستیوں سے محفوظ نہیں۔ عقیدہ ہو یا اخلاق، تہذیب ہو یا ثقافت، سیاست ہو یا معیشت ہمارا ہر میدان آج میدانِ جنگ ہے اور استعمار ہر میدان میں ہم پر حاوی ہے۔ ہمارے افکار سے لے کر اطوار تک، زبان سے لے کر عادات تک، تعلیم سے لے کر سماج تک، صورت سے لے کر لباس تک، گفتار سے لے کر کردار تک، ہمارے اخبار، ہمارے گھر، ہمارے بازار سب آج استعمار کے حملوں کی زد میں ہیں۔ ہر جگہ اُسی کا غلبہ اور اسی کا تسلط نظر آتا ہے۔ اپنی چودہ سو سالہ تاریخ میں امت مسلمہ کو کبھی ایسی بے بسی، لاچاری اور بے چارگی کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ آج امت کے درد مند اور حساس افراد حیران و پریشان ہیں کہ جائیں تو کہاں جائیں؟ کریں تو کیا کریں؟ کوئی ایک محاذ نہیں، کوئی ایک میدان نہیں، کوئی ایک حربہ نہیں بلکہ ان گنت محاذ اور لاتعداد میدان ہیں اور دشمن کے بے شمار حربے ہیں۔ لیکن ایسی گھمبیر اور بظاہر مایوس کن صورتحال نظر آنے کے باوجود ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ایک مسلمان کبھی بھی اللہ کی ذات سے مایوس نہیں ہوتا، امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔ ہمارا ایمان اور ہمارا یقین ہے کہ یہ امت ایک دفعہ پھر عروج حاصل کر کے رہے گی کیونکہ یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ:

"دنیا میں نہ کوئی اینٹ گارے کا بنا ہوا گھر باقی رہے گا نہ کمبلوں کا بنا ہوا خیمہ جس میں اللہ اسلام کو داخل نہیں کر دے گا۔ خواہ عزت والے کے اعزاز کے ساتھ خواہ کسی مغلوب کی مغلوبیت کی صورت میں (یعنی) یا لوگ اسلام قبول کر کے خود بھی

عزت کے مستحق بن جائیں گے یا اسلام کی بالادستی تسلیم کر کے اس کی فرمانبرداری قبول کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔"[1]

آج ہم مغلوب ہیں کمزور اور بے بس ہیں، خوف، بے یقینی اور بدامنی کا شکار ہیں لیکن اللہ ربّ العزت کا وعدہ ہے کہ وہ ہماری محکومیت کو خلافت سے ہمارے ضعف کو طاقت سے اور ہمارے خوف کو امن وسلامتی سے بدل دے گا۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـــًٔا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝[2]

"اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے اُن لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو زمین میں اُسی طرح خلیفہ بنائے گا جس طرح اُن سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے، اُن کے لیے اُن کے اس دین کو مضبوط بنیادوں پر قائم کر دے گا جسے اللہ تعالیٰ نے اُن کے حق میں پسند کیا ہے اور اُن کی حالت خوف کو امن سے بدل دے گا، بس وہ میری بندگی کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور جو اس کے بعد کفر کرے تو ایسے ہی لوگ فاسق ہیں۔ نماز قائم کرو زکوٰۃ دو اور رسول ﷺ کی اطاعت کرو امید ہے کہ تم پر رحم کیا

---

[1] ابن حنبل، ابوعبداللہ، احمد بن محمد، الشیبانی، امام؛ "مسند امام احمد"؛ موسسۃ الرسالۃ؛ 2011؛ ج:39؛ ص:236؛ حدیث:23814

[2] النور 24:55،56

جائے گا۔“

گویا ہمیں یہ ذہن میں رکھنا ہوگا کہ ہمارے اوپر من وسلویٰ نہیں اُترے گا۔ ایمان، عمل صالحہ، شکرِ گزاری، قربانی اور ان تھک محنت کے بغیر عروج کی منازل طے نہیں کی جاسکتیں۔ اللہ کی نصرت کا وعدہ مشروط ہے۔

وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۹﴾ ①

”اور تم ہی غالب رہو گے بشرطیکہ تم مومن ہو۔“

لہٰذا یہ ضروری ہے کہ ہم اپنا جائزہ لیں کہ ہمارے ایمان، عمل اور کردار میں کہاں کہاں خرابیاں در آئی ہیں اور قرآن وسنت کی روشنی میں دیکھیں کہ ہم خود کو ”مومن“ کیسے بنا سکتے ہیں۔

1۔ عقیدہ کی درستگی:

سب سے پہلا محاذ جو ہمیں سر کرنا ہے وہ نظریاتی محاذ ہے۔ یہ یقین کہ ہماری زندگی، موت اور رزق کا مالک صرف اور صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات ہے۔ دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی اس وقت تک ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی جب تک کہ اللہ نہ چاہے اور دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی ہمیں نہیں بچا سکتی اگر اللہ ہی ہمیں کسی مشکل، آزمائش یا نقصان سے دوچار کرنا چاہے۔

مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ۚ وَمَا يُمْسِكْ ۙ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۲﴾ ②

”اللہ جس رحمت کا دروازہ لوگوں پر کھول دے اسے کوئی روکنے والا نہیں اور جسے

---

① آل عمران 139:3

② الفاطر 2:35

وہ بند کردے اسے اللہ کے بعد پھر کوئی دوسرا کھولنے والا نہیں۔ وہ زبردست اور حکیم ہے۔"

سو "مومن" کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ وہ اپنے نفع، نقصان، زندگی، موت، عافیت یا آزمائش کا مالک دنیا کی کسی بھی "سپر پاور" کو نہیں سمجھتا۔ یہی وہ عقیدہ ہے جو دلوں میں راسخ ہو جائے تو انسان باطل قوتوں اور دنیا کے فراعین سے خوف کھانے کی بجائے حق سے محبت کرنا اور حق کی خاطر ڈٹ جانا سیکھ لیتا ہے۔

2۔ دوست اور دشمن کی پہچان:

دوسرا اہم فیصلہ جو ہمیں کرنا ہے وہ یہ ہے کہ ہم واضح طور پر اپنے دشمن کو پہچان لیں، اور یہ پہچان بھی ہم اپنی عقل اور سمجھ کی بجائے اللہ کی دی ہوئی خبر کے مطابق کریں۔ اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں واضح طور پر بتا دیا ہے کہ:

يَآيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ (1)

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا دوست نہ بناؤ، یہ سب ایک دوسرے کے دوست ہیں"۔

ہماری اور ہمارے حکمرانوں کی بدقسمتی یہی رہی کہ ہم یہود و نصاریٰ کو خوش کرنے کے لیے اپنے رب کو ناراض کر بیٹھے۔ ہم نے اس امید پر اپنا دین، اپنا وقار اور اپنی آزادی سب کچھ داؤ پر لگا دیا کہ دنیا کی بڑی طاقتیں ہم سے خوش ہو جائیں۔ جبکہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے ہمیں بتا دیا کہ یہ ہم سے اس وقت تک خوش نہیں ہو سکتے جب تک کہ ہم اپنے دین سے پھر نہ جائیں۔(2) یہ وہ لوگ ہیں جن کے متعلق اللہ نے ہمیں خبردار کیا ہے۔ کہ جب مسلمانوں کو

(1) المائدہ 51:5

(2) البقرہ 120:2

کوئی نقصان یا پریشانی پہنچتی ہے تو یہ خوش ہوتے ہیں اور جب اہلِ اسلام کو کوئی خیر عطا ہوتی ہے تو انہیں ناگوار گزرتا ہے۔[1] اس کے باوجود اگر ہم انہیں اپنا دوست اور خیر خواہ سمجھیں تو اس سے بڑھ کر ہماری اور کیا بدقسمتی ہوسکتی ہے۔

3۔توکل علی اللہ:

مغرب کی طاقت، مادی ترقی اور شان وشوکت نے ہمیں مرعوب کررکھا ہے، ان کے اسلحے اور ان کی ٹیکنالوجی سے ہم خوف زدہ ہیں۔ ان کی ''امداد'' اور ''تعاون'' کے بغیر ہمیں اپنا کاروبارِ زندگی چلانا ناممکن نظر آتا ہے۔ یہ سب دراصل ہمارے ایمان کی کمزوری کی علامات ہیں۔ جب ایمان اور توکل علی اللہ مضبوط ہوں تو دشمن کی طاقت، اسلحہ، اموال اور شان وشوکت سب حقیر نظر آتے ہیں۔ تاریخ اسلام پر نظر دوڑائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ جب جب ہمارا ایمان اللہ پر مضبوط رہا، دینی غیرت وحمیت زندہ رہی، دنیاوی مال ومتاع اور چمک دمک سے بے نیازی اور آخرت کو مقصود بنانا ہمارا کردار رہا تو اللہ کی نصرت بھی قدم قدم پر ہمارے ساتھ رہی۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ۗ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ[2]

''اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا اور اگر وہ چھوڑ دے تو پھر کون ہے جو اس کے بعد تمہاری مدد کرسکے۔ لہٰذا مومنوں کو چاہیے کہ وہ اللہ پر توکل کریں''۔

آج ہم ایمان اور توکل کی دولت سے محروم ہو گئے ہیں تو اللہ کی نصرت کا سایہ بھی

---

[1] آل عمران 120:3

[2] آل عمران 160:3

ہمارے سروں سے اٹھ چکا ہے۔

4۔ سودی نظام سے چھٹکارا:

بحیثیت مجموعی امت مسلمہ کا ایک ایسا عمل جو خصوصی طور پر اللہ رب العزت کے غضب کا باعث بن رہا ہے وہ سود کا نظام ہے۔ ظاہر ہے کہ جو قوم علی الاعلان اللہ اور اس کے رسول کے خلاف جنگ چھیڑ دے وہ فلاح، عزت اور کامرانی کی توقع کیسے رکھ سکتی ہے؟ اس ضمن میں ضروری ہے کہ مسلمان ماہرین اقتصادیات و معاشیات ہنگامی طور پر ایسے نظام معیشت ترتیب دیں جو نظامِ سود کے متبادل کے طور پر اپنائے جا سکیں۔ اس گناہ سے انفرادی و اجتماعی توبہ کر کے باز آئے بغیر اللہ کی طرف سے کسی بھی نصرت اور خیر کی امید عبث ہے۔

5۔ اتحاد بین المسلمین اور مناسب منصوبہ بندی:

ہماری ذلت و رسوائی کی ایک اور بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اس امت کا شیرازہ بکھر چکا ہے۔ یہ دنیا بھر کے مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اسلام اور مسلمان دشمن قوتوں کے اثر و نفوذ سے خود کو نکالیں اور اس حقیقت کا ادراک کریں کہ چھوٹے چھوٹے ملکوں اور قومیتوں میں منقسم ہو کر وہ اپنی اجتماعی طاقت کا شیرازہ خود بکھیر رہے ہیں اور استعمار کے لیے تر نوالہ ثابت ہو رہے ہیں۔ مسلمانوں کے اندر یہ احساس پیدا ہونا وقت کی ایک اہم ضرورت ہے کہ وہ جسدِ واحد کی مانند ہیں جس کے ایک عضو یا حصے کو تکلیف پہنچے تو سارا جسم بے چین ہو جاتا ہے۔ آج عالم یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ اپنی صدیوں پرانی باہمی دشمنی بھلا کر مسلمانوں کے خلاف متحد ہو چکے ہیں لیکن اُمتِ مسلمہ ملک در ملک، گروہ در گروہ منقسم ہے۔ ہم سب اپنے اپنے نسلی، لسانی، عصبیتی اور فرقہ وارانہ جھنڈے بلند کیے ہوئے ہیں اس لیے ذلت کا شکار ہیں۔

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے چودہ سو سال قبل ہی مسلمانوں کو خبردار کر دیا تھا۔

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ (1)

''اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرو اور نزاع مت کرو ورنہ بزدل ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور صبر کرو، بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے''۔

اس آیت کی روشنی میں ہم اپنا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے اپنے دینی و دنیاوی تمام معاملات میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کو چھوڑ کر یہود ونصاریٰ کی پیروی اختیار کر رکھی ہے اور آپس کے تنازعات نے ہماری وحدت کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ لہٰذا نتیجہ بعینہٖ وہی ہے جس کی پیشگوئی اللہ تعالیٰ نے فرما دی۔ یعنی اسلاف کی شجاعت و جوانمردی کی داستانیں محض تاریخ کی کتابوں کا حصہ بن گئی ہیں۔ اور دشمن کے دلوں میں ہمارا رعب تو کجا اب وہ ہمارے گھروں میں گھس کر ہمیں لوٹتے ہیں، ہماری عزتوں کو پامال کرتے ہیں اور ہم اپنی اپنی سرحدوں میں مقید ہو کر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ابابیلیں بھیجی جانے کا انتظار کرتے ہیں۔ مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے بے حد و بے حساب نعمتوں اور وسائل سے نوازا ہے۔ آج بھی اگر ہم اتحاد و اتفاق کے ساتھ مناسب منصوبہ بندی، خلوص نیت، محنت اور توکل سے کام لیں تو بہت جلد خود کفالت اور خوشحالی کی منزل کو پا سکتے ہیں، اور دنیا میں سربلندی حاصل کر سکتے ہیں۔

5۔ نظام تعلیم کی درستگی:

ایک اور قدم جو ہنگامی طور پر اٹھانے کی ضرورت ہے وہ ہمارے تعلیمی نظام کی درستگی ہے ہمارے لیے ضروری ہے کہ مغربی خطوط پر استوار تعلیمی نظام سے جان چھڑائی جائے۔

---

(1) الانفال 46:8

کیونکہ مغربی نظام تعلیم اسلام کے مقاصدِ تعلیم سے ہم آہنگ نہیں ہے۔

جناب احمد جاوید صاحب اپنے ایک مضمون میں مغربی نظام تعلیم کے بارے میں بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مغرب کے تشکیل کردہ اصول ومقاصد علم ہمارے طلبہ کے ذہنوں کو خدا سے نامانوس کر رہے ہیں۔ ''ان کے خدا دشمن علوم ہمارے نظام تعلیم کی بنیاد ہیں، ہمارے سوچنے کے انداز کی بنیاد ہیں، ہماری ذہنیت کی تشکیل کی بنیاد ہیں....''[1]

لہٰذا ایسا نظام تعلیم خدا پرستی اور خدا خوفی پر مشتمل معاشرے کی تشکیل کبھی نہیں کرسکتا۔ کیونکہ اسلام کے نزدیک ''علم'' کا مقصد یہی ہے کہ وہ عقل اور سمجھ تشکیل پا جائے جو بندے کو اس کے رب کی معرفت کروادے اور بندہ خود کو اپنے خالق کی غلامی میں دے دے۔ یہی وجہ تھی کہ قریش مکہ کا قابل ترین شخص جسے اس کے علم وحکمت کی وجہ سے ''ابوالحکم'' یعنی حکمت کا باپ کہا جاتا تھا اسے رسول اکرم ﷺ نے ''ابوجہل'' یعنی جہالت کا باپ قرار دیا کیونکہ اس نے اپنے رب کے سامنے جھکنے اور خود کو اس کی مرضی کے تابع کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ ایسا علم جو انسان کو رب کی بندگی اور معرفت نہ سکھائے، اسلام کی نظر میں وہ علم نہیں بلکہ جہالت ہے۔

تعلیمی نظام میں اصلاحات کے ضمن میں ایک اہم نکتہ ''ذریعہ تعلیم'' بھی ہے۔ ''آقاؤں'' کی زبان کبھی بھی ترقی وخوشحالی کی منازل کا زینہ نہیں بن سکتی۔ اوریا مقبول جان لکھتے ہیں:

> ''دنیا کی پانچ ہزار سالہ معلوم تاریخ میں کوئی ایک مثال ایسی نہیں ملتی کہ کسی قوم نے کسی غیر کی زبان میں تعلیم حاصل کرکے ترقی کی منزلیں طے کی ہوں.... جرمنی، جاپان اور چین اپنی تباہ حال معیشتوں سے نکلنے کے لیے ایک

---

(1) احمد جاوید؛ مضمون: ''اسلام اور مسلمانوں کو درپیش موجودہ چیلنجز''؛ سہ ماہی: حکمت قرآن، لاہور، جنوری۔ مارچ 2015؛ ص:39

دن بھی انگریزی میڈیم سکولوں کی طرف نہیں بڑھے۔"(۱)

مسلمانوں نے اپنے عہد زریں میں دنیا جہاں کے علوم کو اپنی زبان میں ترجمہ کر کے ان کو سینوں میں اتارا اور بے مثال ترقی کی۔ نشاۃِ ثانیہ کے دور میں جب یورپ میں علم کا چرچا ہوا تو وہاں کی عوام نے بھی دنیا میں پہلے سے موجود علمی ذخائر کو اپنی زبان میں ترجمہ کیا اور علم سیکھا۔(۲)

سو کسی بھی غیر کی زبان میں علم کی تحصیل ممکن ہے اور نہ ہی تخلیقی صلاحیتوں کی نشوونما۔ مسلمانوں کو خود اپنے اصول و مقاصدِ علم اور نظام تعلیم وضع کرنے ہوں گے۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ وہ ہمارے ہی اسلاف تھے جنہوں نے جہالت اور پسماندگی کے اندھیروں میں ڈوبی یورپی اقوام کو علم وتہذیب کے روشن راستے دکھائے تھے۔ آج بھی یہ ناممکن نہیں ہے کہ ہمارے ماہرین ایسا نظام تعلیم اور نصاب تیار کرسکیں جو ہماری ماضی کی شاندار روایتوں کا امین بھی ہو اور عصر حاضر کے تقاضوں کو بھی پورا کرتا ہو۔ ہمارے لیے تو یہ کام اس لیے بھی مشکل نہیں ہونا چاہیے کیونکہ ہمارے پاس وحیَ الٰہی کی رہنمائی بھی موجود ہے جو بذاتِ خود تمام دینی و دنیاوی علوم کا سرچشمہ ہے۔

6۔ عالمگیرت کا چیلنج:

ایک بہت بڑا چیلنج جو امتِ مسلمہ کو درپیش ہے وہ "عالمگیریت" کا چیلنج ہے اور اس چیلنج کو ہمیں شیطان کے اس عہد کے تناظر میں دیکھنا چاہیے جب اس نے کہا تھا کہ وہ انسان پر آگے، پیچھے، دائیں اور بائیں سے حملہ آور ہوگا،(۳) نیز یہ کہ وہ دنیاوی لذتوں اور گناہوں کو

---

(۱) اوریا مقبول جان؛ کالم: "عوام کے خواب، حکمرانوں کے خواب"؛ حرف راز 5۔، 2013: ص:65

(۲) ایضاً: ص:68

(۳) الاعراف 7:17

خوبصورت اور مزین کر کے انسان کے سامنے لیکر آئے گا۔[1] آج عالمگیریت کے پردے میں یہی شیطانی ایجنڈا روبہ عمل ہے۔شیطانی فلسفوں کو خوبصورت اصطلاحات (جیسے حقوقِ نسواں، ہیومن ازم، آزادی اظہار رائے وغیرہ) کا لبادہ پہنا کر انسانوں کے ذہنوں میں پھونکا جاتا ہے۔''ثقافت'' اور''ادب'' کے نام پر عریانی اور فحاشی کو میڈیا کے ذریعے عام کیا جارہا ہے ۔ملٹی نیشنل کمپنیاں آج ہمیں یہ ''سکھا'' رہی ہیں کہ ہمیں کیا کھانا چاہیے ،کیا پینا چاہیے، کیا پہننا چاہیے اور یہ کہ کیا چیزیں ہماری زندگیوں کے لیے بے حد ضروری ہیں۔میڈیا کا پراپیگنڈہ ہمیں یہ یقین دلانے کے لیے کافی ہے کہ ہم دنیا کی پسماندہ ترین اور دہشت گرد قوم ہیں۔اور ہماری نجات صرف اسی میں ہے کہ ہم مغرب کی اتاری گئی ''شریعت'' کو من وعن قبول کر کے اسے خود پر لاگو کرلیں اور عالمی سطح پر''قابل قبول'' بننے کے لیے عالمی برادری کی بڑی طاقتوں کے ہاتھوں اپنی''تراش خراش'' کی اجازت برضا ورغبت دے دیں۔غرض یہ کہ عالمگیریت نے ایک مکڑی کی مانند انسانیت کے گرد جھوٹ فریب اور دھوکے کا جال بُن دیا ہے۔

عالمگیریت کے پھیلائے ہوئے جال سے بچنے کے لیے مسلمانوں کو چاہیے کہ سادگی اور میانہ روی کو اپنا شعار بنائیں ۔ظاہری خوبصورتیوں اور مصنوعی چکا چوند سے متاثر نہ ہوں۔نیز یہ کہ جھوٹ اور سچ کی پہچان کرنا سیکھیں۔ یہاں ایک بہت مشکل سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب مغرب پراپیگنڈہ کے ہتھیاروں کو لے کر ہم پر حملہ آور ہے، وہ انسانی نفسیات سے کھیلنا جانتا ہے حقیقت کو جھوٹ کے پردوں میں چھپا کر اور جھوٹ کو سچ بنا کر یوں پیش کرتا ہے کہ اسے پہچاننا مشکل ہوجاتا ہے۔اس پر طرہ یہ کہ ہماری اپنی صفوں میں ایسے دانشور اور علماء سوموجود ہیں جو باطل کے افکار اور نظریات کو اسلام کے پردوں میں لپیٹ کر ایسے پیش کرتے ہیں کہ ایک عام مسلمان ان کے دھوکے میں آجاتا ہے۔ایسی

---

[1] الحجر 39:15

صورت میں کیا کیا جائے کسے دوست سمجھیں اور کسے دشمن۔ اس کا ایک سیدھا سادا جواب خود قرآن نے دیا ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝ ①

''اے ایمان والو! اگر تم اللہ سے ڈرتے رہو گے تو وہ تمہیں 'فرقان' عطا کرے گا اور تم سے تمہارے گناہ دور کر دے گا اور تم کو بخش دے گا اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے۔''

''فرقان'' سے مراد حق و باطل کا فرق کرنے کی اہلیت ہی ہے۔ مولانا مودودی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''ارشادِ الٰہی کا منشاء یہ ہے کہ اگر تم دنیا میں اللہ سے ڈرتے ہوئے کام کرو اور تمہاری دلی خواہش یہ ہو کہ تم سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہونے پائے جو رضائے الٰہی کے خلاف ہو، تو اللہ تعالیٰ تمہارے اندر وہ قوتِ تمیز پیدا کر دے گا کہ.... زندگی کے ہر موڑ پر ہر دوراہے، ہر نشیب اور ہر فراز پر تمہاری اندرونی بصیرت تمہیں بتانے لگے گی کہ کدھر قدم اُٹھانا چاہیے اور کدھر نہ اٹھانا چاہیے۔ کون سی راہ حق ہے اور خدا کی طرف جاتی ہے اور کون سی راہ باطل ہے اور شیطان سے ملاتی ہے''۔ ②

سو اللہ کا خوف ہی دلوں میں وہ کسوٹی پیدا کرتا ہے جہاں سچ اور جھوٹ واضح نظر آنے لگتا ہے۔ جس دل میں دشمن کی طاقت اور ٹیکنالوجی کا رعب ہو اور ان کے ہاتھوں ''پتھر کے زمانے'' میں پہنچ جانے کا خوف ہو اس کے نصیب میں ''فرقان'' نہیں لکھا جاتا اور وہ یوں ہی

---

① الانفال 29:8

② مودودیؒ، ''تفہیم القرآن''؛ ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، 2011؛ ج:2؛ ص:104

دھوکے، فریب اور جھوٹ کے گردابوں میں پھنسا رہتا ہے۔

7۔ کفار کی نقالی اور تہواروں سے پرہیز:

عالمگیریت کے تباہ کن اثرات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مغربی اور غیر اسلامی رسومات اور تہوار ہمارے معاشروں کا حصہ بنتے جارہے ہیں۔ کرسمس اور ویلنٹائن ڈے جیسے مغربی تہوار تو عرصے سے ہمارے معاشروں میں رواج پا چکے تھے اب دیوالی اور ہولی جیسے ہندوانہ تہواروں کو بھی ''سرکاری سرپرستی'' اور تائید حاصل ہوگئی ہے۔①

ہمارا ''روشن خیال'' طبقہ اس روش کو ''مذہبی رواداری'' اور ''بین المذاہب ہم آہنگی'' کا نام دیتا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ غیر مسلم رسموں اور تہواروں کو منانے سے مسلمانوں کے اسلام کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن اس ضمن میں ہمارا دین کیا کہتا ہے یہ جاننا بھی بہت ضروری ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''جس نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی وہ انہی میں سے ہے''۔ اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں:

> ''یہ حدیث کفار کی ان کے اقوال وافعال، لباس، تہواروں عبادات اور ان کے علاوہ دیگر ایسے امور میں جسے ہماری شریعت نے ہمارے لیے مشروع و جائز نہیں قرار دیا ہے مشابہت اختیار کرنے پر وعید، دھمکی اور سخت ممانعت پر دلالت کرتی ہے''۔②

امام بیہقی نے اپنی سنن میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اقوال نقل کیے ہیں جن میں غیر مسلموں کے تہواروں میں شرکت کرنے کی ممانعت اور ان سے اجتناب کا واضح حکم دیا گیا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے:

---

① روزنامہ جنگ: 12 نومبر 2015؛ ص:1

② ابن کثیر، ابی الفداء اسماعیل، الحافظ، امام، ''تفسیر ابن کثیر''، قدیمی کتب خانہ، کراچی، ۱/ ۳۲۸

"اللہ کے دشمنوں سے ان کے تہوار میں اجتناب کرو"۔ ①

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول کی تشریح میں علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

"....کیا عمر رضی اللہ عنہ کا فرمان اللہ کے دشمنوں سے ان کے تہوار میں ملاقات کرنے اور ان کے ساتھ مل بیٹھنے سے منع نہیں کرتا؟ تو پھر اس شخص کا کیا حکم ہوگا جو ان کے تہوار کو مناتا ہے؟" ②

سلف صالحین کے ان اقوال سے اندازہ ہوتا ہے کہ غیر مسلموں کے تہواروں کو اپنانا اور منانا اسلام میں ایک ناپسندیدہ اور قبیح عمل ہے۔ درحقیقت یہ ذہنی غلامی اور مرعوبیت کی ایک شکل ہے جو ایک مومن کو ہرگز زیبا نہیں۔ اسلام ہمارا مذہب نہیں دین ہے، جو ہم سے زندگی کے ہر لمحے میں اطاعت اور نظم وضبط کا تقاضا کرتا ہے۔ اسلام نے ہمیں ایک پاکیزہ اور نفیس تہذیب اس وقت عطا کی تھی جب دنیا اجڈ اور غیر مہذب تھی۔ پاکیزگی، طہارت صف بندی، سونے، جاگنے، کھانے، پینے حتیٰ کہ بیت الخلا کے استعمال کا ڈھنگ بھی ہمیں ہمارا دین سکھاتا ہے۔ خوشی، غمی، حکومت، معیشت، صلح، جنگ، معاشرت، میل ملاقات، غرض یہ کہ انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر رخ سے متعلق ہمیں ایک خاص اُسوہ عطا کیا گیا ہے۔ اسی طرح کھیل، تفریح اور تہواروں سے متعلق باب کو بھی تشنہ نہیں چھوڑا گیا۔

ہمارے تہوار اور ہماری تہذیب میں شائستگی، حیا، نظم وضبط اور اپنے خالق و مالک کی شکرگزاری کا اظہار بنیادی عناصر ہیں۔ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں روزمرہ زندگی اور رہن سہن سے متعلق بارہا "خالفوا الیھود" ③ (یہود کی مخالفت کرو)، "خالفوا النصاریٰ" ④

---

① البیہقی، ابوبکر، احمد بن الحسین بن علی، امام، "السنن الکبریٰ"، دار الکتب العلمیہ، بیروت، لبنان، ۲۰۰۳ء، ۳۹۲/۹.

② ابن تیمیہ، احمد بن الحلیم بن عبدالسلام، شیخ الاسلام، "اقتضاء الصراط المستقیم"، مکتبہ الرشد، الریاض، ۴۵۸/۱

③ ابوداؤد، "سنن ابوداؤد"، کتاب الصلوۃ، باب: الصلوۃ فی النعل

④ بخاری، "الجامع الصحیح"، کتاب اللباس، باب الخضاب

(نصاریٰ کی مخالفت کرو)، اور "خالفوا المشرکین" ①(مشرکین کی مخالفت کرو) کا سبق دیا ہے۔ حضرت عمرؓ کا فرمان ہے:

"ہم ایک پست قوم تھے پھر اللہ نے ہمیں اسلام کے ذریعے عزت دی پھر اب ہم اس کے علاوہ کسی اور چیز میں عزت چاہیں گے تو اللہ ہمیں پست کر دے گا۔" ②

ہمارے ربّ نے پانچ وقت کی نمازوں میں ہم پر "مغضوب" اور "ضآلین" امتوں کے راستے سے بچنے کی دعا مانگنا لازم کر دیا لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ انہی "مغضوب" اور "ضآلین" اقوام کی نقالی میں عزت و سربلندی اور فلاح و ترقی کے راستے تلاش کرنے لگے حالانکہ عزت تو صرف اللہ کے لیے، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اور مومنین کے لیے ہی ہے۔③ اور اللہ ہی ہے جو جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلت دیتا ہے۔④ لہٰذا عزت و سربلندی کی منزل صرف اور صرف اُسی راستے پر چل کر حاصل ہو سکتی ہے جس کی نشاندہی اللہ نے کر دی اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے ہمیں اس پر چل کر دکھا دیا۔ اس کے برعکس ہمارا یہ طرز عمل ہے کہ مشرک اقوام کی ثقافت اور تہواروں کو بڑھ چڑھ کر اپناتے اور مناتے ہیں پھر اس پر فخر بھی کرتے ہیں۔ ضروری ہے کہ ہم اپنے اس طرز عمل کو درست کریں۔ اسلامی تہذیب کے احیا اور اس کی کھوئی ہوئی شناخت کو بحال کریں اور اس سے وابستگی میں فخر و ناز محسوس کریں۔

---

① بخاری: "الجامع الصحیح"، باب تقلیم الاظفار

② الالبانی، ناصر الدین محمد، "سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ" مکتبۃ المعارف للنشر و التوزیع، الریاض، 1415ھ، ج:1، ص:118

③ المنافقون 8:63

④ آل عمران ۳:۲۶

8۔ اپنی کوتاہیوں کا اعتراف اور اجتماعی توبہ اور استغفار کی ضرورت:

ایک اور غلط رویہ جو ہمارے ہاں تشکیل پا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ہم اپنی کوتاہیوں اور نالائقیوں کا اعتراف کرنے کو تیار نہیں اور اپنی تمام تر خرابیوں اور تنزل کا ذمہ دار بیرونی عناصر کو ٹھہرا کر خود کو بری الذمہ قرار دے دیتے ہیں۔ یہ نہایت خطرناک رویہ ہے۔ خرم مراد اپنی تصنیف ''مغرب اور عالم اسلام'' میں لکھتے ہیں:

> ''اگر ہم نے اب بھی آنکھیں نہ کھولیں اور شکست کے اسباب اپنے اندر ڈھونڈنے کی بجائے اس کی ذمہ داری مغربی استعماری طاقتوں کی دخل اندازی، دشمن کی مکاری، نام نہاد دوستوں کی بے وفائی اور ٹیکنالوجی میں اپنی کم تری جیسے عذرات لنگ کے سر منڈھتے رہے تو ہم کو مستقبل میں اس سے بھی بدتر ذلت کے لئے تیار ہو جانا چاہیے۔''(1)

ہم اپنے موجودہ حالات کی ذمہ داری اپنے حکمرانوں پر بھی ڈالنے کے عادی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے حکمران استعماری طاقتوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلیوں کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کے آلہ کار ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ ظالم اور برے حکمران بھی اسی قوم پر مسلط کیے جاتے ہیں جو اللہ کی راہ سے ہٹ کر اپنی من مانیوں پر اتر آتی ہے۔ نبی ﷺ کے فرمان کے مطابق جیسے لوگ خود ہوتے ہیں ویسے ہی حکمران اُن کے اوپر مسلّط کر دیئے جاتے ہیں۔(2) لہٰذا انفرادی اور معاشرتی سطح پر ہمیں خود کو قرآن وسنت کی تعلیمات کی روشنی میں ڈھالنا ہے اور اس ضمن میں ہماری سب سے اہم اور بڑی ذمہ داری، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ مسلمان بہترین امت (خیر امۃ)

---

(1) خرم مراد؛ ''مغرب اور عالم اسلام''؛ ص:84

(2) التبریزی، ابو عبداللہ، محمد بن عبداللہ، الخطیب؛ ''مشکاۃ المصابیح''؛ المکتب الاسلامی، بیروت، 1985، کتاب الامارہ والقضاء؛ ج:2؛ ص:1097؛ حدیث:3717

اسی صورت میں بن سکتے ہیں اگر وہ یہ ذمہ داری بخوبی نبھاتے ہیں۔(۱) اور اگر مسلمان نیکی کا حکم کرنا اور برائی سے روکنا چھوڑ دیں تو ذلت و مسکنت ان کے اوپر مسلط ہو کر رہتی ہے وہ اللہ کے عذاب کے مستحق ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ اللہ ان کی دعائیں تک قبول نہیں فرماتا:(۲)

جو ذلت و مسکنت بحیثیت مجموعی اس وقت پوری امت مسلمہ پر طاری ہے اس سے نکلنے کا واحد راستہ انفرادی اور اجتماعی سطح پر توبہ اور استغفار کا ہے۔ ہم کتنے ہی ''ترقیاتی منصوبے'' کیوں نہ بنالیں، ہمارے ماہرین کتنے ہی ''حل'' تجویز کیوں نہ کریں جب تک ہم اپنے گناہوں کی معافی کے لیے اللہ کے سامنے گڑگڑا کر نہ روئیں؛ یعنی نافرمانیوں اور کوتاہیوں پر اس کے سامنے شرمندہ نہ ہوں اس وقت تک ہمارے لیے کسی بہتری کا دروازہ نہیں کھل سکتا۔ ''ایمان'' اور ''استغفار'' ہی وہ چابی ہے جس سے فلاح اور خوشحالی کے راستے کھلتے ہیں۔(۳)

9۔قرآن وسنت کی رہنمائی:

اسلام کے اولین ادوار میں مسلمانوں کو جو کامیابیاں اور عروج حاصل ہوا تھا اس کی وجہ صرف اور صرف قرآن کو راہ ہدایت ماننا اور اس پر عمل کرنا تھا۔ اور آج ہماری تمام تر ذلتوں اور رسوائیوں کی وجہ یہی ہے کہ ہم نے قرآن کو چھوڑ دیا۔

وہ زمانے میں معزز تھے مسلمان ہو کر

---

(۱) آل عمران 110:3

(۲) ترمذی، ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ، امام؛ ''جامع ترمذی''؛ کتاب الفتن؛ باب: ماجاءَ فی الامرِ بالمعروفِ والنّھی عنِ المنکرِ

(۳) القرآن: 7:96:17:12-9

اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر ①

مسلمانوں کے لیے اللہ کا قانون یہی ہے کہ ان کے لیے عزت، فتح اور کامرانی اللہ کی کتاب پر عمل کے ساتھ مشروط ہے۔ خرم مراد لکھتے ہیں:

"جب اللہ کی طرف سے کتاب پانے والی قوم اس کتاب کو پیچھے ڈال کر اللہ کے مقابلے میں سر اٹھاتی ہے اللہ کی کتاب کو غالب کرنے کا مشن بھول کر گمراہی کے پیچھے دوڑتی ہے۔۔۔۔۔ تو اللہ تعالیٰ اس پر دشمنوں کو مسلط کر کے اس کی عزت و آبرو کو ملیامیٹ کر دیتا ہے"۔ ②

ہم جب تک اپنی اطاعت کا مرکز قرآن و سنت کو نہیں بنائیں گے اس وقت تک بھٹکتے ہی رہیں گے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر نبی ﷺ نے فرمایا تھا کہ جب تک مسلمان قرآن اور سنت کو تھامے رکھیں گے اس وقت تک گمراہ نہیں ہوں گے۔ ③ ہماری ساری پریشانیوں، ناکامیوں اور ذلتوں سے نکلنے کا راستہ صرف اور صرف وہی ہے جو قرآن ہمیں سکھاتا ہے۔ ہمارا قانون، ہمارا دستور اور ہمارا رہنما بس یہی کتاب ہے اور اس کتاب کو ہم تک پہنچانے والے پیغمبر ﷺ کی سنت ہے۔ ہم اس راستے سے جب بھی ہٹیں گے اللہ کے عذاب کے کوڑے ہم پر ضرور برسیں گے۔ جب بھی اس کو چھوڑیں گے ہلاکت میں ہی پڑیں گے، ہمارا دوست وہی ہے جس کو قرآن نے ہمارا دوست قرار دیا ہے اور ہمارا دشمن وہی ہے جس کو قرآن نے ہمارا دشمن بتا دیا۔ یہ کتاب ایک عظیم نعمت ہے اور اس کی حامل قوم ایک عظیم امت ہے لیکن یہ ایک بہت بڑی ذمہ داری بھی ہے۔ اللہ کا تو یہ فیصلہ ہے کہ اس

---

① اقبال؛ نظم: "جواب شکوہ"؛ کتاب: "بانگِ درا" (کلیات اقبال)؛ ص:233

② خرم مراد؛ "مغرب اور عالمِ اسلام"؛ ص:85

③ مالک بن انس بن مالک بن عامر الاصبحی المدنی، امام، "الموطا"، کتاب القدر، باب النھی عن القول بالقدر

نے اپنے دین کو قائم کرنا ہے اور اگر ہم یہ ذمہ داری نہ اٹھائیں گے تو اللہ ہماری جگہ کسی اور قوم کو لے آئے گا۔ (1)

آج استعمار کی آندھی ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے۔ یہ ایک منہ زور سیلابی ریلہ ہے جو نہ صرف دنیا بھر کے وسائل کو بلکہ بنیادی انسانی اخلاق اور قدروں کو بھی بہا لے جا رہا ہے۔ اس طوفان کو روکنے کی قوت ہمارے پاس قرآن کے شکل میں موجود ہے لہٰذا اگر ہم اس کتاب سے منہ موڑیں گے اور اپنی ذمہ داری سے پہلو تہی کریں گے تو ہم صرف اپنے ہی نہیں بلکہ دنیا کے تمام کمزوروں اور مظلوموں کے گناہگار ہوں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی مشکل نہیں کہ وہ ہمارا نام ونشان اس دنیا سے مٹا دے اور ہماری جگہ کوئی اور قوم لے آئے جو اس کتاب اور ''خیر امۃ'' کے منصب کا حق ادا کرنے والی ہو۔

☆☆☆☆☆

---

(1) المائدہ 5: 54

مصادر و مراجع

- القرآن الحکیم
- ابن ابی شبیہ، ابوبکر، عبداللہ بن محمد: ''الکتاب المصنف فی الحدیث الآثار''؛ مکتبۃ الرشد، الریاض: 1409ھ
- ابن تیمیہ، الحرانی، تقی الدین، ابوالعباس، احمد بن عبدالحلیم: ''مجموعہ فتاویٰ''؛ مجمع الملک فھد لطباعۃ المصحف الشریف، المدینۃ المنوبیہ، 1995؛ ج:4
- ابن حنبل، ابوعبداللہ، احمد بن محمد، الشیبانی، امام؛ مسند امام احمد: ''موسسۃ الرسالۃ''؛ 2011؛ ج:39
- ابن کثیر، ابی الفداء اسماعیل، الحافظ، امام؛ ''تفسیر ابن کثیر''، قدیمی کتب خانہ، کراچی
- ابنِ ماجہ، ابی عبداللہ محمد بن یزید القوینی، حافظ: ''سنن ابنِ ماجہ''
- ابوداؤد، سلیمان بن اشعث، سجستانی، امام: ''سنن ابوداؤد''
- اسرار احمد، ڈاکٹر: ''خلافت کی حقیقت اور عصرِ حاضر میں اس کا نظام''؛ مکتبہ خدام القرآن، لاہور؛ اکتوبر 1996ء
- اسرار احمد، ڈاکٹر: ''سابقہ اور موجودہ مسلمان امتوں کا ماضی، حال اور مستقبل اور مسلمانانِ پاکستان کی خصوصی ذمہ داری''؛ مکتبہ خدام القرآن، لاہور؛ اکتوبر 1993ء
- اسرار احمد، ڈاکٹر: ''موجودہ عالمی حالات کے پس منظر میں اسلام کا مستقبل''؛ مکتبہ خدام القرآن، لاہور؛ اگست 2004ء
- اسرار احمد، ڈاکٹر: ''موجودہ عالمی حالات کے تناظر میں اسلام اور پاکستان کا مستقبل''؛

مکتبہ خدام القرآن، لاہور؛ نومبر 2013ء

● الالبانی، ناصر الدین محمد، "سلسلۃ الاحادیث الصحیحہ" مکتبہ المعارف للنشر والتوزیع، الریاض، 1415ھ

● البیہقی، ابوبکر، احمد بن الحسین بن علی، امام، "السنن الکبریٰ" دار الکتب العلمیہ، بیروت، لبنان، 2003ء

● التبریزی، ابو عبداللہ، محمد بن عبداللہ، الخطیب: "مشکوٰۃ المصابیح"؛ المکتب الاسلامی، بیروت: 1985

● بابر مشتاق، میر: "امریکی دہشت گردی، تاریخ اور اثرات"؛ عثمانی پبلی کیشنز، کراچی؛ جولائی 2012ء

● بخاری، ابو عبداللہ، محمد بن اسماعیل الجعفی؛ "الجامع الصحیح"

● ترمذی، ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ، امام؛ "جامع ترمذی"

● تقی عثمانی، محمد، مفتی؛ "اسلام اور سیاسی نظریات؛ مکتبہ معارف القرآن"، کراچی، نومبر 2010ء

● ثروت صولت؛ "ملتِ اسلامیہ کی مختصر تاریخ"؛ اسلامک پبلی کیشنز لاہور؛ مارچ 1998ء؛ ج:2،4

● حامد کمال الدین؛ "روبہ زوال امریکن ایمپائر"؛ مطبوعاتِ ایقاظ، لاہور؛ اکتوبر 2010ء

● حسن ریاض، سید؛ "پاکستان ناگزیر تھا"؛ شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونیورسٹی، کراچی؛ 1992

● خرم مراد؛ "مغرب اور عالمِ اسلام"؛ منشورات، لاہور؛ 2006ء

● شاہ منصور، ابولبابہ، مفتی؛ "حرمین کی پکار"؛ البراس، کراچی؛ س ن

● شاہ منصور، ابولبابہ، مفتی؛ "ھسپانیہ سے امریکہ تک"؛ السعید، کراچی؛ 2012ء

● عبدالحفیظ بلیاتوی، ابوالفضل ، مولانا: ''مصباح اللغات'': مکتبہ قدوسیہ لاہور؛ جولائی 1999ء

● عبدالرشید ارشد؛ ''آخری صلیبی جنگ''؛ النور ٹرسٹ، جوہر پریس، جوہر آباد ؛ س:ن؛ ج:1

● عبدالسلام انبالوی، ابوالبراء، سید؛ ''طاغوت'': (عرضِ ناشر)؛ منبرِ توحید والسنۃ، لاہور؛ 2010ء

● مالک بن انس بن مالک بن عامر الاصبحی المدنی، امام؛ ''الموطا''، کتاب القدر، باب النھی عن القول بالقدر، موسسۃ زاید بن سلطان آل نھیان للاعمال الخیریۃ والانسانیہ، ابوظبی ، الامارات، الطبعۃ الاولیٰ، 1425ھ

● مبارک علی، ڈاکٹر؛ ''برطانوی راج (ایک تجزیہ)''؛ تاریخ پبلی کیشنز، لاہور؛ س:ن

● محمد ابراہیم، سلفی، حافظ؛ ''یہود و نصاریٰ سے مخالفت: کیوں اور کیسے؟''؛ دارالاندلس ، لاہور؛ اکتوبر 2003ء

● محمد اقبال، علامہ، ڈاکٹر؛ ''کلیات اقبال''؛ اقبال اکادمی، لاہور؛ 1999ء

● مریم خنساء؛ ''اسلام، مغرب اور پاکستان''؛ دارالکتب السلفیہ، لاہور؛ ستمبر 2008ء

● مریم خنساء؛ ''مسلمانوں کا فکری اغواء''؛ دارالکتب السلفیہ، لاہور؛ س:ن

● مسلم، ابوالحسین، مسلم بن الحجاج القشیری، النیسابوری؛ ''صحیح مسلم''؛ مترجم: مولانا عزیز الرحمن؛ مکتبۃ الرحمانیۃ، لاہور؛ س:ن؛ ج:2

● مقبول جان، اوریا؛ ''حرفِ راز''؛ سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور؛ س:ن

● ملک، سعید احمد، ڈاکٹر؛ ''خونِ مسلم ارزاں ہے''؛ جاوید پبلشرز لاہور؛ مئی 2003ء

● مودودی، ابوالاعلیٰ سید؛ ''تعلیمات''؛ اسلامک پبلی کیشنز لاہور؛ فروری 2014ء

● مودودی، ابوالاعلیٰ سید؛ ''تفہیم القرآن''؛ ادارہ ترجمان القرآن، لاہور؛ 2011ء؛ ج:2

● مودودی، ابوالاعلیٰ سید؛ ''تنقیحات''؛ اسلامک پبلی کیشنز، لاہور؛ ستمبر 2014ء

نذیر احمد، پراچہ، ڈاکٹر؛''مسلمان فاتحین''، الحمد پبلی کیشنز، لاہور؛ فروری 2007ء

● نجیب آبادی، اکبر شاہ خان؛''تاریخ اسلام''؛ دارالاندلس، لاہور؛ سن: ن؛ ج: 1، 2

● Abidullah Jan; Afghanistan: the Genesis of the Final Crusade;Pragmatic Publishing, Ottawa, Canada; 2006

● Aima Cesaire;Discourse on Colonialism; (translated by Joan Pinkham) ; Monthly Review Press, New York; (Originally Published as Discourse surle colonialisme) 1955

● Ania Loomba;Colonialism/Post Colonialism; Routledge, London and New York; 2nd edition; 2005

● Bill Ashcraft, Gareth Griffiths and Halen Tiffen;Post Colonial Studies; the New Concepts; Routledge, London and New York; 2013.

● Hitti, Philip K; History of the Arabs; Palgrave Macmillan; New York; 1970; (10th edition)

● Huntington, Samuel P.;The Clash of Civilizations and the Remaking of World Order; Simon & Schuster, UK; 2002

● John Mcleod; Beginning Post Colonialism; Manchester University Press, Manchester and New York; 2nd edition,2012

● John Rawls;The Law of People with the Idea of Public Reason Revisited; Harvard University Press, U.S.A; 2003

● Joseph Schacht; Origins of Muhammadan Jurisprudence; Oxford University Press, London; 1967

● Kwame Nkrumah; Neo-Colonialism: The Last Stage

of Imperialism; International Publishers, New York; 1966

●Magstead, Thomas M.Understanding Politics, Ideas, Institutions and Issues; Wadsworth Cengage Learning, U.S.A; 2013

●Murphy, John Cullen; Are we Rome?; A Mariner Book Houghton Mifflin Company; Boston, New York;2008

●Noam Chomsky and Andre Vltchek; On Western Terrorism from Hiroshima to Drone Warfare; Pluto Press, London; 2013

●Noam Chomsky;Conversation with Noam Chomsky on the Post 9/11 World; interviews with David Barsamian; Hamish Hamilton, (an imprint of) Panguin Books, London; 2005

●Noam Chomsky; Imperial Ambitions; Panguin Books, London; 2006

●Toynbee, Arnold, J; A study of History; (Abridgement of Vol I-VI by D.C Somervell) Oxford University Press, New York, Oxford; 1946

لغات اور انسائیکلو پیڈیا

●اردو انسائیکلو پیڈیا؛ فیروز سنز؛ لاہور؛ تیسرا ایڈیشن؛ جنوری 1984ء

●اردو لغت (تاریخی اصول پر)؛ ترقی اردو بورڈ، کراچی؛ 1977ء؛ ج:1

●Oxford Dictionary; Oxford University Press, Oxford; 7th edition; 2005

●The Concise Oxford Dictionary; Oxford University

Press, Oxford; 1990
- The Fontana Dictionary of Modern Thought; Fontana Press, London;1988
- Brasseys Encyclopedia of Military History and Biography; Brasseys, Washington, London; 1994
- Comptons Encyclopedia; F.E Compton Company, U.S.A; 1983; Vol:5
- Encyclopedia Britanica; The University of Chicago, U.S.A; 15th edition; 1986; Vol:1,3,7,9,12, 13,15,18,20
- International Encyclopedia of Social Sciences; The Macmillon Company and the Free Press, New York; Collier Macmillon Publishers, London; 1972; vol:3
- The Concise Encyclopedia of Sociology; Wiley Blackwell, West Sussex, UK, 2001
- The Kingfisher Illustrated History of the World; Kingfisher Books, London; 1972
- The Oxford Companion to Politics of the World; Oxford University Press, New York, Oxford; 1993
- The Oxford History of Islam; Oxford niversity Press, Oxford; 1999
- The Princetorn Encyclopedia of Islamic Political Thought; Princeton University Press, Princeton and Oxford; 2013

اخبارات، رسائل اور جرائد

- ''ایقاظ'' (سہ ماہی)؛ مطبوعات ایقاظ، لاہور؛ جنوری۔ مارچ 2010
- ''ترجمان القرآن'' (ماہنامہ)؛ ادارۂ ترجمان القرآن، لاہور؛ جون 2005،

جنوری 2007

● ''جنگ''؛ روزنامہ؛ 12 نومبر 2015، 10 دسمبر 2015

● ''حکمت قرآن'' (سہ ماہی)؛ مکتبہ خدام القرآن، لاہور؛ جولائی۔ ستمبر 2014، جنوری۔ مارچ 2015

● ''مغرب اور اسلام''؛ انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد؛ رسالہ نمبر: 30، 34، 35، 40

● ''میثاق'' (ماہنامہ)؛ مکتبہ خدام القرآن لاہور؛ فروری 2014، نومبر 2014، مارچ 2015

● ''ندائے خلافت'' (ہفت روزہ)؛ مکتبہ خدام القرآن، لاہور؛ 22۔16 ستمبر 2014

ویب لنکس

● http:// www.rand.org/

● Angel Rabasa, Cheryl Benard, Lowel H. Schwartz, Peter Sickle; Building Moderate Muslim Networks; RAND Corporation, 2007.

● Cheryl Benard; Civil Democratic Islam: Partners, Resources, and Strategies; RAND Corporation 2003

● www.tanzeem.org

● اسرار احمد، ڈاکٹر؛ لیکچر؛ عالمی مالیاتی نظام

یورپی نوآبادیات کو پچھلی صدی میں استعماری شکنجوں سے آزادی نصیب ہوئی تو یہ اُمید کی جاتی تھی کہ یہ نوآزادشدہ ریاستیں اپنی محنت اور افرادی قوت کے بل بوتے پر اپنے قدرتی وسائل کو خودمختاری کے ساتھ استعمال کریں گی اور ترقی اور خوشحالی کے راستے پر گامزن ہوں گی مگر بدقسمتی سے یہ خطے اور خصوصاً مسلم ممالک آزادی کے ثمرات سے خاطر خواہ فائدہ اٹھانے میں ناکام رہے۔ زیرِ نظر کتاب میں اُن اندرونی و بیرونی عوامل کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے جن کی بدولت مسلم خطے آج بھی حقیقی آزادی، خودمختاری، ترقی اور خوشحالی کی منازل طے کرنے میں ناکام ہیں۔

استعمار یا نوآبادیاتی نظام (Colonialism) اور مابعد نوآبادیاتی مطالعہ (Post colonial studies) ایسے موضوعات ہیں جن کا شمار عصرِ حاضر کے اہم مباحث میں ہوتا ہے اور ان موضوعات پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے لیکن اسلامی دنیا کے مسائل کے پس منظر میں مابعد نوآبادیاتی دور سے متعلق کوئی خاطر خواہ کام آج تک سامنے نہیں آسکا۔ زیرِ نظر کتاب اسی ضمن میں کی گئی ایک کاوش ہے۔

کتاب محل
دربار مارکیٹ لاہور 0321-8836932
kitaabmahal786@gmail.com
kitabmahal 03004827500